بائی بائی

نام اس کا فاطمہ تھا پر سب اسے پھاتو کہتے تھے۔ بانہال کے درّے کے اس طرف اس کے باپ کی پن چکی تھی، جو بڑا سادہ لوح معمّر آدمی تھا۔

دن بھر وہ اس پن چکی کے پاس بیٹھی رہتی۔ پہاڑ کے دامن میں چھوٹی سی جگہ تھی جس میں یہ پن چکی لگائی گئی تھی۔ پھاتو کے باپ کو دو تین روپے روزانہ مل جاتے، جو اس کے لیے کافی تھے۔ پھاتو البتہ ان کو ناکافی سمجھتی تھی، اس لیے کہ اس کو بناؤ سنگھار کا شوق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ امیروں کی طرح زندگی بسر کرے۔

کام کاج کچھ نہیں کرتی تھی۔ بس کبھی کبھی اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ اُس کو آٹے سے نفرت تھی، اس لیے کہ وہ اُڑ اُڑ اُس کی ناک میں گھس جاتا تھا۔ وہ بہت جھنجھلاتی اور باہر نکل کر کھلی ہوا میں گھومنا شروع کر دیتی، یا چناب کے کنارے جا کر اپنا منہ ہاتھ دھوتی اور عجیب قسم کی ٹھنڈک محسوس کرتی۔

اُس کو چناب سے پیار تھا۔ اُس نے اپنی سہیلیوں سے سُن رکھا تھا کہ یہ دریا عشق کا دریا ہے، جہاں سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا کا عشق مشہور ہوا۔

بہت خوبصورت تھی اور بڑی مضبوط جسم کی جوان لڑکی۔ ایک پن چکی والے کی بیٹی شاندار لباس تو پہن نہیں سکتی۔ میلی شلوار، اوپر پھرن کُرتہ ——— دوپٹہ ندارد۔

نذیر بحیثیت گڑھ سے لے کر بانہال تک اور بعدرواہ سے کشتواڑ تک خُوب گھوما پھرا تھا۔ اُس نے جب پہلی بار پھاتو کو دیکھا تو اُسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ جب اُس نے دیکھا کہ پھاتو کے کُرتے نچلے تین بٹن نہیں ہیں اور اُس کی جوان چھاتیاں باہر جھانک رہی ہیں

نذیر نے اس علاقے میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ وہاں کی عورتیں ایسی قمیصیں یا کُرتے پہنتی ہیں جن کے نچلے بٹن غائب ہوتے ہیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا یہ دانستہ ہٹا دیے جاتے ہیں، یا وہاں کے دھوبی ہی ایسے ہیں جو اِن کو اُتار لیتے ہیں۔

نذیر نے جب پہلی بار سبر کرتے ہوئے پھاتو کو اپنی تین کم بٹنوں والی قمیص میں دیکھا تو اُس پر فریفتہ ہو گیا وہ حسین تھی۔ ناک نقشہ بہت اچھا تھا۔ تعجب ہے کہ وہ میلی ہونے کے باوجود چمکتی تھی۔ اُس کا لباس بہت گندہ تھا، مگر نذیر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی خوبصورتی کو نکھار رہا ہے۔

نذیر وہاں ایک آوارہ گرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ صرف کشمیر کے دیہات دیکھنے اور اُن کی سیاحت کرنے آیا تھا اور قریب قریب تین مہینے سے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا۔

اُس نے کشتواڑ دیکھا، بھدرواہ دیکھا، کٹھوعہ، جموں، مظفرآباد، نوشہرہ، میر پور اور بھمبر کی سیر کی۔ اسی طرح سے جاتے جاتے شادی کو سال گزر گیا اور وہ ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل وزیرآباد کے ایک قصبہ میں پہنچا، جہاں اسے ٹھہرے ہوئے دو تین دن ہی ہوئے تھے کہ اُس نے کشتواڑ دیکھا، بھدرواہ دیکھا، کُد اور بٹوت میں کئی مہینے گزارے، مگر اُسے بِھاتو ایسا حُسن کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

باتہال میں پن چکی کے باہر جب اُس نے بِھاتو کو تین بٹنوں سے بے نیاز کُرتے میں دیکھا تو اُس کے جی میں آئی کہ اپنی قمیص کے سارے بٹن علیحدہ کر دے اور اُس کی قمیص اور بِھاتو کا کُرتہ آپس میں خلط ملط ہو جائیں۔ کچھ اس طرح کہ دونوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے۔

اُس سے ملنا نذیر کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اس لیے کہ اُس کا باپ دن بھر گندم، مکئی اور جوار پیسنے میں مشغول رہتا تھا۔ اور وہ تھی ہنس مکھ۔ ہر آدمی سے کھُل کر بات کرنے والی۔ بہت جلد گھُلو مِٹھو ہو جاتی تھی۔ چنانچہ نذیر کو اُس کی قربت حاصل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ چند ہی دنوں میں اُس نے اُس سے راہ و رسم پیدا کر لی۔

یہ راہ و رسم تھوڑی دیر میں محبت میں تبدیل ہو گئی۔ پاس ہی چناب بہتا ہے جسے عشق کا دریا کہتے ہیں اور جس کے پانی سے بِھاتو کے باپ کی پن چکی چلتی تھی۔ اس دریا کے کنارے بیٹھ کر نذیر اُس کو اپنا دل نکال کر دکھاتا تھا جس میں سوائے محبت کے اور کچھ بھی تھا۔ بِھاتو سُنتی ——— اس لیے کہ وہ اُس کے جذبات کا مذاق اُڑانا چاہتی تھی ——— اصل میں وہ تھی ہی ہنسوڑ۔ ساری زندگی وہ کبھی روئی نہ تھی۔ اُس کے ماں باپ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری بچی بچپن میں کبھی نہیں روتی۔

نذیر اور بِھاتو میں محبت کی پینگیں بڑھنی گئیں۔ نذیر بِھاتو کو دیکھتا تو اُسے یُوں محسوس ہوتا کہ اُس نے اپنی رُوح کا عکس آئینے میں دیکھ لیا ہے۔ اور بِھاتو تو اُس کی گرویدہ تھی، اس لیے کہ وہ اُس کی بڑی خاطر داری کرتا تھا۔ اُس کو یہ چیز ——— جسے محبت کہتے ہیں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ خوش تھی۔

باتہال میں تو کوئی اخبار ملتا نہیں تھا اس لیے نذیر کو بٹوت جانا پڑتا تھا۔ وہاں وہ دیر تک ڈاک خانے کے اندر بیٹھا رہتا۔ ڈاک آتی تو اخبار پڑھ کے پن چکی پر چلا آتا۔ قریب قریب چھ میل کا فاصلہ تھا، مگر نذیر اس کا کوئی خیال نہ کرتا۔ یہ سمجھتا کہ چلو ورزش ہی ہو گئی ہے جب وہ پن چکی کے پاس پہنچتا تو بِھاتو کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل آتی اور دونوں چناب کے پاس پہنچ جاتے اور پتھروں پر بیٹھ جاتے۔ بِھاتو اُس سے کہتی، "بخیر ——— اَج کی خبریں سناؤ۔"

اُس کو خبریں سُننے کا خبط تھا۔ نذیر اخبار کھولتا اور اُس کو خبریں سنانا شروع کر دیتا۔ اُن دنوں فرقہ وارانہ فسادات تھے ——— امرتسر سے یہ قصّہ شروع ہوا تھا جہاں سکھوں نے مسلمانوں کے کئی محلے جلا کے راکھ کر دیے تھے۔ وہ یہ سب خبریں اُس کو سُناتا۔ وہ سکھوں کو اپنی گنوار زبان میں بُرا بھلا کہتی۔ نذیر خاموش رہتا۔

ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستان قائم ہو گیا ہے اور ہندوستان علیحدہ ہو گیا ہے۔ نذیر کو تمام واقعات کا علم تھا، مگر جب اُس نے پڑھا کہ ہندوستان نے ریاست مانگرول اور مانا وادار پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا، مگر اُس نے اپنی اس پریشانی کو بِھاتو پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

دونوں کا عشق اب بہت استوار ہو چکا تھا۔ اس کا علم بِھاتو کے باپ کو بھی ہو گیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ میری لڑکی ایک معزز اور شریف گھرانے میں جائے گی۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی سیالکوٹ نہ جائے، جہاں کا نذیر رہنے والا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ نذیر اُسی کے پاس رہے۔ دولت مند کا بیٹا ہے ——— پن چکی کے پاس کافی زمین پڑی ہے۔ اُس پر ایک چھوٹا سا مکان بنوا لے اور دونوں میاں بیوی اُس

ہیں رہیں جب چاہا پلک جھپکتے سری نگر پہنچ گئے۔ وہاں ایک دو مہینے رہے، پھر واپس آ گئے کبھی کبھار سیالکوٹ بھی چلے گئے کہ وہ بھی اتنی دُور نہیں۔

پھاتو کے باپ سے مفصل گفتگو کی۔ وُہ اس سے بہت متاثر ہُوا اور اُس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ نذیر اور پھاتو بہت خوش ہوئے۔ اُس روز پہلی مرتبہ نذیر نے اُس کے ہونٹوں کو چُوما اور خود اپنے ہاتھ سے اس کے کُرتے میں تین بٹن لگائے۔

دوسرے دن نذیر نے اپنے والدین کو لکھ دیا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔ کشمیر کی ایک دیہاتی لڑکی ہے، جس سے اُس کی محبت ہو گئی۔ ایک ماہ تک خط و کتابت ہوتی رہی ہے۔ آدمی روشن خیال تھے، اس لیے وہ مان گئے، حالانکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔

اُس کے والد نے جو آخری خط لکھا، اُس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ نذیر فاطمہ کا فوٹو بھیجے۔ تاکہ وہ اپنے رشتے داروں کو دکھائیں اس لیے کہ وہ اُس کے حسن کی بڑی تعریفیں کر چکا تھا۔

لیکن بانہال جیسے دُور افتادہ علاقے میں وہ پھاتو کی تصویر کیسے حاصل کرتا۔ اُس کے پاس کوئی کیمرہ نہیں تھا۔ نہ وہاں کوئی فوٹو گرافر۔ بٹوت اور گرد میں بھی ان کا نام و نشان نہیں تھا۔

اتفاق سے ایک دن سری نگر سے موٹر آئی۔ نذیر سڑک پر کھڑا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کا دوست رنبیر سنگھ ڈرائیو کر رہا ہے۔ اس نے بلند آواز میں کہا "رنبیر یار ——— ٹھہرو۔"

موٹر ٹھہر گئی۔ دونوں دوست ایک دوسرے سے گلے ملے۔ نذیر نے دیکھا کہ اُس کا موٹر میں کیمرہ پڑا ہے۔ رولی فلیکس۔ نذیر نے اُس سے کچھ دیر باتیں کیں، پھر پوچھا۔ "تمہارے کیمرے میں فلم ہے؟"

رنبیر نے ہنس کر کہا۔ "خالی کیمرہ اور خالی بندوق کس کام کی ہوتی ہے ——— میرے کیمرے میں سولہ ایکسپوژر موجود ہیں۔"

نذیر نے فوراً پھاتو کو ٹھہرایا اور اپنے دوست رنبیر سے کہا۔ "یار اس کے تین چار اچھے پوز لے لو۔ اور تم میرا خیال ہے سیالکوٹ جا رہے ہو، وہاں سے ڈی ولپ اور پرنٹ کرا کے مجھے دو دو کاپیاں بٹوت کے ڈاک خانے کی معرفت بھجوا دینا۔"

رنبیر نے بڑے غور اور بڑی دلچسپی سے پھاتو کو دیکھا۔ اُس کی موٹر میں ڈوگرہ فوج کے تین چار سپاہی تھے۔ نخری ناٹ نخری بندوقیں لیے رنبیر جو مقام فوٹو لینے کے لیے پسند کرتا، یہ مسلح فوجی اُس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ نذیر اُس کے ہمراہ ہونا چاہتا تو یہ ڈوگرے اُسے روک دیتے۔ کشمیر میں بلڑ بج رہا تھا۔ اس کے متعلق نذیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستان اس پر قابض ہونا چاہتا ہے، مگر پاکستانی اس کی مدافعت کر رہے ہیں۔ فوٹو لے کر جب نذیر کا دوست رنبیر اپنی موٹر کے پاس آیا تو اس نے نذیر کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ پھاتو ڈوگرے فوجیوں کی گرفت میں تھی۔ انھوں نے زبردستی موٹر میں ڈالا۔ وہ چیخی چلائی۔ نذیر کو اپنی مدد کے لیے پکارا ——— مگر وہ عاجز تھا ——— ڈوگرے فوجی سنگینیں تانے کھڑے تھے۔

جب موٹر اسٹارٹ ہوئی تو نذیر نے اپنے دوست رنبیر سے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا "یار۔ رنبیر، یہ کیا ہو رہا ہے:

رنبیر سنگھ نے جو کہ موٹر چلا رہا تھا۔ نذیر کے پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر صرف اتنا کہا:

"بائی بائی"

(۱۱ مئی ۱۹۵۴ء)

مائی جنتے

مائی جنتے سلیپر چٹخاتی، گھسٹتی کچھ اس انداز میں اپنے میلے چکٹ میں داخل ہوئی ہی تھی کہ سب گھر والوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ آ پہنچی ہے۔ وہ رہتی اسی گھر میں تھی جو خواجہ کریم بخش مرحوم کا تھا، اپنے پیچھے کافی جائداد، ایک بیوہ اور دو جوان بچیاں چھوڑ گیا تھا۔ آدمی پرانی وضع کا تھا جونہی یہ لڑکیاں نو دس برس کی ہوئیں۔ ان کو گھر کی چار دیواری میں بٹھا دیا اور پہرہ بھی ایسا کہ وہ کھڑکی تک کے پاس کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ مگر جب وہ اللہ کو پیارا ہوا تو اُن کو آہستہ آہستہ تھوڑی سی آزادی ہو گئی۔ اب وہ لُک چھپ کے ناول بھی پڑھتی تھیں۔ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے پوڈر اور لپ اسٹک بھی لگاتی تھیں۔ ان کے پاس ولایت کی سی ہوئی انگیا بھی تھیں ــــ معلوم نہیں یہ سب چیزیں کہاں سے مل گئی تھیں۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ اُن کی ماں کو جو ابھی تک اپنے خاوند کے صدمے کو بھول نہ سکی تھی ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر قرآن مجید کی تلاوت اور پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی میں مصروف رہتی اور اپنے مرحوم شوہر کی رُوح کو ثواب پہنچاتی رہتی۔

گھر میں کوئی مرد نوکر نہیں تھا۔ مرحوم کے باپ کی زندگی میں، نہ مرحوم کے زمانے میں، نہ اُن کی پُرانی وضعداری کا ثبوت ہے۔ عام طور پر ایک یا دو ملازمائیں ہوتی تھیں جو باہر سے سودا سلف بھی لائیں اور گھر کا کام بھی کریں۔

دسویں جماعت خود مرحوم نے اپنی بچیوں کو پڑھا کر پاس کرائی تھی۔ کالج کی تعلیم کے وہ یکسر خلاف تھے۔ وہ اُن کی فوراً شادی کر دینا چاہتے تھے، مگر یہ تمنّا اُن کے دل ہی میں رہی۔ ایک دن اچانک فالج گرا۔ اس موذی مرض نے اُن کے دل پر اثر کیا اور وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

باپ کی وفات سے لڑکیاں بہت اُداس رہنے لگیں۔ انھوں نے ایک دن ماں سے التجا کی کہ وہ اُن کو کسی کالج میں داخل کر دیں پر جب زیادہ اصرار ہوا اور انھوں نے کئی دن کھانا نہ کھایا تو اُس نے مجبوراً اُن کو ایک زنانہ کالج میں داخل کرا دیا۔

مائی جنتے نے وعدہ کیا کہ ہر روز اُن کو صبح کالج چھوڑ آئے گی۔ سارا وقت وہیں رہے گی اور جب کالج بند ہو گا تو انھیں اپنے ساتھ لے آیا کرے گی۔ اُس نے اپنی مالکن سے یہ وعدہ کچھ ایسے پُر خلوص انداز میں کیا کہ وحیدہ بانو مرحوم خواجہ کریم بخش کی بیوہ کی یہ بیٹیاں نہیں خود اُس کی بچیاں ہیں۔

اُس نے بہو بیٹیوں کو پردے میں رکھنے کی حمایت میں اپنے انداز میں مولویوں کی طرح ایک لمبی چوڑی تقریر بھی کی، لیکن پھر یہ کہا، تعلیم بھی ضروری ہے کہ اسلام اس سے منع نہیں کرتا۔ پر دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔ جوان جہان ہیں۔ ان پر بڑی کڑی نگرانی ہونی چاہیے ــــ میں تو اُن کے پاس کوئی مکھی بھی نہ پھٹکنے دوں۔ کوئی ایسی ویسی شرارت کریں گی تو وہ کان اینٹھوں کہ بلبلا اٹھیں گی اور یاد کریں گی کس بڑھیا سے پالا پڑا ہے ــــ لیکن یہ کیوں کرنے لگیں، شریف خاندان کی ہیں ــــ روزے نماز کی پابند ہیں ــــ

اور بے سمجھ بھی نہیں۔ نیک و بد اچھی طرح سمجھتی ہیں۔

دونوں لڑکیوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک برس کے فرق کے بعد ہی چھوٹی جس کا نام نسرین تھا پیدا ہوئی تھی۔ بڑی کا نام پروین تھا۔ دونوں خوبصورت تھیں۔ چہرے مہرے سے خاصی اچھی۔ قد موزوں۔ شکل آپس میں کافی ملتی تھی دونوں ہر وقت اکٹھی کھیلتیں۔ بگر گڑیوں کا زمانہ عرصہ ہوا لد چکا تھا، اب جوانی کی شرارتوں کے دن تھے۔ کالج میں جاتے ہی انھوں نے پر پُرزے نکالے اور اِدھر اُدھر اُن تتلیوں کی طرح جن کو کسی پھول کی تلاش ہو، اِدھر اُدھر چھیڑ چھاڑ شروع کر دیا

مائی جنتے ساتھ ہوتی تھی ——— وہ کالج کی بوڑھی چپڑاسن کے ساتھ اُس وقت حقہ پیتی رہتی جو پاس ہی کوٹھڑی میں رہتی تھی۔ دونوں ہم عمری کے باعث بہت جلد گہری سہیلیاں بن گئی تھیں۔ جب دونوں ایک ساتھ بیٹھتیں تو اُس زمانے کی باتیں چھیڑ جاتیں جب کہ وہ بھی جوان تھیں۔ چپڑاسن کو کسی لڑکی سے رغبت یا محبت نہیں تھی۔

وہ مائی جنتے کو بڑی پُرانی کہانیاں سناتی۔ فلاں سن میں ایک بیرسٹر کی لڑکی کو حمل ہو گیا تھا جو بڑی مشکل سے گرایا گیا۔ پرنسپل صاحب کو دس ہزار روپے رشوت کے ملے کہ اُس کا منہ بند رہے ——— پرسال ایک لڑکی جو بڑے اونچے گھرانے کی تھی، اُس سے دینیات کے مولوی صاحب کو عشق ہو گیا، چنانچہ موقعہ پا کر اس لونڈیا کو دلوچ لیا۔ پکڑے گئے اور کالج سے داڑھی اور برقعہ دونوں پولس کے ہاتھوں میں۔ داڑھی تو پانچ سال کی قید بھگت رہی ہے۔ معلوم نہیں اُس ریشمی برقع کا کیا ہوا ——— بُوا میں تو ایسی باتوں میں دھیان ہی نہیں دیتی ——— مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ ان کُٹنیوں کے کارناموں پر اپنا وقت ضائع کروں۔"

مائی جنتے نے حُقے کی نے مُنہ سے الگ کر دی۔ "نہ بُوا ایسی باتیں نہیں کیا کرتے ——— وہ کیا کہاوت ہے کہ کونسا شہسوار ہے جو نہیں گرا ——— اور وہ کونسا پتنگ ہے جو نہیں بلا ——— خدا تمھارا بھلا کرے ——— ہم لوگوں کو خاموش ہی رہنا چاہیے اور اللہ میاں سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ کسی کی بہو بیٹی کو بُرے کاموں کی طرف نہ لے جائے۔ ان کی عزت آبرو اپنے کرم سے سنبھالے رکھے۔"

چپڑاسن اُس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی کہ کتنی نیک عورت ہے ——— اس کو دل ہی میں بڑی ندامت ہوئی کہ اس نے اتنی لڑکیوں میں کیڑے ڈالے اور ان کے راز افشا کیے۔ اُس نے چنانچہ فوراً مائی جنتے سے معافی مانگی اور کانوں کو ہاتھ لگایا کہ آئندہ وہ ایسی باتوں سے دُور ہی رہے گی۔ کسی لڑکی کے بارے میں اُسے کچھ پتہ بھی چل گیا تو وہ اپنی زبان بند رکھے گی۔

مائی جنتے نے اُسے بڑی شاباشیاں دیں۔ اتنے میں کالج چھوٹ گیا۔ اس نے پروین اور نسرین کو ساتھ لیا اور گیٹ سے باہر جا کر اُس نے اُن سے کہا، "آج تمھیں شام کو یہاں نہیں آنا پڑے گا"

پروین نے جواب دیا، "ہمیں تو کسی نے نہیں کہا۔"

"اصل میں تم دونوں بہت بے وقوف ہو ——— دھیان سے ہر بات سُنا کرو ——— میں تمھیں کسی سے پوچھ کر بتا دوں گی۔ گھر پہنچ کر مائی جنتے نے اُن کے لیے چائے تیار کی اور بڑی پُھرتی سے میز پر لگا دی۔ پھر وہ اُن کی ماں کے پاس اپنی پیالی لے کر بیٹھ گئی اور چپڑاسن سے جو باتیں اُس کی ہوئی تھیں، من و عن سُنا دیں۔ اُس نے آخر میں اُس کو مشورہ دیا کہ پیدل آنا جانا ٹھیک نہیں ——— میرا خیال ہے آپ کسی "تانگے" کا بندوبست کر دیں تو ٹھیک رہے ——— پیدل چلو، تو کوئی غنڈہ کندھا ہی رگڑ لو ہے بیٹیوں کے ساتھ۔

مائی جنتے کا یہ مشورہ بڑا معقول تھا چنانچہ ٹانگے کا بندوبست دوسرے ہی روز ہو گیا ـــ مائی جنتے نے ایک ٹانگے والے سے مہینے بھر کا کرایہ طے کر لیا۔

"دوسرے تیسرے روز اپنی مالکن وحیدہ بانو کو یہ خبر سنائی کہ پڑوس میں دیوار کے ساتھ جو جگہ خالی ہوئی تھی، اس میں نئے کرایہ دار آن بسے ہیں۔"

وحیدہ بانو نے پوچھا، "کون لوگ ہیں؟"

"جانے ہماری ـــ ہوں گے کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے ـــ میں نے تو کسی سے پوچھا نہیں۔"

ایک دن دوسری طرف سے کوٹھے پر سے کسی شخص نے ایسے ہی جھانک کر اُن کے صحن میں دیکھا ـــ "ایک ہنگامہ ہوتے ہوتے رُک گیا۔ مائی جنتے کہیں باہر گئی تھی۔ وحیدہ بیگم نے فوراً کواڑ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر محلّے کے ایک چھوٹے سے لڑکے کو بلایا اور کہا۔ اگر پڑوس والے مکان میں جو نئے کرایہ دار آئے ہیں، اُن میں کوئی عورت ہو تو اُن سے کہو، آپ کی ہمسائی بیگم صاحبہ آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ وہ گھڑی کے لیے تشریف لے آئیے ـــ بڑی مہربانی ہو گی۔"

لڑکا پیغام لے کر چلا گیا ـــ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ پروین اور نسرین اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں، اس لیے اُس نے خود دروازہ کھولا ـــ دہلیز پر ایک سفید برقع پوش خاتون کھڑی تھی۔ اُس نے بڑے ملائم لہجے میں وحیدہ بیگم سے پوچھا، "کیا آپ ہی نے مجھے یاد فرمایا ہے؟"

وحیدہ بیگم نے جواب دیا "جی ہاں ـــ تشریف لے آئیے۔"

وہ اندر چلی آئی۔ دونوں باہر بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئیں۔ وحیدہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے ـــ دونوں چند لمحات ایک دوسرے کی شکل صورت اور کپڑے لتّوں کا جائزہ لیتی رہیں۔ آخر ہمسائی بی نے مہر خاموشی توڑی اور پوچھا "فرمائیے، آپ نے مجھے دولت خانے میں کیسے بلایا؟"

اس پر وحیدہ بیگم کو اپنی شکایت کے اظہار کا موقعہ مل گیا اور اُس نے بڑی بُردباری اور تحمل سے صبح کا حادثہ بیان کر دیا اور پوچھا "وہ کون صاحبزادے ہیں جو اس طرح پرائے گھر میں تاک جھانک کرتے ہیں؟"

"میرا لڑکا ہے بہن ـــ وہ تو ایسا نہیں ـــ بڑا شرمیلا ہے ـــ چونکہ ہم نئے نئے اُٹھ کر یہاں آئے ہیں اسی لیے اس نے کوٹھے پر چڑھ کے دیکھا ہو گا مگر آس پاس کیا ہو گا ـــ ویسے میں اُس کو منع کر دوں گی کہ خبردار تم نے ادھر کیا، کسی بھی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا ـــ بڑا برخوردار لڑکا ہے ـــ ضرور میرے حکم کی تعمیل کرے گا۔ میں نے اگر اُس کے باپ سے آپ کی شکایت کی تو وہ تو اُس کو مار مار کے کھال اُدھیڑ دیں گے ـــ بڑے سخت گیر ہیں وہ اس معاملے میں ـــ ویسے مجھے افسوس ہے۔"

"نہیں، میں نے صرف آپ کے کانوں تک یہ بات پہنچائی تھی کہ بدمزگی نہ ہو ـــ یہ کہہ کر وحیدہ بیگم اُٹھی اور پکاری "پروین ـــ نسرین، ادھر آؤ ذرا۔"

دونوں لڑکیاں لپک کر باہر نکلیں، لیکن ایک نادیدہ عورت کو دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ دوپٹے کے بغیر، فوراً اندر بھاگیں اور دوپٹے اوڑھ

کر باہر آئیں، نووارد عورت کو جُھک کے سلام کیا اور اپنی ماں سے پُوچھا "کیوں امّی جان ؟"

وحیدہ بیگم نے اپنی ہمسائی سے اپنی بیٹیوں کو متعارف کرایا ـــــ اُس نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور ان کی خوب بڑی تعریف کی کہ "ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ پھر اُس نے کہا "میرا سلیم بالکل انھی کی طرح شریف اور شرمیلا ہے"

چند دنوں ہی میں وحیدہ اور ہمسائی جس کا نام نازلی بیگم تھا، بڑے گہرے مراسم ہو گئے۔ وحیدہ بیگم اُن کے یہاں نہیں جاتی تھی، اُس نے نازلی بیگم سے کہا "میں سر آنکھوں پر آتی ـــــ سو سو دفعہ آتی، پر جب سے غریب صاحب کا انتقال ہوا ہے، کہ میں نے دل میں قسم کھا لی تھی، اس گھر سے باہر ایک قدم نہ رکھوں گی ـــــ بہن دیکھو خدا کے لیے مجبور نہ کرنا"

اس اثنا میں کالج میں شام کئی فنکشن ہوتے۔ کبھی کوئی مباحثہ ہے۔ کبھی لینڈن شو ہے، کبھی مشاعرہ ـــ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ پروین اور نسرین دونوں ان پروگراموں میں شامل ہوتی تھیں، مگر مائی جنتے ساتھ ہوتی اور ان کو لے کر بحفاظت واپس گھر آتی۔ خواہ جلدی خواہ دیر سے۔

عید سے چار روز پہلے سلیم واپس آیا۔ ساتھ اُس کے اُس کا بغلی دوست قادر تھا۔ وحیدہ بیگم نے اُس کو مندرجہ بالا واقعہ کے بعد جب اُس نے اتفاقاً وحیدہ بیگم کے صحن کو ایک نظر دیکھ لیا، گوجرانوالہ بھیج دیا تھا جہاں اُس کے والد کی آبائی اجداد و املاک تھیں ـــــ اُس نے اب اُسے خط لکھ کر بلایا تھا کہ عید سے پہلے پہلے یہاں لاہور چلے آؤ۔ وہ آگیا اور ساتھ اپنے جگری دوست کو بھی لے آیا۔ گھر میں اُسے سب جانتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اکٹھے اسکول اور کالج میں پڑھے۔ یہاں لاہور میں اُٹھ آنے کی صرف ایک وجہ تھی کہ سلیم کے والد اُس کے لیے اپنے اثر و رسوخ سے کوئی اچھی ملازمت تلاش کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے روز شام کو قادر نے سلیم سے کہا "چلو یار، آج عیاشی کریں ـــــ گوجرانوالہ میں کیا پڑا ہے۔"

سلیم نے پوچھا "عیاشی کیسی ؟"

قادر مسکرایا "تم تو نرے کھرے چُغد ـــــ چلو آؤ باہر۔ تمھیں بتاتا ہوں ـــــ دیکھیں گے قسمت میں کیا لکھا ہے۔"

دونوں دوست چلے گئے۔ اتنے میں وحیدہ بیگم کے پاس اُس کی ہمسائی آئی ـــــ اس نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنا حرفِ مدعا بیان کر دیا کہ وہ اپنے سلیم کے لیے نسرین کا رشتہ مانگنے آئی ہے۔

زیادہ حیل و حجت کوئی بھی نہ ہوئی۔ وحیدہ اُن لوگوں کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی۔ چند رسمی باتیں ہوئیں، اس کے بعد دونوں رضامند ہو گئیں کہ اُن کا نکاح عید کی تقریب سعید پر ہو جائے اور رخصتی ایک ماہ کے بعد۔

رات کو سلیم دیر سے آیا، مگر اس کی ماں نے کوئی باز پرس نہ کی کیونکہ وہ خوش تھی کہ اتنی جلدی اُس کے بیٹے کی شادی کا معاملہ نسرین ایسی حسین و جمیل اور باحیا لڑکی سے طے پا گیا۔ اُس نے چنانچہ سلیم کو یہ خوش خبری سُنا دی۔ وہ بھی بہت خوش ہوا ـــــ تجرد کی زندگی اور بیکاری سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ اُس نے سوچا، روپیہ پیسہ باپ کے پاس کافی ہے۔ کیا پروا ہے، ملازمت کی فکر ہوتی رہے گی۔

اس کا دوست واپس گوجرانوالہ چلا آیا، اس لیے کہ اُس نے عید اپنے گھر منانا تھی۔ سلیم نے اپنی ماں سے کہا "دیکھیے امّی جان، میں نے آپ کی بات کتنی جلدی مان لی ـــــ اب آپ میری مانیے۔"

اس کی ماں نے پُوچھا "کیا بیٹا۔"

یالی ایک جھلک دکھا دیجیے ــــ خواہ وہ دُوری سے کیوں نہ ہو" ـــــ اُس کے لہجے میں التجا تھی۔"میرا خیال
مائی بنتے کیں تو اُس کا کوئی فوٹو ہی دکھا دیجیے ـــــ آخر وہ کل یا پرسوں میری ہونے والی ہے۔"
کرایہ طے کرد، ں کی ماں کو سلیم کی یہ درخواست ناپسند نہ ہوئی۔"میں پوری کوشش کروں گی بیٹا۔"

" عید آگئی مگر تصویر نہ آئی ـــــ لیکن سلیم نے کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ نکاح کی رسم بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ جب وہ باہر نکلا تو اُس بسے کی ماں نے کواڑ ذرا سا کھولا اور اُس کو آواز دی۔ وہ ٹھہر گیا۔ ہاتھ باہر نکال کر اُس نے سلیم سے کہا "یہ لفافہ لے لو ـــــ دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔"

سلیم سمجھ گیا ـــــ اس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ اس میں تاب انتظار کیسے ہوتا۔ اُس نے لفافہ وہیں کھڑے کھڑے کھولا ـــــ دھڑکتے ہوئے دل سے تصویر باہر نکالی۔ ادھر اُدھر دیکھا اور تصویر پر پہلی نظر ڈالی۔ اُس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ تصویر اسس کے کانپتے ہاتھوں سے گر پڑی ـــــ اتنے میں سامنے والا دروازہ جس میں سے اُس کی ماں نے ہاتھ نکالا تھا کھُلا اور بڑھیا نکلی ـــــ سلیم نے اُس کو حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا "مائی، تم یہاں کیسے پہنچ گئیں ـــــ ؟ تو اُس رات تم ہی ـــــ"

اس نے اس سے اور زیادہ کچھ نہ کہا اور تصویر زمین ہی پر چھوڑ کر تیز قدموں سے اپنے ایک دوست ڈاکٹر جمیل کے پاس گیا۔ اور ساری بات بتا دی۔ جمیل نے اُس کو ہسپتال میں داخل کرا دیا، جہاں اس کے جھُوٹ مُوٹ کے مرض کا علاج ہوتا رہا ـــــ آخر ڈاکٹر جمیل نے سلیم کے والد کو بُلا کر تخلیے میں کہا کہ یہ شادی نہ ہو۔ آپ کا لڑکا عورت کے قابل نہیں ہے۔

(۱۲ رمئی ۱۹۵۴ء)

جان محمد

میرے دوست جان محمد نے جب میں بیمار تھا، میری بڑی خدمت کی۔ میں تین مہینے ہسپتال میں رہا۔ اس دوران میں وہ باقاعدہ شام کو آتا رہا۔ بعض اوقات جب میرے ذکر علیل ہوتے تو وہ رات کو بھی وہیں ٹھہرتا، تاکہ میری خبر گیری میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔

جان محمد بہت مخلص دوست ہے۔ میں قریب قریب بیس روز تک بے ہوش رہا تھا۔ اس دوران میں وہ آتا ـــــ لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت پریشان تھا، روتا بھی تھا۔ اس لیے کہ میری حالت بہت نازک تھی۔

جب میں اس قابل ہو گیا کہ بات چیت کر سکوں، تو اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ کو تھکاوٹ تو محسوس نہیں ہوتی"

میرے اعضا بالکل مفلوج ہو چکے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی مجھے بستر پر پڑے ہوئے۔ میں نے اُس سے کہا "جان محمد ـــــ میرا انگ انگ دُکھتا ہے۔"

اس نے فوراً میری بیوی سے کہا۔ "کل زیتون کا تیل منگا دیجیے ـــــ میں صبح آ کے مالش کر دیا کروں گا۔"

زیتون کا تیل آگیا اور جان محمد بھی۔ اس نے میرے سارے بدن پر مالش کی۔ قریب قریب آدھ گھنٹہ اُس کا اس مشقت میں صرف ہوا مجھے بڑی راحت محسوس ہوئی۔

اس کے بعد اُس کا معمول ہو گیا کہ ہر روز دفتر جانے سے پہلے ہسپتال میں آتا اور میرے بدن پر مالش کرتا ـــــ مجھے راحت ضرور ہوتی تھی، لیکن وہ اس زور سے اپنے ہاتھ چلاتا کہ میری ہڈیاں تک دُکھنے لگتیں، چنانچہ میں اُس سے اکثر بڑے درشت لہجے میں کہتا۔ "جان محمد تم تو میری جان لے لو گے۔"

یہ سُن کر وہ مُسکرا دیتا۔ "منٹو صاحب، آپ تو بڑے سخت جان ہیں ـــــ اس مٹھی چاپی سے گھبرا گئے۔"

میں خاموش ہو جاتا، اس لیے اُس کی مٹھی چاپی میں کوئی جارحانہ چیز نہیں تھی، بلکہ سراپا خلوص تھا۔

تین مہینے ہسپتال میں کاٹنے کے بعد گھر آگیا ـــــ جان محمد بدستور ہر روز آتا رہا۔

میری اُس کی دوستی اتفاقاً ہو گئی تھی۔ ایک روز میں گھر میں بیٹھا تھا کہ ایک ناٹے قد کے چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے جواں سال مرد نے دروازے پر دستک دی۔ میں جب اس کو اندر کمرے میں داخل کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ میرا مداح ہے۔ "منٹو صاحب ـــــ میں نے آپ کو صرف اس لیے تکلیف دی ہے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا ـــــ میں نے قریب قریب آپ کی سب تصانیف پڑھی ہیں۔"

میں نے اس کا مناسب و موزوں الفاظ میں رسمی طور پر شکریہ ادا کیا تو اُس کو بڑی حیرت ہوئی۔ "منٹو صاحب ـــــ آپ تو رسوم و قیود کے قائل ہی نہیں۔ پھر یہ تکلف کیوں؟"

میں نے کہا "تو وارد وں سے بعض اوقات یہ تکلف برتنا ہی پڑتا ہے۔"

جان محمد کی مہین مونچھوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "مجھ سے آپ یہ تکلف نہ برتیے۔"

چنانچہ یہ تکلف فوراً دور ہو گیا۔

اس کے بعد جان محمد نے ہر روز میرے گھر آنا شروع کر دیا۔ شام کو وہ جب دفتر سے فارغ ہوتا تو سیدھا میرے یہاں چلا آتا۔ میری عادت ہے کہ میں کسی دوست کا حسب نسب دریافت نہیں کرتا اس لیے کہ میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا ——— میں تو کسی سے ملوں تو اس سے اُس کا نام بھی نہیں پوچھتا۔

یہ تمہید کافی لمبی ہو گئی، حالانکہ میں اختصار پسند ہوں ——— جان محمد دیر تک میرے یہاں آتا رہا، اس کی معلومات خاصی اچھی تھیں۔ ادب سے بھی اُسے خاصا شغف ہے۔ مگر میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ زندگی سے کسی قدر بیزار ہے۔

"مجھے زندگی سے پیار ہے، لیکن اُس کو اس سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ہم دونوں جب باتیں کرتے تو وہ کہتا "منٹو صاحب، آپ میرے لباس کو دیکھتے ہیں، یہ شلوار اور قمیص جو میلی سی ہے، آپ یقیناً نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں گے ——— مگر مجھے اچھے لباس کی کوئی خواہش نہیں ——— مجھے کسی خوبصورت چیز کی خواہش نہیں۔"

میں نے اُس سے پوچھا "کیوں؟"

"بس ——— میرے اندر یہ حس ہی نہیں رہی ——— میں ننگے فرش پر سوتا ہوں ——— نہایت واہیات ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہوں ——— یہ دیکھیے ——— میرے ناخن اتنے بڑھے ہوئے ہیں ——— ان میں کتنا میل بھرا ہے ——— میرے پاؤں ملاحظہ فرمائیے ——— ایسا نہیں لگتا کہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہیں ——— مگر مجھے ان غلاظتوں کی کچھ پروا نہیں۔"

میں نے اُس کی غلاظتوں کے متعلق اُس سے کچھ نہ کہا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت میلا کچیلا رہتا تھا۔ اُس کو صفائی کے متعلق کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا۔

ایک دن حسب معمول جب وہ شام کو میرے پاس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اُس کی طبیعت مضمحل ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "کیوں جان محمد، کیا بات ہے آج ——— تھکے تھکے سے معلوم ہوتے ہو۔"

اُس نے اپنی جیب سے بگلے کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ سلگا کر جواب دیا "تھکاوٹ ہو ہی جاتی ہے ——— کوئی خاص بات نہیں۔"

اس کے بعد ہم دیر تک غالب کی شاعری پر گفتگو کرتے رہے۔ اُس کو یہ فارسی کا شعر بہت پسند آیا۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

ہم غالب کی شاعری پر تبصرہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے ایک ہمسائے کی لڑکی میری بیوی سے ملنے چلی آئی۔ چونکہ وہ پردہ نہیں کرتی تھی اس لیے وہ ہمارے درمیان بیٹھ گئی۔ جان محمد نے آنکھیں جھکا لیں اور خاموش ہو گیا۔

اس لڑکی کا نام شمیم تھا۔ دیر تک وہ بیٹھی میری بیوی اور مجھ سے باتیں کرتی رہی، لیکن اس دوران میں جان محمد اسی طرح آنکھیں جھکائے

خاموش رہا۔ کچھ اس طرح کہ اُسے کوئی پہچان نہ لے۔

اس کے بعد دوسرے دن رات کے دس بجے میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر اُوپر سو رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ جان محمد ہے۔ نہایت خستہ حالت میں۔ میں بہت پریشان ہُوا اور اُس سے پُوچھا "کیوں جان محمد — خیریت تو ہے"

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، جس سے میں بالکل ناآشنا تھا، "خیریت ہے — مجھے نیند نہیں آ رہی تھی — اس لیے میں آپ کے پاس چلا آیا"

مجھے سخت نیند آ رہی تھی، مگر جان محمد ایسے مخلص دوست کے لیے میں اُسے قربان کرنے کے لیے تیار تھا، مگر جب اُس نے اُوٹ پٹانگ باتیں شروع کیں تو مجھے وحشت ہونے لگی — اُس کا دماغ غیر متوازن تھا۔ کبھی وہ آسمان کی بات کرتا، کبھی زمین کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اچانک اُسے ہو کیا گیا۔

ایک دن پہلے جب وہ مجھ سے ملا تو اچھا بھلا تھا۔ ایک دم اس میں اتنی تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی؟

ساری رات اُس نے مجھے جگائے رکھا۔ آخر صبح میں نے اُس کو غسل کرنے کے لیے کہا۔ اپنے کپڑے اُسے پہننے کے لیے دیے کہ اُس کے میلے چکٹ تھے۔ پھر اس کو لاریوں کے اڈّے پر لے گیا کہ وہ سیالکوٹ اپنے والدین کے پاس چلا جائے۔

غلطی میں نے یہ کی کہ اُس کو لاری میں نہ بٹھایا۔ کرایہ وغیرہ میں نے اُسے دے دیا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے گا، مگر اسی دن رات کے تین بجے دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔ میں باہر صحن میں سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اُٹھا، سوچا کہ شاید کوئی تار آیا ہو۔ دروازہ کھولا تو سامنے جان محمد — میرے اوسان خطا ہو گئے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سیالکوٹ کیوں نہیں گیا۔ اُس نے اِس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دیا۔ اُس کا دماغ پہلے سے زیادہ غیر متوازن تھا۔ فرش پر بیٹھ کر اپنی کنپٹیوں پر زور زور سے گھونسے مارنے لگا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کروں۔ وہ یقیناً جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے سوچا، پیار محبت سے کام لینا چاہیے۔ چنانچہ بہت دیر تک میں اُس کا سر سہلاتا رہا۔ اِس کے بعد اُس سے پوچھا "جان محمد تمھیں کیا تکلیف ہے؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور فرش پر میری بچیوں کے جو ماربل پڑے ہوئے تھے، اُن سے کھیلنے لگا۔ اس کے بعد اُس نے ہر ماربل کو سجدہ کیا اور رونے لگا۔

میں نے پھر اُس سے بڑی محبت سے پوچھا "جان محمد، یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔"

اُس کی آنکھیں سُرخ انگارہ تھیں جیسے کئی دنوں سے شراب کے نشے میں دُھت ہے۔ اُس نے مجھے اِن آنکھوں سے دیکھا اور پُوچھا "تم اتنے بڑے نفسیات نگار بنتے ہو — کیا یہ نہیں جان سکتے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"میں اپنی کم مائگی تسلیم کرتا ہوں — اب تم خود بتا دو۔"

جان محمد مسکرایا "مجھے شمیم ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اب بھی مطلب پوچھتے ہیں آپ۔"
میں نے اُس سے کہا۔ "مجتبیٰ شمیم کو کوئی بیماری تو نہیں۔"
جان محمد ہنسا۔ "بہت بڑی بیماری ہے منٹو صاحب — یہ کئی لوگوں کو ہو چکی ہے۔ اُن میں سے میں بھی ایک ہوں — پہلے ڈلہوزی میں ہوتی تھی — اب یہاں لاہور چلی آئی ہے۔"
میں سمجھ گیا — جان محمد کئی برس ڈلہوزی میں رہ چکا تھا اور شمیم بھی۔ لیکن میں نے اُس سے کہا۔ "میں ابھی تک نہیں سمجھا — تم اب سو جاؤ — چلو آؤ — اندر صوفے پر لیٹ جاؤ۔ خبردار جو تم نے شور مچایا۔"
وہ اندر چلا آیا اور صوفے پر لیٹ گیا — میں صبح جلدی اُٹھنے کا عادی ہوں۔ ساڑھے چار بجے کے قریب اُٹھا تو دیکھا کہ جان محمد غائب ہے۔ سات بجے پتہ چلا کہ شمیم بھی اپنے فلیٹ میں نہیں ہے — کہیں غائب ہو گئی۔

(۱۳ مئی ۵۴ء)

بارش

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھا جل تھل دیکھ رہا تھا ——— باہر بہت بڑا لان تھا جس میں دو درخت تھے۔ ان کے سبز پتے بارش میں نہا رہے تھے۔ اُس کو ایسا محسوس ہُوا کہ وہ پانی کی اس یورش سے خوش ہو کر ناچ رہے ہیں۔ اُدھر ٹیلی فون کا ایک کھمبا گڑا تھا اُس کے فلیٹ کے عین سامنے۔ یہ بھی بڑا مسرور نظر آتا تھا، حالانکہ اس کی مسرت کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس بے جان شے کو بھلا مسرور کیا ہونا تھا ——— لیکن تنویر نے جو کہ بہت مغموم تھا، یہی محسوس کیا کہ اُس کے آس پاس جو بھی شے ہے، خوشی سے ناچ گا رہی ہے۔

ساون گذر چکا تھا اور بارانِ رحمت نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں نے مسجدوں میں اکٹھے ہو کر دعائیں مانگیں، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ بادل آتے اور جاتے رہے، مگر اُن کے تھنوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔

آخر ایک دن اچانک کالے کالے بادل آسمان پر گھِر آئے اور چھاجوں پانی برسنے لگا۔ تنویر کو بادلوں اور بارشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ——— اُس کی زندگی چٹیل میدان بن چکی تھی جس کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ بھی کسی نے نہ ٹپکایا ہو۔ دو برس پہلے، اُس نے ایک لڑکی سے جس کا نام ثریا تھا، محبت کرنا شروع کی۔ مگر یک طرفہ محبت تھی۔ ثریا نے اُسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا۔

ساون کے دن تھے، بارش ہو رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی سے باہر نکلا، جانگیہ پہن کر، کہ نہائے اور بارش کا لُطف اُٹھائے۔ آم بالٹی میں پڑے تھے۔ وہ اکیلا بیٹھا انھیں چُوس رہا تھا کہ اچانک اُسے چیخیں اور قہقہے سنائی دیے۔

اُس نے دیکھا کہ ساتھ والی کوٹھی کے لان میں دو لڑکیاں بارش میں نہا رہی ہیں اور خوشی میں شور مچا رہی ہیں۔ اُس کی کوٹھی اور ساتھ والی کوٹھی کے درمیان صرف ایک جھاڑیوں کی دیوار حائل تھی۔

تنویر اُٹھا ——— آم کا رس چُوستے ہوئے وہ باڑ کے پاس گیا اور غور سے ان دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ دونوں مہین ململ کے کُرتے پہنے تھیں، جو اُن کے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ شلواریں چونکہ لٹھے کی تھیں اس لیے تنویر کو اُن کے بدن کے نچلے حصّے کے صحیح خدوخال کا پتہ نہ چل سکا۔

اُس نے پہلے کسی عورت کو ایسی نظروں سے کبھی نہیں دیکھا تھا، جیسا کہ اُس روز جب کہ بارش ہو رہی تھی، اُس نے اُن دونوں لڑکیوں کو دیکھا ——— دیر تک وہ اُن کو دیکھتا رہا جو بارش میں بھیگ بھیگ کر خوشی کے نعرے بلند کر رہی تھیں۔

تنویر نے اُن کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ وہ طبعاً کچھ اس قسم کا لڑکا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو بُری نظروں سے دیکھنا گناہ

سمجھتا تھا۔ مگر اُس نے اُس روز بڑی للچائی نگاہوں سے اُن کو دیکھا —— دیکھا ہی نہیں، بلکہ اُن کے گیلے بدن میں انگارہ بن کر برمے کی طرح چھید کرتا رہا۔

تنویر کی عمر اُس وقت بیس برس کے قریب ہوگی۔ ناتجربہ کار تھا۔ زندگی میں اُس نے پہلی مرتبہ جوان لڑکیوں کے شباب کو گیلی ململ میں لپٹے دیکھا، تو اس نے یوں محسوس کیا کہ اُس کے خون میں چنگاریاں دوڑ رہی ہیں۔

اس نے اُن لڑکیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا چاہا —— دیر تک وہ غور کرتا رہا —— ایک لڑکی بڑی شریر تھی —— دوسری اُس سے کم —— اُس نے سوچا شریر اچھی رہے گی جو اُس کو شرارتوں کا سبق دے سکے۔

یہ شریر لڑکی خوبصورت تھی، اُس کے بدن کے اعضا بھی بہت مناسب تھے۔ بارش میں نہاتی جل پری معلوم ہوتی تھی تھوڑی دیر کے لیے تنویر شاعر بن گیا۔ اُس نے کبھی اس طور پر نہیں سوچا تھا۔ لیکن اس لڑکی نے جس کا کرتہ دوسری کے مقابلے میں بہت زیادہ مہین تھا، اُس کو ایسے ایسے شعر یاد کرا دیے جن کو عرصہ ہوا بھول چکا تھا۔

اس کے علاوہ ریڈیو پر سنے ہوئے فلمی گانوں کی دُھنیں بھی اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں اور اُس نے باڑ کے پیچھے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اشوک کمار ہے —— دلیپ کمار ہے —— پھر اُسے کامنی کوشل اور نلنی جیونت کا خیال آیا —— مگر اُس نے جب اُس لڑکی کی طرف اس غرض سے دیکھا کہ اُس میں کامنی کوشل اور نلنی جیونت کے خدوخال نظر آجائیں تو اس نے اُن دونوں ایکٹرسوں پر لعنت بھیجی —— وہ ان سے کہیں زیادہ حسین تھی —— اس کے ململ کے کرتے میں جو شباب تھا، اس کا مقابلہ، اس نے سوچا، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

تنویر نے آم چوسنے بند کر دیے اور اُس لڑکی سے جس کا نام پروین تھا، عشق لڑانا شروع کر دیا۔

شروع شروع میں اُسے بڑی مشکلات پیش آئیں، اس لیے کہ اُس لڑکی تک رسائی تنویر کو آسان نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر اسے اپنے والدین کا بھی ڈر تھا۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اُس سے ملتفت ہوگی یا نہیں؟

بہت دیر تک وہ انہی الجھنوں میں گرفتار رہا —— راتیں جاگتا —— جھاڑیوں کی پست قد جھاڑ کے پاس جاتا مگر وہ نظر نہ آتی۔ گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا، اور وہ بارش والا منظر جو اس نے دیکھا تھا، آنکھیں بند کر کے ذہن میں دہراتا رہتا۔

بہت دنوں کے بعد آخر اُس کو ایک روز اُس سے ملاقات کرنے کا موقع مل گیا، وہ اپنے باپ کی کار میں گھر کے کسی کام کی غرض سے جا رہا تھا کہ پروین سے اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ کار اسٹارٹ کر چکا تھا کہ ساتھ والی کوٹھی میں سے تنویر کے خوابوں کی شہزادی نکلی۔ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ موٹر روک دے۔

تنویر گھبرا گیا —— ہر عاشق ایسے موقعوں پر گھبرا ہی جایا کرتا ہے۔ اُس نے موٹر کچھ ایسے بیہودے انداز میں روکی کہ اُس کو زبردست دھچکا لگا —— اس کا سر زور سے اسٹیئرنگ وہیل کے ساتھ ٹکرایا، مگر اُس وقت وہ شراب کے نشے سے زیادہ مخمور تھا۔ اُس کو اُس کی محبوبہ نے خود مخاطب کیا تھا۔

پروین کے ہونٹوں پر گہرے سُرخ رنگ کی لپ اسٹک لگی ہوئی تھی —— اس نے سُرخ مسکراہٹ سے کہا،

معاف فرمایئے گا۔ میں نے آپ کو تکلیف دی ——— بارش ہو رہی ہے ——— تانگہ اس دُور دراز جگہ ملنا محال ہے ——— اور مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا، آپ میرے ہمسایے ہیں، اسی لیے آپ کو یہ زحمت دی۔"

تنویر نے کہا، "زحمت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ——— میں تو ——— میں تو ———" اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "آپ سے میرا تعارف تو نہیں، لیکن آپ کو ایک بار دیکھا تھا۔"

پروین اپنی سُرخ مسکراہٹوں کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی اور تنویر سے پُوچھا "آپ نے مجھے کب دیکھا تھا؟"

تنویر نے جواب دیا، "آپ کی کوٹھی کے لان میں ——— جب آپ ——— جب آپ اور آپ کے ساتھ ایک اور لڑکی بارش میں نہا رہی تھی۔"

پروین نے اپنے گہرے سُرخ لبوں میں سے چیخ نما آواز نکالی "ہائے ——— آپ دیکھ رہے تھے؟"

"یہ گستاخی میں نے ضرور کی ——— اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔"

پروین نے ایک ادا کے ساتھ اُس سے پوچھا۔ "آپ نے دیکھا کیا تھا؟"

یہ سوال ایسا تھا کہ تنویر اُس کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا "جی کچھ نہیں ——— بس آپ کو ——— میرا مطلب ہے کہ دو لڑکیاں تھیں جو بارش میں نہا رہی تھیں اور ——— اور خوش ہو رہی تھیں ——— میں اُس وقت آم چوس رہا تھا۔"

پروین کے گہرے سُرخ لبوں پر شریر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "آپ آم چوستے کیوں ہیں ——— کاٹ کر کیوں نہیں کھاتے؟"

تنویر نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس سوال کا جواب کیا دے چنانچہ وہ گول کر گیا۔ "آپ کو میں کہاں ڈراپ کر دوں۔"

پروین مسکرائی، "آپ مجھے کہیں بھی ڈراپ کر دیں، وہی میری منزل ہو گی۔"

تنویر نے یوں محسوس کیا کہ اُسے اپنی منزل مل گئی ہے۔ لڑکی جو اُس کے پہلو میں بیٹھی ہے، اب اُسی کی ہے۔ لیکن اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اُس کا ہاتھ دبائے، یا اُس کی کمر میں ایک دو سیکنڈ کے لیے اپنا بازو حمائل کر دے۔

بارش ہو رہی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ اس نے کافی دیر سوچا۔ موٹر کی رفتار اُس کے خیالات کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی گئی۔ آخر اس نے ایک جگہ اُسے روک لیا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اُس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر دیے ——— اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کوئی بہت ہی لذیذ آم چُوس رہا ہے۔ پروین نے کوئی مزاحمت نہ کی ——— لیکن فوراً تنویر کو یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ اس نے بڑی ناشائستہ حرکت کی ہے، اور غالباً پروین کو اُس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی، چنانچہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اُس نے کہا "آپ کو کہاں جانا ہے؟"

پروین کے چہرے پر یوں خفگی کے کوئی آثار نہیں تھے، لیکن تنویر یوں محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ اُس کے خون کی پیاسی ہے۔

پروین نے اُسے بتا دیا کہ اُسے کہاں جانا ہے ——— جب وہ اس جگہ پہنچا تو اُسے معلوم ہوا وہ رنڈیوں کا چکلہ ہے۔

—— جب اس نے پرویز کو موٹر سے اُتارا تو اُس کے ہونٹوں پر گہرے لال رنگ کی مسکراہٹ بکھر رہی تھی۔ اُس نے کوٹھے ٹھکا کر ٹھیٹ کسبیوں کے انداز میں اس سے کہا، "شام کو میں یہاں ہوتی ہوں —— آپ کبھی ضرور تشریف لایئے۔"

تنویر جب بھونچکا ہو کر اپنی موٹر کی طرف بڑھا، تو اسے ایسا لگا کہ وہ بھی ایک کسبی عورت ہے، جیسے وہ ہر روز چلاتا ہے۔ اس کی لال بتی لپ اسٹک ہے، جو پروین نے ہونٹوں پر تھپی ہوئی تھی۔

وہ واپس اپنی کوٹھی چلا آیا —— بارش ہو رہی تھی —— اور تنویر بے حد مغموم تھا —— اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں کے آنسو بارش کے قطرے بن کے ٹپک رہے ہیں۔

(۱۴ مئی ۵۴ء)

افشائے راز

"میری لگدی کسے نہ ویکھی، تے ٹُٹدی نوں جگ جاندا۔"

"یہ آپ نے گانا کیوں شروع کر دیا ہے۔"

"ہر آدمی گاتا اور روتا ہے ——— کونسا گناہ کیا ہے؟"

"کل آپ غسل خانے میں بھی یہی گیت گا رہے تھے۔"

"غسل خانے میں تو ہر شریف آدمی اپنی استطاعت کے مطابق گاتا ہے ——— اس لیے کہ وہاں کوئی سننے والا نہیں ہوتا ——— میرا خیال ہے، تمھیں میری آواز پسند نہیں آئی۔"

"آپ کی آواز تو ماشاء اللہ بڑی اچھی ہے۔"

"مجھے بنا رہی ہو ——— مجھے اس کا علم ہے کہ میں کن سرا ہوں۔ میری آواز میں کوئی کشش نہیں ——— کوئی بھی اسے پھٹے بانس کی آواز کہہ سکتا ہے۔"

"مجھے تو آپ کی آواز بڑی سُریلی معلوم ہوتی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے ——— لیکن میں پوچھتی ہوں، ہر وقت یہ پنجابی وردِ زبان کیوں رہتی ہے۔"

"مجھے اچھی لگتی ہے ——— بیگم تم کو اگر ادب اور شعر سے ذرا سا بھی شغف ہو ———"

"یہ شغف کیا بلا ہے ——— آپ ہمیشہ ایسے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔"

"شغف کا مطلب ——— بس تم یہ سمجھ لو ——— کہ اس کا مطلب لگاؤ ہے۔"

"مجھے شاعری سے لگاؤ کیوں ہو ——— ایسی واہیات چیز ہے۔"

"یعنی شاعری بھی اِک چیز ہوگئی ——— یہ تمھاری بڑی زیادتی ہے ——— فرصت کے لمحات میں اپنے اندر ذوق پیدا کیا کرو۔"

"چھ بچے پیدا کر چکی ہوں ——— اب میں اور کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی۔"

"میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا کہ معاملہ ختم ہونا چاہیے، پر تم ہی نہیں مانیں ——— چھ بچے پیدا کر کے تم تھک گئی ہو۔ تمھارے پڑوس میں مسز قیوم رہتی ہیں۔ اس کے گیارہ بچے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں بھی گیارہ ہی پیدا کروں۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے ——— میں تو ایک کا بھی قائل نہیں تھا۔"

"میں اچھی طرح جانتی ہوں ——— جب میرے بچہ نہ ہوتا تو آپ اسی بہانے سے دوسری شادی کر لیتے۔"

"میں تو ایک ہی شادی سے بھر پایا ہوں ——— تم ساری زندگی کے لیے کافی ہو ——— میں دوسری شادی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔"

"اور یہ پنجابی بولی کس لیے گائی جا رہی تھی۔"

"بھئی، میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے یہ پسند ہے ——— تمھیں ناپسند ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں ——— میری اگدی کسے نہ ویکھی ——— تے ٹٹدی نوں جگ جاندا۔"

"اس بولی میں آپ کو کیا لذت محسوس ہوتی ہے۔"

"میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"آپ نے اب تک کوئی بات وثوق سے نہیں کہی۔"

"وثوث نہیں ——— وثوق ——— یعنی یقین کے ساتھ۔"

"آپ نے ابھی تک کوئی بات ایسی نہیں کی جس میں یقین پایا جاتا ہو۔"

"تو، آج یہ نئی بات سُنی ——— میری باتوں پر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔

"مردوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا ہے؟"

"عورتوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا ——— گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ——— آپ ہی پھاڑتی ہیں، آپ ہی رفو کرتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ آج کی برہمی کس بات پر ہے۔"

"آپ ایسے واہیات گیت گاتے رہیں اور میں چپ رہوں ——— اب سے دُور قرآن درمیان، آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے اعتنائی کی ——— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو غزلوں اور گیتوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے ——— ابھی پچھلے دنوں آپ مسلسل یہ شعر گنگناتے رہے ہے

شُنا ہے مہ جبینوں کو بھی کچھ کچھ
مروّت کے قرینے آ رہے ہیں

مجھے اس پر سخت اعتراض ہے ——— کوئی شریف آدمی ایسے شعر نہیں گاتا ——— آپ سے

تیری ذات ہے اکبری سروری
میری بار کیوں دیر اتنی کری

نہیں گاتے۔"

"لاحول ولا ——— تم بھی کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہو۔"

"یہ باتیں گویا آپ کے نزدیک اُوٹ پٹانگ ہیں؟ ——— اس لیے کہ پاکیزہ ہیں؟"

"دنیا میں ہر چیز پاکیزہ ہے۔"

"آپ بھی؟"

"میں تو ہمیشہ صاف ستھرا رہتا ہوں۔ تم نے کئی مرتبہ اس کی تعریف کی ہے دن میں دو مرتبہ کپڑے بدلتا ہوں سخت سردی بھی ہو غسل کرتا ہوں۔ تم تو تین چار دن چھوڑ کے نہاتی ہو۔ تمھیں پانی سے نفرت ہے۔"

"اجی واہ —— میں تو ہر ہفتے باقاعدہ نہاتی ہوں۔"

ہر ہفتے کا نہانا تو سفید جھوٹ ہے —— قرآن کی قسم کھا کے بتاؤ، تمھیں نہائے ہوئے کتنے دن ہوگئے ہیں۔"

"میں قرآن کی قسم کھانے کے لیے تیار نہیں —— آپ بتائیے، کب غسل کیا تھا۔"

"آج صبح"

"جھوٹ —— آپ کا اوّل جھوٹ، آخر جھوٹ —— آج صبح تو نل میں پانی ہی نہیں تھا —— میں نے ساڑھے نو بجے کے قریب دو مشکیں منگوائی تھیں۔"

"میں بھول گیا —— واقعی آج میں نے غسل نہیں کیا۔"

"آپ کو بھول جانے کا مرض ہے۔"

"بھولنا انسان کی فطرت ہے —— اس پر تمھیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں —— چند روز ہوئے تم دس کا نوٹ کہیں رکھ کے بھول گئی تھیں۔ اور مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے چوری کر لیا ہے —— یہ کتنی بڑی زیادتی تھی۔"

جیسے آپ نے میرے روپے کبھی نہیں چرائے —— پچھلے مہینے میری الماری سے آپ نے سو روپے نکالے اور غائب کر گئے۔"

"ہو سکتا ہے وہ کسی اور نے چرائے ہوں —— اگر تمھیں مجھ پر شک تھا تو بتا دیا ہوتا —— یہ بھی ممکن ہے کہ تم نے وہ سو روپے کا نوٹ کسی محفوظ جگہ رکھا ہو اور بعد میں بھول گئی ہو —— کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے ——"

"کب؟"

پچھلے سال اسی مہینے تم نے پانچ سو روپے کے نوٹ اپنے پلنگ کے بستر کے نیچے چھپا رکھے تھے اور تم اُن کے متعلق بالکل بھول گئی تھیں —— مجھ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ میں نے چرائے ہیں۔ آخر میں نے ہی تلاش کر کے نکالے اور تمھارے حوالے کر دیئے۔"

کیا پتہ ہے کہ آپ نے چرائے ہوں اور بعد میں میرے شور مچانے پر اپنی جیب سے نکال کر بستر کے نیچے رکھ دیئے ہوں۔"

"میری سمجھ میں تمھاری یہ منطق نہیں آتی۔"

"آپ کی سمجھ میں تو کوئی چیز بھی نہیں آتی —— کل میں نے آپ سے کہا تھا کہ دہی کھانا آپ کے لیے مفید ہے، لیکن آپ نے مجھے ایک لکچر پلا دیا کہ دہی فضول چیز ہے۔"

"دہی تو میں ہر روز کھاتا ہوں۔"

"کتنا کھاتے ہیں؟"

"یہی، کوئی آدھ سیر۔"

"میں ہر روز سیر منگواتی ہوں ——— باقی پڑا جھک مارتا رہتا ہے۔"

"دہی کو جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے ——— جو بچ جاتا ہے۔ اُس کی تم کڑھی بنا لیتی ہو۔"

"میں دہی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی ——— کڑھی بناتی ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں سلیقہ شعار عورت ہوں ——— میں نے آپ سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ آپ آج کل ایک خاص پنجابی بولی کیوں ہر وقت گاتے رہتے ہیں۔"

"اس لیے کہ مجھے پسند ہے۔"

"کیوں پسند ہے؟ ——— اس کی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔"

"تمہیں کالا رنگ کیوں پسند ہے ——— اس کی وجہ بتاؤ ——— تمہیں بھنڈیاں مرغوب ہیں ——— کیوں؟ تمہیں سینما دیکھنے کا شوق ہے ——— اس کا جواز پیش کرو ——— تم لٹھے کی بجائے ریشم کی شلواریں پہنتی ہو، اس کی کیا وجہ ہے؟"

"آپ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ مجھ سے اس قسم کے سوال کریں ——— میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔"

"اپنی مرضی کا مالک میں بھی ہوں ——— کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ جو شعر بھی مجھے پسند ہو، اپنی بھونڈی آواز میں دن رات گاتا رہوں۔"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ——— لیکن میں سمجھتی ہوں ———"

"کہ کیوں رُک گئیں؟"

"دیکھیے۔ آپ میری زبان نہ کھلوائیے ——— میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔"

"تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟"

"سب کچھ۔"

"کچھ مجھے بھی بتا دو، تاکہ میں اپنے متعلق کچھ جان سکوں ——— میں تو سالہا سال کے غور و فکر کے بعد بھی اپنے متعلق کچھ جان نہ سکا۔"

"آپ کو اُس پنجابی بولی میں جو آپ مسلسل گنگناتے رہتے ہیں ——— سب کچھ جان سکتے ہیں۔"

"تم اس قدر رنشاکی کیوں ہو؟"

"ہر مرد بے وفا ہوتا ہے۔"

میں نے تم سے کیا بے وفائی کی ہے ——— اصل میں عورتیں جا و بے جا اپنے شوہروں پر شک کرتی رہتی ہیں ٹھہریئے ——— دروازے پر دستک ہوئی ہے ——— میرا خیال ہے، ڈاکیہ ہے۔"

× × × × ×

"یہ خط میرا ہے — لاؤ ادھر۔"
"میں کھولتی ہوں — پڑھ کے آپ کے حوالے کر دوں گی۔"
"تمہیں میرے خط پڑھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔"
"میں ہمیشہ آپ کے خط پڑھتی رہی ہوں — یہ حق آپ نے کب سے چھین لیا؟"
"اچھا یہ بتا دو کہ خط کس کا ہے۔"
"آپ ہی کا ہے؟"
"کس نے لکھا ہے؟"
"آپ کی ایک سہیلی نے — جس کا نام عذرا ہے — وہ پنجابی بولی جو آپ گاتے پھرتے ہیں اس کاغذ کی پیشانی پر لکھی ہے —

میری لگدی کسے نہ دیکھی وے — تے ٹٹدی نوں جگ جانندا

یہ ٹوٹ ہی جاتے تو بہتر ہے۔

(۱۵ مئی سنہ ۵۴ء)

آمنہ

دُور تک پھیلے ہوئے دھان کے سنہرے کھیت پھیلے ہوئے تھے جمّے کا نوجوان لڑکا بُندو سُوکھے ہوئے دھان کے پُولے اٹھا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گا بھی رہا تھا

دھان کے پُولے دھر دھر کاندھے
بھر بھر لائے
کھیت سنہرا۔ دھن دولت رے۔

بُندو کا باپ جمّا، گاؤں میں بہت مقبول تھا۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اُس کو اپنی بیوی سے بہت پیار ہے۔ اُن دونوں کا عشق گاؤں کے ہر شخص کو معلوم تھا۔ ان کے دو بچے تھے، ایک بُندو جس کی عمر تیرہ برس کے قریب تھی۔ دوسرا چندو۔

سب خوش و خرم تھے، مگر ایک روز اچانک جمّے کی بیوی بیمار پڑ گئی، حالت بہت نازک ہو گئی۔ بہت علاج کیے۔ ٹونے ٹوٹکے آزمائے، مگر اُس کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ جب مرض مہلک شکل اختیار کر گیا تو اُس نے اپنے شوہر سے نحیف لہجے میں کہا "تم مجھے کبوتری کہا کرتے تھے اور خود کو کبوتر ——— ہم دونوں نے دو بچے پیدا کیے ——— اب یہ تمھاری کبوتری مر رہی ہے ——— کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے مرنے کے بعد تم کوئی اور کبوتری اپنے گھر لے آؤ"

تھوڑی دیر کے بعد اُس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ جمّے کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کی بیوی بولے چلی جا رہی تھی "تم اور کبوتری لے آؤ گے ——— وہ سوچے گی کہ جب تک میرے بچے زندہ ہیں تم اُس سے محبت نہیں کرو گے ——— چنانچہ وہ اُن کو ذبح کر کے کھا جائے گی"

جمّے نے اپنی بیوی سے بڑے پیار کے ساتھ کہا "سکینہ، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا گر تمھارے دشمن مریں۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی"

سکینہ کے ہونٹوں پر مُردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس کے فوراً بعد اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جمّا بہت رویا۔ جب اُس نے اپنے ہاتھوں سے اس کو دفن کیا تو اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے اپنی زندگی منوں مٹی کے نیچے گاڑ دی ہے

اب وہ ہر وقت مغموم رہتا۔ کام کاج کام میں اُسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ایک دن اُس کے ایک وفادار مزارعے نے اُس سے کہا "سرکار مہینوں سے میں آپ کی یہ حالت دیکھ رہا ہوں اور جی ہی جی میں کڑھتا رہا ہوں۔ آج مجھ سے نہیں رہا گیا، تو آپ سے یہ عرض کرنے آیا ہوں نہ بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اپنی زمینوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے ——— آپ کو اس کا علم بھی نہیں، کتنا نقصان ہو

ہو رہا ہے۔"

جمّے نے بڑی بے توجہی سے کہا "ہونے دو ——— مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں۔"

"سرکار ——— آپ ہوش میں آیئے ——— چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں، ایسا نہ ہو وہ آپ کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر آپ کی زمینوں پر قبضہ کر لیں۔ آپ سے مقدمہ بازی کیا ہو گی ——— میری تو یہی مخلصانہ رائے ہے کہ آپ دوسری شادی کر لیں ——— اس سے آپ کے غم کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور وہ آپ کے لڑکوں سے پیار محبت بھی کرے گی۔

جمّے کو غصہ آیا "بکواس نہ کرو رمضانی۔ تم سمجھتے نہیں کہ سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تم یہ بھی تو سوچو، میری بیوی کی رُوح کو کتنا بڑا صدمہ پہنچے گا۔"

مت دنوں کے اصرار کے بعد آخر رمضانی اپنے آقا کو دوسری شادی پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب شادی ہو گئی تو اُس نے اپنے لڑکوں کو ایک علیحدہ مکان میں بھیج دیا ——— ہر روز وہاں کئی کئی گھنٹے رہتا اور بندو اور چندو کی دلجوئی کرتا رہتا۔

نئی بیوی کو یہ بات بہت ناگوار گذری۔ ایک بات اور بھی تھی کہ مکھن دودھ کا بیشتر حصہ اُس کے سوتیلے بیٹوں کے پاس چلا جاتا تھا۔ اس سے وہ بہت جلتی۔ اس کا تو یہ مطلب تھا کہ گھر بار کے مالک وہی ہیں۔

ایک دن جمّا جب کھیتوں سے واپس آیا تو اُس کی نئی بیوی زاروقطار رونے لگی۔ جمّے نے اس آہ و زاری کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا "تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے ——— اسی لیے بچّوں کو دوسرے مکان میں بھیج دیا۔ میں ان کی ماں ہوں۔ کوئی دشمن تو نہیں ہوں۔ مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ جب میں سوچتی ہوں کہ بیچارے اکیلے رہتے ہیں۔"

جمّا ان باتوں سے بہت متاثر ہوا اور دوسرے ہی دن بندو اور چندو کو لے آیا اور اُن کو سوتیلی ماں کے حوالے کر دیا جس نے اُن کو اتنے پیار محبت سے رکھا کہ آس پاس کے تمام لوگ اُس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔

نئی بیوی نے جب اپنے خاوند کے دل کو پوری طرح موہ لیا تو ایک دن ایک مزارعہ کو بُلا کر اکیلے میں اُس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا "میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں ——— بولو کرو گے؟"

اس مزارعہ نے جس کا نام شبراتی تھا، ہاتھ جوڑ کر کہا "سرکار، آپ مائی باپ ہیں ——— جان تک حاضر ہے۔"

نئی بیوی نے کہا "دیکھو، کل دریا کے پاس بہت بڑا میلہ لگ رہا ہے ——— میں اپنے سوتیلے بچّوں کو تمہارے ساتھ بھیجوں گی۔ اُن کو کشتی کی سیر کرانا اور کسی نہ کسی طرح جب کوئی اور دیکھتا نہ ہو انھیں گہرے پانی میں ڈبو دینا۔"

شبراتی کی ذہنیت غلامانہ تھی۔ اس کے علاوہ اُس کو بہت بڑے انعام کا لالچ دیا گیا تھا۔ وہ دوسرے روز بندو اور چندو کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انھیں کشتی میں بٹھایا۔ اُس کو خود کھینچنا شروع کیا۔ دریا میں دُور تک چلا گیا، جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا ——— اُس نے چاہا کہ انھیں دھکا دے کر ڈبو دے، مگر ایک دم اُس کا ضمیر جاگ اُٹھا۔ اُس نے سوچا، ان بچّوں کا کیا قصور ہے ——— سوائے اس کے کہ ان کی اپنی ماں مر چکی ہے اور اب یہ سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ میں انھیں کسی شخص کے حوالے کر دوں اور سوتیلی ماں سے جا کر کہہ دوں کہ دونوں ڈوب چکے ہیں۔

دریا کے دوسرے کنارے اُتر کر اُس نے بندو اور چندو کو ایک تاجر کے حوالے کر دیا ـــــ جس نے اُن کو ملازم رکھ لیا۔
بڑا لڑکا بندو کھیل کود کا عادی، محنت مشقت سے بہت گھبراتا تھا ـــــ تاجر کے ہاں سے بھاگ نکلا اور پیدل چل کر دوسرے شہر میں پہنچا، مگر وہاں اُسے ایک دولت مند آدمی کے ہاں جس کا نام قلندر بیگ تھا، پناہ لینا پڑی۔ قلندر بیگ نیک دل آدمی تھا، اُس نے چاہا کہ بندو کو اپنے ہاں نوکر رکھ لے چنانچہ اُس نے اُس سے پوچھا "برخوردار کیا تنخواہ لوگے۔"

بندو نے جواب دیا "جناب یہ میں تنخواہ نہیں لوں گا۔"

قلندر بیگ کو کسی قدر حیرت ہوئی۔ لڑکا شکل و صورت کا اچھا تھا۔ اس میں گنوار پن بھی نہیں تھا۔ اُس نے پوچھا "تم کس خاندان کے ہو ـــــ کس شہر کے باشندے ہو؟"

بندو نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا، پھر رونے لگا۔ قلندر بیگ نے اُس سے مزید استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب بندو کو اس کے یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گذر گیا تو قلندر بیگ اُس کی خوش اطواری سے بہت متاثر ہُوا۔ ایک دن اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "بندو مجھے بہت پسند ہے ـــــ میں تو سوچتا ہوں، اس سے اپنی ایک لڑکی بیاہ دوں ــــــ۔"

بیوی کو اپنے خاوند کی یہ بات بُری لگی۔ لیکن آخر اس نے کہا، "آپ سے اس کے خاندان کے متعلق تو دریافت کیجیے۔"

قلندر بیگ نے کہا "میں نے ایک مرتبہ اُس سے اُس کے خاندان کے متعلق پوچھا تو وہ زار و قطار رونے لگا ـــــ پھر میں نے اس موضوع پر اُس سے کبھی گفتگو نہیں کی۔"

بندو کئی برس قلندر بیگ کے ہاں رہا۔ جب بیس برس کا ہو گیا تو قلندر بیگ نے اپنا سارا کاروبار اُس کے سپرد کر دیا۔ کافی عرصہ گذر گیا۔ ایک دن بندو نے بڑے ادب سے اپنے آقا سے درخواست کی "دریا کے اُس پار دُور جو ایک گاؤں ہے، وہاں میں چھوٹا سا مکان بنوانا چاہتا ہوں ـــــ کیا مجھے آپ اتنا روپیہ مرحمت فرما سکتے ہیں کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے۔"

قلندر مُسکرایا، "تم جتنا روپیہ چاہو لے سکتے ہو بیٹا ـــــ لیکن یہ بتاؤ کہ تم دریا پار اتنی دُور مکان کیوں بنوانا چاہتے ہو؟"

بندو نے جواب دیا، "یہ راز آپ پر عنقریب کھُل جائے گا۔"

بندو اور چندو کا باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں گھُل گھُل کے مر چکا تھا۔ مزارعوں کی بڑی ابتر حالت تھی۔ اس لیے کہ زمینوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

بندو، بہت سا روپیہ لے کر اپنے گاؤں پہنچا، ایک پکا مکان بنوایا اور مزارعوں کو خوش حال کر دیا۔

بندو کا بھائی چندو جس شخص کے ہاں ملازم ہوا تھا، اُس نے اُس کو بیٹا بنا لیا تھا۔ ایک دفعہ وہ خطرناک طور پر بیمار پڑ گیا تو اُس شخص کی بیوی نے جس کا نام صمد خاں تھا، اپنی بیٹی آمنہ سے کہا کہ وہ اُس کی تیمارداری کرے۔

آمنہ بڑی نازک اندام حسین لڑکی تھی۔ دن رات اُس نے چندو کی خدمت کی۔ آخر وہ صحت مند ہو گیا۔ تیمارداری کے اس دور میں وہ کچھ اس طرح گھُل مل گئے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔

مگر چندو سوچتا تھا کہ آمنہ ایک دولت مند کی لڑکی ہے اور وہ محض کنگلا۔ اُن کا آپس میں کیا جوڑ ہے۔ اُس کے والدین

بھلا کب اُن کی شادی پر راضی ہوں گے۔ لیکن آمنہ کو کسی قدر یقین تھا کہ اُس کے والدین راضی ہو جائیں گے، اس لیے کہ وہ چندو کو بڑی اچھی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

ایک دن چندو گائے بھینسوں کے ریوڑ کو جوہڑ پر پانی پلا رہا تھا کہ آمنہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اُس کی سانس پھُولی ہوئی تھی۔ ننھا سا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اُس نے خوش خوش چندو سے کہا، "ایک بہت اچھی خبر لائی ہوں۔ آج میری ماں اور باپ میری شادی کی بات کر رہے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ اس لیے تمھیں میرے ساتھ بیاہ دینا چاہیے۔"

چندو اِس قدر خوش ہُوا کہ اس نے آمنہ کو اُٹھا کر ناچنا شروع کر دیا۔

اُن دونوں کی شادی ہوگئی۔ ایک سال کے بعد اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہُوا جس کا نام جمیل رکھا گیا۔

جب بندو اپنے گاؤں میں اچھی طرح جم گیا تو اُس نے بھائی کا پتہ لیا جا کے اُس سے ملا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ بندو نے اُس سے کہا، "اب اللہ کا فضل ہے۔ چلو میرے ساتھ اور دیوانی سنبھالو۔ میں چاہتا ہوں تمھاری شادی اپنی سالی سے کرا دوں ـــــ بڑی پیاری لڑکی ہے۔"

چندو نے اُس کو بتایا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے۔ سارے حالات سن کر بندو نے اُس کو سمجھایا۔ "قلندر بیگ بے حد دولتمند آدمی ہے۔ اس کی لڑکی سے شادی کر لو ـــــ ساری عمر عیش کرو گے ـــــ آمنہ کے باپ کے پاس کیا پڑا ہے۔"

چندو اپنے بھائی کی یہ باتیں سُن کر لالچ میں آگیا، اور دولت مند آمنہ کو چھوڑ دیا۔ طلاق نامہ کسی کے ہاتھ بھجوا دیا اور اُس سے ملے بغیر چلا گیا۔

چند روز کے بعد ہی بندو نے اپنے بھائی کی شادی قلندر بیگ کی چھوٹی لڑکی سے کرا دی۔ آمنہ حیران و پریشان تھی کہ اُس کا پیارا چندو ایک دم کہاں غائب ہو گیا۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ایک دن ضرور واپس آجائے گا۔ بڑی دیر اُس نے اُس کی واپسی کا انتظار کیا اور اُس کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ جب وہ نہ آیا تو آمنہ کے باپ نے جمیل کو ساتھ لیا اور بندو کے گاؤں پہنچا۔ اس کی ملاقات چندو سے ہوئی۔ وُہ دولت کے نشے میں سب کو بھول چکا تھا۔

آمنہ کے باپ نے اُس کی بڑی منت سماجت کی اور اُس سے کہا "اور کچھ نہیں تو اپنے اِس کم سِن بیٹے کا خیال کرو تمھارے بغیر اِس بچے کی زندگی کیا ہے؟"

چندو نے یہ کورا جواب دیا "میں اپنی دولت اور عزت اس بچے کے لیے چھوڑ سکتا ہوں؟ ـــــ جاؤ اسے لے جاؤ اور میری نظروں سے دُور کر دو۔"

جب آمنہ کے باپ نے اور زیادہ منت سماجت کی تو چندو نے اُس بڈھے کو دھکے دے کر باہر نکلوا دیا۔ ساتھ ہی اپنے بچے کو بھی۔

بوڑھا باپ غم و اندوہ سے چُور گھر پہنچا اور آمنہ کو ساری داستان سُنا دی۔ آمنہ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ پاگل ہوگئی۔ چندو پر پے در پے اتنے مصائب آئے کہ اُس کی ساری دولت اُجڑ گئی۔ بھائی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ بیوی لڑ جھگڑ

اپنے میکے چلی گئی۔ اب اُس کو آمنہ یاد آئی۔ وہ اُس سے ملنے کے لیے۔ اس کا بیٹا جمیل، ہڈیوں کا ڈھانچہ، اس سے کھڑکے باہر ملا۔ اُس نے اُس کو پیار کیا اور آمنہ کے متعلق اس سے پوچھا۔

جمیل نے اُس سے کہا، "آؤ تمھیں بتاتا ہوں، میری ماں آج کل کہاں رہتی ہے۔"

وہ اُسے دُور لے گیا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے "یہاں رہتی ہے آمنہ اماں۔"

(۱۶ مئی ۱۹۵۴ء)

تصویر

"بچے کہاں ہیں؟"

"مر گئے ہیں!"

"سب کے سب؟"

"ہاں، سب کے سب —— آپ کو آج ان کے متعلق پوچھنے کا کیا خیال آگیا؟"

"میں اُن کا باپ ہوں۔"

"آپ ایسا باپ خدا کرے کبھی پیدا ہی نہ ہو۔"

"تم آج اتنی خفا کیوں ہو —— میری سمجھ میں نہیں آتا۔ گھڑی میں رتی گھڑی میں ماشہ ہو جاتی ہو —— دفتر سے تھک کر آیا ہوں اور تم نے یہ چخ چخ شروع کر دی ہے —— بہتر تھا کہ میں وہاں دفتر ہی میں پنکھے کے نیچے آرام کرتا۔"

"پنکھا یہاں بھی ہے —— آپ آرام طلب ہیں —— یہیں آرام فرما سکتے ہیں۔"

"تمہارا طنز کبھی نہیں جائے گا —— میرا خیال ہے کہ یہ چیز تمھیں جہیز میں ملی تھی۔"

"میں کہتی ہوں، کہ آپ مجھ سے اس قسم کی خرافات نہ بکا کیجیے —— آپ کے دیدوں کا تو پانی ہی ڈھل گیا ہے۔"

"یہاں تو سب کچھ ڈھل گیا ہے —— تمھاری وہ جوانی کہاں گئی؟ —— میں تو اب ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے سو برس کا بڈھا ہوں۔"

"یہ آپ کے اعمال کا نتیجہ ہے —— میں نے تو خود کو کبھی عمر رسیدہ محسوس نہیں کیا۔"

"میرے اعمال اتنے سیاہ تو نہیں —— اور پھر میں تمھارا شوہر ہوتے ہوئے کیا اتنا بھی محسوس نہیں کر سکتا کہ تمھارا شباب رُو بہ تنزل ہے۔"

"مجھ سے ایسی زبان میں گفتگو کیجیے جس کو میں سمجھ سکوں —— یہ رُو بہ تنزل کیا ہوا۔"

"چھوڑو اسے —— آؤ، محبت پیار کی باتیں کریں۔"

"آپ نے ابھی ابھی تو کہا تھا کہ آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سو برس کے بڈھے ہیں۔"

بھئی دل تو جوان ہے۔"

آپ کے دل کو میں کیا کہوں —— آپ اسے دل کہتے ہیں، مجھ سے کوئی پوچھے تو میں یہ کہوں گی کہ بڈھے کا ... بات جو

اس شخص نے اپنے پہلو میں دو بار رکھا ہے اور دعوٰی یہ کرتا ہے کہ اس میں محبّت بھری ہوئی ہے ——— آپ محبّت کرنا کیا جانیں ——— محبّت تو صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔"

"آج تک کتنی عورتوں نے مردوں سے محبّت کی ہے ——— ذرا تاریخ کا مطالعہ کرو ——— ہمیشہ مردوں ہی نے عورتوں سے محبّت کی اور اُسے نبھایا ——— عورتیں تو ہمیشہ بے وفا رہی ہیں۔"

"جھُوٹ ——— اس کا اوّل جھُوٹ، اس کا آخر جھُوٹ ——— بے وفائی تو ہمیشہ مردوں نے کی ہے۔"

اور وہ جو انگلستان کے بادشاہ نے ایک معمولی عورت کے لیے تخت و تاج چھوڑ دیا تھا؟ ——— وہ کیا جھُوٹی اور فرضی داستان ہے۔"

"بس ایک مثال پیش کر دی اور مجھ پر رعب ڈال دیا۔"

"بھئی تاریخ میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں ——— مرد جب کسی عورت سے عشق کرتا ہے تو وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتا کم بخت اپنی جان قربان کر دے گا، مگر اپنی محبوبہ کو ذرا سی بھی ایذا پہنچنے نہیں دے گا۔ تم نہیں جانتی ہو، مرد میں جب کہ وہ محبت میں گرفتار ہو کتنی طاقت ہوتی ہے۔"

"سب جانتی ہوں ——— آپ سے تو کل الماری کا جما ہوا دروازہ بھی نہیں کھُل سکا ——— آخر مجھے ہی زور لگا کر کھولنا پڑا۔"

"دیکھو، جانم ——— تم زیادتی کر رہی ہو ——— تمہیں معلوم ہے کہ میرے دہنے بازو میں ریح کا درد تھا۔ میں اُس دن دفتر بھی نہیں گیا تھا اور سارا دن اور ساری رات پڑا کراہتا رہا تھا ——— تم نے میرا کوئی خیال نہ کیا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ سینما دیکھنے چلی گئیں۔"

"آپ تو بہانہ کر رہے تھے۔"

"لاحول ولا ——— یعنی میں بہانہ کر رہا تھا۔ درد کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ میں بہانہ کر رہا تھا ——— لعنت ہے ایسی زندگی پر۔"

"یہ لعنت مجھ پر بھیجی گئی ہے!"

"تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں ——— میں اپنی زندگی کا رونا رو رہا تھا۔"

"آپ تو ہر وقت روتے ہی رہتے ہیں۔"

"تم تو ہنستی رہتی ہو ——— اس لیے کہ تمہیں کسی کی پرواہی نہیں۔ بھیجتے جائیں جہنم میں۔ میرا جنازہ نکل جائے ——— یہ مکان ل کو راکھ ہو جائے، مگر تم ہنستی رہو گی ——— ایسی بے دل عورت میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔"

"کتنی عورتیں دیکھی ہیں آپ نے اب تک؟"

"ہزاروں، لاکھوں ——— سڑکوں پر تو آج کل عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں۔"

"جھُوٹ نہ بولیے ——— آپ نے کوئی نہ کوئی عورت خاص طور پر دیکھی ہے۔"

"خاص طور پر سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"میں آپ کے راز کھولنا نہیں چاہتی ——— میں اب چلتی ہوں۔"

"کہاں ؟"

"ایک سہیلی کے یہاں ——— اُس سے اپنا دُکھڑا بیان کروں گی ۔ خود روؤں گی ، اُس کو بھی رُلاؤں گی ——— کس طرح کچھ جی ہلکا ہو جائے گا ۔"

وہ دُکھڑا جو تمھیں اپنی سہیلی سے بیان کرنا ہے ، مجھے ہی بتا دو ——— میں تمھارے غم میں شریک ہونے کا وعدہ کرتا ہوں ۔

"آپ کے وعدے ؟ ——— کبھی ایفا ہوئے ہیں ؟"

"تم بہت زیادتی کر رہی ہو ——— میں نے آج تک تم سے جو بھی وعدہ کیا ، پورا کیا ——— ابھی پچھلے دنوں تُم نے مجھ سے کہا کہ چائے کا ایک سیٹ لا دو ——— میں نے ایک دوست سے روپے قرض لے کر بہت عمدہ سیٹ خرید کر تمھیں لا دیا ۔"

"بڑا احسان کیا مجھ پر ——— وہ تو دراصل آپ ، اپنے دوستوں کے لیے لائے تھے ——— اُس میں سے دو پیالے کس نے توڑے تھے ؟ ذرا یہ تو بتلائیے ؟"

"ایک پیالہ تمھارے بڑے لڑکے نے توڑا ——— دوسرا تمھاری چھوٹی بچی نے "

"سارا الزام آپ ہمیشہ انھیں پر دھرتے ہیں ——— اچھا اب یہ بحث بند ہو ——— مجھے نہا دھو کر کپڑے پہننا اور جُوڑا کرنا ہے ۔"

"دیکھو ، میں نے آج تک کبھی سخت گیری نہیں کی ، میں ہمیشہ تمھارے ساتھ نرمی سے پیش آتا رہا ہوں ، مگر آج میں تمھیں حکم دیتا ہوں ، کہ باہر نہیں جا سکتیں ۔"

"اجی واہ ——— بڑے آئے مجھ پر حکم چلانے والے ——— آپ ہیں کون ؟"

"اتنی جلدی بھول گئی ہو ——— میں تمھارا خاوند ہوں ۔"

"میں نہیں جانتی ، خاوند کیا ہوتا ہے ——— میں اپنی مرضی کی مالک ہوں ——— میں باہر جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی ۔ دیکھتی ہوں ، مجھے کون روکتا ہے ۔"

"تم نہیں جاؤ گی ——— بس یہ میرا فیصلہ ہے ۔"

"فیصلہ اب عدالت ہی کرے گی ۔"

"عدالت کا یہاں کیا سوال پیدا ہوتا ہے ——— میری سمجھ میں نہیں آتا ، آج تم کیسی اُوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو ٹھکانے کی بات کرو ——— جاؤ نہا لو تاکہ تمھارا دماغ کسی حد تک ٹھنڈا ہو جائے ۔"

"آپ کے ساتھ رہ کر میں تو سر سے پیر تک برف ہو چکی ہوں ۔"

کوئی عورت ، اپنے خاوند سے خوش نہیں ہوتی ، خواہ وہ بیچارہ کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو ——— اُس میں کیڑے ڈالنا عورت کی سرشت میں داخل ہے ——— میں نے تمھاری کئی خطائیں اور غلطیاں معاف کی ہیں ۔"

"میں نے خدانخواستہ کون سی خطا کی ہے ؟"

پچھلے برس تم نے شلجم کی شب دیگ بڑے ٹھاٹ سے پکانے کا ارادہ کیا ——— شام کو چولھے پر ہنڈیا رکھ کر تم ایسی سوئیں کہ صبح

اُٹھ کر جب میں باورچی خانے میں گیا تو دیکھا کہ دیگچی میں سارے شلجم کوئلے بنے ہوئے ہیں — ان کو نکال کر میں نے انگیٹھی سلگا لی اور چائے تیار کی — تم سو رہی تھیں۔"

"میں یہ بکواس سننے کے لیے تیار نہیں۔"

"اس لیے کہ اس میں جھوٹ کا ایک ذرّہ بھی نہیں — میں اکثر سوچتا ہوں کہ عورت کو سچ اور حقیقت سے کیوں چڑ ہے — میں اگر کہہ دوں کہ تمھارا بایاں گال تمھارے دائیں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ موٹا ہے، تو شاید تم مجھے ساری عمر نہ بخشو — مگر یہ حقیقت ہے، جیسے شاید تم بھی اچھی طرح محسوس کرتی ہو — دیکھو یہ پیپر ویٹ وہیں رکھ دو — اُٹھا کے میرے سر پر دے مارا تو تھانہ تھنول ہو جائے گا۔"

"میں نے پیپر ویٹ اس لیے اُٹھایا تھا کہ یہ آپ کے چہرے کے عین مطابق ہے — اس کے اندر جو ہوا کے بلبلے سے ہیں، وہ آپ کی آنکھیں ہیں — اور یہ جو لال سی چیز ہے، وہ آپ کی ناک ہے، جو ہمیشہ سُرخ رہتی ہے — میں نے جب آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے آپ کی آنکھوں کے نیچے جو گائے کی آنکھیں ہیں، ایک کوکر درج اوندھے مُنہ بیٹھا ہے۔"

"تمھارا جی ہلکا ہو گیا؟"

"میرا جی کبھی ہلکا نہیں ہو گا — مجھے آپ جانے دیجیے — نہا دھو کر میں شاید یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں۔"

"جانے سے پہلے یہ تو بتا جاؤ کہ یہ جانا کس بنا پر ہے!"

"میں بتانا نہیں چاہتی — آپ تو اوّل درجے کے بے شرم ہیں۔"

"بھئی، تمھاری اس ساری گفتگو کا مطلب ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا — معلوم نہیں، تمھیں مجھ سے کیا شکایت ایک دم پیدا ہو گئی ہے۔"

"ذرا اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالیے۔"

"میرا کوٹ کہاں ہے؟"

"لاتی ہوں — لاتی ہوں۔"

"میرے کوٹ میں کیا ہو سکتا ہے — وسکی کی بوتل تھی — وہ تو میں نے باہر ہی ختم کر کے پھینک دی تھی — لیکن ہو سکتا ہے رہ گئی ہو۔"

"لیجیے، آپ کا کوٹ یہ رہا۔"

"اب میں کیا کروں؟"

"اس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالیے — اور اُس لڑکی کی تصویر نکالیے جس سے آپ آجکل عشق لڑا رہے ہیں۔"

"لاحول ولا — تم نے میرے اوسان خطا کر دیے تھے — یہ تصویر، میری جان، میری بہن کی ہے، جس کو تم نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ افریقہ میں ہے — تم نے یہ خط نہیں دیکھا — ساتھ ہی تو تھا — یہ لو۔"

"ہائے، کتنی خوبصورت لڑکی ہے — میرے بھائی جان کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی۔"

۱۸ مئی ۱۹۵۴ء ———

ملاوٹ

امرت سر میں علی محمد کی منہاری کی دکان تھی۔ چھوٹی سی، مگر اس میں ہر چیز موجود تھی اُس نے کچھ اس قرینے سے سامان رکھا تھا کہ ٹھنسا ٹھنسا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

امرت سر میں دوسرے دکاندار بلیک کرتے تھے، مگر علی محمد واجبی نرخ پر اپنا مال فروخت کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ لوگ دُور دُور سے اُس کے پاس آتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کرتے۔

وہ مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ زیادہ منافع لینا اس کے نزدیک گناہ تھا۔ اکیلی جان تھی، اس کے لیے جائز منافع ہی کافی تھا۔

سارا دن دکان پر بیٹھتا۔ گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ اُس کو بعض اوقات افسوس ہوتا جب وہ کسی گاہک کو سنلائٹ صابن کی ایک ٹکیہ نہ دے سکتا، یا کیلی فورنین پوپی کی بوتل۔ کیونکہ یہ چیزیں اُسے محدود تعداد میں ملتی تھیں۔

بلیک نہ کرنے کے باوجود وہ خوش حال تھا۔ اس نے دو ہزار روپے پس انداز کر رکھے تھے۔ جوان تھا —— ایک دن دکان پر بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا کہ اب شادی کر لینی چاہیے —— بُرے بُرے خیال دماغ میں آتے ہیں۔ شادی کر لوں کہ زندگی میں لطافت پیدا ہو جائے گی۔ بال بچے ہوں گے اُن کی پرورش کے لیے میں اور زیادہ کمانے کی کوشش کروں گا۔

اُس کے والدین عرصہ ہوا، اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اُس کی کوئی بہن تھی نہ بھائی۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ شروع شروع میں، جب کہ وہ دس برس کا تھا، اُس نے اخبار بیچنے شروع کیے۔ اس کے بعد خوانچہ لگایا، قلفیاں بیچیں۔ جب اُس کے پاس ایک ہزار روپیہ جمع ہو گیا تو اُس نے ایک چھوٹی سی دکان کرایے پر لے لی اور منہاری کا سامان خرید کر بیٹھ گیا۔

آدمی ایماندار تھا۔ اُس کی دکان تھوڑے ہی عرصے میں چل نکلی —— جہاں تک آمدن کا تعلق تھا، وہ اس سے بے فکر تھا، مگر وہ چاہتا تھا گھر بسائے۔ اس کی بیوی ہو، بچے ہوں، اور وہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرے۔ اس لیے کہ اُس کی زندگی مشین ایسی بن گئی تھی۔ صبح دکان کھولتا۔ گاہک آتے، اُنھیں سودا دیتا، شام کو دکان بند کرتا اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جو اُس نے شریف پورہ میں لے رکھی تھی، سو جاتا۔

گنجے کا ہوٹل تھا۔ اس میں وہ کھانا کھاتا۔ صرف ایک وقت۔ صبح ناشتہ جہل سنگھ کے کٹڑے میں شاہ جی حلوائی کی دکان میں کرتا۔ دکان کھولتا اور شام تک اپنی گدی پر بیٹھا رہتا۔

اس کے اندر شادی کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس معاملے میں اس کی مدد کون کرے۔ امرتسر میں اُس کا کوئی دوست یار بھی نہیں تھا جو اُس کے لیے کوشش کرتا۔

وہ بہت پریشان تھا۔ شریف پورہ کی کوٹھڑی میں رات کو سوتے وقت وہ کئی مرتبہ رویا کہ اس کے ماں باپ اتنی جلدی کیوں مر گئے۔ انھیں اور کچھ نہیں تو اس لیے ضرور زندہ رہنا چاہیے تھا کہ وہ اس کی شادی کا بندوبست کر جاتیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ شادی کیسے کرے۔ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس دوران میں اس کے پاس تین ہزار روپے جمع ہو گئے۔ اُس نے ایک چھوٹے سے گھر کو جو اچھا خاصا تھا کرایے پر لے لیا۔ مگر رہتا وہ شریف پورے ہی میں تھا۔

ایک دن اُس نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا جس میں لکھا تھا کہ شادی کے خواہش مند حضرات ہم سے رجوع کریں۔ بی۔ اے پاس لیڈی ڈاکٹر، ہر قسم کے رشتے موجود ہیں۔ خط و کتابت کیجیے یا خود آ کے ملیے۔

اتوار کو وہ دکان نہیں کھولتا تھا۔ اُس دن وہ اُس پتے پر گیا اور اُس کی ملاقات ایک داڑھی والے بزرگ سے ہوئی۔ علی محمد نے اپنا مدعا بیان کیا۔ داڑھی والے بزرگ نے میز کا دراز کھول کر بیس پچیس تصویریں نکالیں اور اس کو ایک ایک کر کے دکھائیں کہ وہ ان میں سے کوئی پسند کرلے۔

ایک لڑکی کی تصویر علی محمد کو پسند آ گئی۔ چھوٹی عمر کی اور خوبصورت تھی۔ اُس نے شادیاں کرانے والے ایجنٹ سے کہا "جناب ——— یہ لڑکی مجھے پسند ہے۔"

ایجنٹ مسکرایا "تم نے ایک ہیرا چُن لیا ہے۔"

علی محمد کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ لڑکی اُس کی آغوش میں ہے۔ اس نے کہنا شروع کر دیا "بس ——— جناب آپ بات پکی کر دیجیے" ایجنٹ سنجیدہ ہو گیا "دیکھو برخوردار ——— یہ لڑکی تم نے چنی ہے، علاوہ حسین ہونے کے بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے ——— لیکن تم سے زیادہ فیس نہیں مانگوں گا۔"

"آپ کی بڑی نوازش ہے ——— میں یتیم لڑکا ہوں ——— اگر آپ میرا یہ کام کر دیں تو آپ کو ساری عمر اپنا باپ سمجھوں گا۔"

ایجنٹ کے مونچھوں بھرے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی، "جیتے رہو ——— میں تم سے صرف تین سو روپے فیس لوں گا۔"

علی محمد نے بڑے متشکرانہ لہجے میں کہا "جناب کا بہت بہت شکریہ ——— مجھے منظور ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے جیب سے تین نوٹ سو سو روپے کے نکالے اور اُس بزرگوار کو دے دیے۔

تاریخ مقرر ہو گئی، نکاح ہوا، رخصتی بھی ہوئی۔ علی محمد نے وہ چھوٹا سا مکان کرایے پر لے رکھا تھا، اب سجا سجایا تھا۔ وہ اس میں بڑے چاؤ سے اپنی دُلہن لے کر آیا۔ پہلی رات کا تصور معلوم نہیں، اس کے دل و دماغ میں کس قسم کا تھا۔ مگر جب اُس نے دولہن کا گھونگھٹ کانپتے ہاتھوں سے اُٹھایا تو اُس کو غش سا آ گیا۔

نہایت بدشکل عورت تھی ——— صریحاً اس مرد بزرگ نے اُس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ علی محمد لڑکھڑاتا کمرے سے باہر نکل گیا اور شریف پورے جا کر اپنی کوٹھڑی میں دیر تک سوچتا رہا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

اُس نے اپنی دکان نہ کھولی ——— دو ہزار روپے وہ اپنی بیوی کا حق مہر ادا کر چکا تھا، تین سو روپے اُس ایجنٹ کو۔ اب اُس کے پاس صرف سات سو روپے تھے ——— وہ اس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اُس نے سوچا شہر ہی چھوڑ دے۔ ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ آخر

اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ صبح دس بجے اُس نے اپنی دکان ایک شخص کے پاس پانچ ہزار روپے میں یعنی اَونے پَونے داموں بیچ دی اور ٹکٹ کٹوا کر لاہور چلا گیا۔

لاہور جاتے ہوئے گاڑی میں کسی جیب کترے نے بڑی صفائی سے اُس کے تمام روپے غائب کر دیے۔ وہ بہت پریشان ہوا ——— لیکن اُس نے سوچا کہ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔

لاہور پہنچا تو اُس کی دوسری جیب میں جو کتری نہیں گئی تھی صرف دس روپے اور گیارہ آنے تھے۔ اِس سے اُس نے چند روز گذارہ کیا لیکن بعد میں فاقوں کی نوبت آگئی۔

اس دوران میں اُس نے کہیں نہ کہیں ملازم ہونے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام رہا ——— وہ اس قدر مایوس ہو گیا کہ اُس نے 'خودکشی کا ارادہ کر لیا، مگر اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ اس کے باوجود، ایک رات وہ ریل کی پٹری پر لیٹ گیا۔ ٹرین آ رہی تھی، مگر کانٹا بدلا اور وہ دوسری لائن پر چلی گئی کہ اُسے اُدھر ہی جانا تھا۔

اس نے سوچا کہ موت بھی دھوکا دے جاتی ہے، چنانچہ اُس نے خودکشی کا خیال چھوڑ دیا اور ہلدی اور مرچیں پیسنے والی ایک چکّی میں بیس روپے ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی۔

یہاں اُسے پہلے ہی دن معلوم ہو گیا کہ دُنیا دھوکا ہی دھوکا ہے۔ ہلدی میں پیلی مٹّی کی ملاوٹ کی جاتی تھی، اور مرچوں میں سُرخ اینٹوں کی۔ دو برس تک وہ اس چکّی میں کام کرتا رہا۔ اُس کا مالک ہر مہینے کم از کم سات سو روپے ماہوار کماتا تھا۔ اس دوران میں علی نے پانچ سو روپے پس انداز کر لیے تھے۔ ایک دن اُس نے سوچا، جب ساری دنیا میں فریب ہی فریب ہے، تو وہ بھی کیوں نہ فریب کرے۔

اس نے چنانچہ ایک علیحدہ چکّی قائم کر لی اور اُس میں مرچوں اور ہلدی میں ملاوٹ کا کام شروع کر دیا ——— اُس کی آمدن اب کافی معقول تھی مگر اُس کو شادی کا کئی بار خیال آیا، مگر جب اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس پہلی رات کا نقشہ آیا تو وہ کانپ کانپ گیا۔

علی محمد خوش تھا۔ اُس نے فریب کاری پوری طرح سیکھ لی تھی۔ اُس کو اب اِس کے تمام گُر معلوم ہو گئے تھے۔ ایک من لال مرچوں میں کتنی اینٹیں پیسنی چاہئیں، ہلدی میں کتنی زرد رنگ کی مٹّی ڈالنی چاہیے۔ اور پھر وہاں کا حساب، یہ اب اُس کو اچھی طرح معلوم تھا۔

لیکن ایک دن اُس کی چکّی پر پولیس کا چھاپہ پڑا۔ ہلدی اور مرچوں کے نمونے بوتلوں میں ڈال کر مہر بند کیے گئے ——— اور جب کیمیکل اگزامینر کی رپورٹ آئی کہ اُن میں ملاوٹ ہے تو اُسے گرفتار کر لیا گیا۔

اُس کا لاہور میں کون تھا جو اُس کی ضمانت دیتا ——— کئی دن حوالات میں بند رہا۔ آخر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور اُس کو تین سو روپیہ جرمانہ اور ایک مہینے کی قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی۔

جرمانہ تو اُس نے ادا کر دیا، لیکن ایک مہینے کی قیدِ بامشقت اُسے بھگتنا ہی پڑی۔ یہ ایک مہینہ اُس کی زندگی میں بہت کڑا اور کٹھن تھا ——— اس دوران میں وہ اکثر سوچتا تھا کہ اُس نے بے ایمانی کیوں کی، جب کہ اُس نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنا لیا تھا کہ وہ کبھی فریب کاری نہیں کرے گا۔

پھر وہ یہ سوچتا کہ اُسے اپنی زندگی ختم کر لینی چاہیے، اس لیے کہ وہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ اُس کا کردار مضبوط نہیں۔ بہتر یہی ہے

کو مر جائے، تاکہ اُس کا ذہنی اضطراب ختم ہو۔

جب وہ جیل سے باہر نکلا تو وہ مضبوط ارادہ کر چکا تھا کہ خودکشی کرے گا تاکہ سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو —— اس غرض کے لیے اُس نے سارا دن روز مزدوری کی اور دو تین روپے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کیے۔ اس کے بعد اُس نے سوچا، کون سا زہر ہوگا جو کارآمد ہو سکتا ہے

اُس نے صرف ایک ہی زہر کا نام سُنا تھا جو بڑا قاتل ہوتا ہے —— سنکھیا۔ مگر یہ سنکھیا کہاں سے ملتی ؟

اُس نے بہت کوشش کی۔ آخر اُسے ایک دُکان سے سنکھیا مل گئی۔ اُس نے عشاء کی نماز پڑھی۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی کہ وہ ہلدی اور مرچوں میں ملاوٹ کرتا رہا۔ پھر رات کو سنکھیا کھائی اور فٹ پاتھ پر سو گیا۔

اُس نے سُنا تھا سنکھیا کھانے والوں کے مُنہ سے جھاگ نکلتے ہیں، تشنج کے دَورے پڑتے ہیں۔ بڑا کرب ہوتا ہے، مگر اُسے کچھ بھی نہ ہُوا۔ ساری رات وہ اپنی موت کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی

صبح اُٹھ کر وہ اُس دکاندار کے پاس گیا، جس سے اُس نے سنکھیا خریدی تھی اور اُس سے پوچھا، بھائی صاحب، یہ آپ نے مجھے کیسی سنکھیا دی ہے کہ میں ابھی تک نہیں مرا۔"

دکاندار نے آہ بھر کے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا، کیا کہوں، میرے بھائی —— آج کل ہر چیز نقلی ہوتی ہے —— یا اُس میں ملاوٹ ہوتی ہے۔"

۱۹ مئی ۱۹۵۴ء

بس اسٹینڈ

وہ بس اسٹینڈ کے پاس کھڑی اے رُوٹ والی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے پاس کئی مرد کھڑے تھے۔ ان میں ایک اُسے بہت بُری طرح گھُور رہا تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ شخص برمے سے اُس کے دل و دماغ میں چھید بنا رہا ہے۔

اُس کی عُمر یہی بیس بائیس برس کی ہوگی۔ لیکن اس پختہ سالی کے باوجود، وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ جاڑوں کے دن تھے، پر اس کے باوجود اُس نے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرے۔ بس اسٹینڈ سے چلی جائے، کوئی تانگہ لے لے، یا واپس اپنی سہیلی کے پاس چلی جائے۔

اس کی یہ سہیلی نئی نئی بنی تھی۔ ایک پارٹی میں ان کی ملاقات ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی گرویدہ ہوگئیں —— یہ پہلی بار تھی کہ وہ اپنی اس نئی سہیلی کے بلاوے پر اُس کے گھر آئی تھی۔

نوکر بیمار تھا، مگر جب اس سہیلی نے اتنا اصرار کیا تھا، تو وہ اکیلی ہی اُس کے ہاں چلی گئی۔ دو گھنٹے میں گپ لڑاتی رہیں —— یہ وقت بڑے مزے میں کٹا۔ اُس کی سہیلی جس کا نام شاہدہ تھا، اس سے جاتے وقت کہا، ”سلمٰی اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔“

سلمٰی شرما سی گئی۔ ”کیسی باتیں کرتی ہو شاہدہ —— مجھے شادی نہیں کرانا ہے۔“

”تو کیا ساری عُمر کنواری رہو گی۔“

”کنواری رہنے میں کیا حرج ہے۔“

شاہدہ مسکرائی۔ ”میں بھی یہی کہا کرتی تھی —— لیکن جب شادی ہوگئی تو دُنیا کی تمام لذتیں مجھ پر آشکارا ہوگئیں —— یہی تو عُمر ہے جب آدمی پوری طرح شادی کی لطافتوں سے حظ اندوز ہو سکتا ہے —— تم میرا کہا مانو —— بس ایک دو مہینے کے اندر دلہن بن جاؤ —— تمہارے ہاتھوں میں مہندی میں خود لگاؤں گی۔“

”ہٹاؤ، اس چھیڑ خانی کو۔“

شاہدہ نے سلمٰی کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ”یہ چھیڑ خانی ہے؟ —— اگر یہ چھیڑ خوانی ہے تو ساری دُنیا چھیڑ خانی ہے —— مرد اور عورت کا رشتہ بھی فضول ہے —— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ایک ازلی اور ابدی رشتے سے مُنکر کیوں ہو؟ —— دیکھوں گی کہ تم مرد کے بغیر کیسے زندہ رہو گی —— خدا کی قسم پاگل ہو جاؤ گی —— پاگل!“

”اچھا ہے، جو پاگل ہو جاؤں —— کیا پاگلوں کے لیے اس دُنیا میں کوئی جگہ نہیں —— اتنے سارے پاگل ہیں، آخر وہ جوں توں جی ہی رہے ہیں۔“

"جوں توں جینے میں کیا مزا ہے، پیاری سلمیٰ — میں تم سے کہتی ہوں کہ جب سے میری شادی ہوئی ہے، میری کایا ہی پلٹ گئی ہے — میرا خاوند بہت پیار کرنے والا ہے"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"مجھ سے محبت کرتے ہیں — یہی ان کا کام ہے — ویسے کاروبار بہت کچھ ہے — میرا ہاتھ انھوں نے کبھی تنگ ہونے نہیں دیا۔"

سلمیٰ نے یوں محسوس کیا کہ اس کا دل تنگ ہو گیا ہے۔ "شاہدہ مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے شادی نہیں کرنا ہے — مجھے مردوں سے نفرت ہے۔"

"کیوں؟"

"بس ہے!"

"اب میں تم سے کیا کہوں — مردوں سے مجھے بھی نفرت تھی، لیکن جب میری شادی ہوئی اور مجھ سے میرے خاوند نے پیار محبت کیا تو میں نے پہلی مرتبہ جانا کہ مرد، عورت کے لیے کتنا لازمی ہے۔"

"ہوا کرے — مجھے اُس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

شاہدہ ہنسی، "سلمیٰ، ایک دن تم ضرور اس بات کی قائل ہو جاؤ گی، کہ مرد عورت کے لیے لازمی ہے — اس کے بغیر وہ ایسی گاڑی ہے جس کے پہیے نہ ہوں — میری شادی کو ایک برس ہوا ہے۔ اس ایک برس میں مجھے جتنی مسرتیں اور راحتیں میرے خاوند نے پہنچائی ہیں، میں بیان نہیں کر سکتی — خدا کی قسم وہ فرشتہ ہے — فرشتہ۔ مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔"

سلمیٰ نے یہ سُن کر یوں محسوس کیا کہ جیسے اُس کے سر پر فرشتوں کے پَر پھڑپھڑا رہے ہیں — اس نے سوچنا شروع کیا کہ شاید مرد، عورت کے لیے لازمی ہی ہو — لیکن فوراً بعد اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اُس کی عقل نے اُس کا ساتھ نہیں دیا — مرد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ — کیا عورت اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

جیسا کہ شاہدہ نے اُس کو بتایا تھا کہ اُس کا شوہر بہت پیار کرنے والا ہے۔ بہت نیک خصلت ہے — لیکن اس سے یہ ثابت تو نہیں ہوتا کہ وہ شاہدہ کے لیے لازمی تھا۔

سلمیٰ حسین تھی، اُبھرا اُبھرا جوبن، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، کشادہ پیشانی، گھٹنوں تک لمبے کالے بال، ستواں ناک اور اس کی پھننگ پر ایک تل۔

جب وہ اپنی سہیلی سے اجازت مانگ کر غسل خانے میں گئی تو اُس نے آئینے میں خود کو بڑے غور سے دیکھا اور اسے بڑی اُلجھن محسوس ہوئی، جب اُس نے سوچا کہ آخر یہ جسم، یہ حُسن، یہ اُبھار کس لیے ہیں — قدرت کی ساری کاریگری اکارت جا رہی ہے۔

"گندم پیدا ہوتا ہے، تو آدمی اس سے اپنا پیٹ پالتے ہیں — اس کی جوانی بھی تو کسی کھیت میں اُگی تھی — اگر اسے کوئی کھائے گا نہیں، تو گل سڑ نہیں جائے گی؟"

وہ بہت دیر تک غسل خانے میں آئینے کے سامنے سوچتی رہی۔ اُس کے ذہن میں اُس کی سہیلی کی تمام باتیں گونج رہی تھیں — مرد، عورت کے لیے بہت ضروری ہے —!

اس کا خاوند اس سے بہت پیار کرتا ہے۔

وہ فرشتہ ہے۔

سلمیٰ نے ایک لمحے کے لیے محسوس کیا کہ اُس کی شلوار اور اس کا دوپٹہ فرشتوں کے پَر بن گئے ہیں — وہ گھبرا گئی اور جلدی خارش ہو کر باہر نکل آئی۔ باہر برآمدے میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ سلمیٰ کو ایسا لگا کہ یہ بھی فرشتے ہیں جو بھیس بدل کر آئے ہیں۔

پھر جب اُس کی سہیلی اپنی کوٹھی سے ملحقہ باغ میں اُسے لے گئی اور وہاں اُس نے چند تتلیاں دیکھیں، تو وہ بھی اُسے فرشتے دکھائی دیے — لیکن اُس نے کئی مرتبہ سوچا کہ ایسے رنگین اور ایسے ننھے منے فرشتے کیسے ہو سکتے ہیں۔

اُسے بہت دیر تک فرشتے ہی فرشتے دکھائی دیتے رہے۔ جو اُس کے قریب آتے، اُس سے پیار کرتے، اُس کا منہ چومتے، اُس کے سینے پر ہاتھ پھیرتے، جس سے اُس کو بڑی راحت ملتی۔ لیکن ان فرشتوں کے ہاتھ بڑی تندی سے ایک طرف جھٹک دیتی اور اُن سے کہتی جاؤ ...... چلے جاؤ یہاں سے — تمہارا گھر تو آسمان پر ہے — یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

وہ فرشتے اُس سے کہتے "ہم فرشتے نہیں — حضرت آدم کی اولاد ہیں — وہی بزرگ جو جنت سے نکالے گئے تھے — ہم تمھیں پھر جنت میں پہنچا دینے کا وعدہ کرتے ہیں — چلو ہمارے ساتھ۔ وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اور شہد کی بھی۔"

سلمیٰ نے یوں محسوس کیا کہ اُس کے سینے میں سے دودھ کے ننھے منے قطرے نکلنے شروع ہو گئے ہیں اور اس کے ہونٹ مٹھاس میں لپٹے ہوئے ہیں۔

شاہدہ، اس سے بار بار اپنے خاوند کی تعریف کرتی۔ اصل میں اُس کا مدعا یہ تھا کہ اُس کے بھائی کے ساتھ سلمیٰ کا رشتہ قائم کر دے — مگر گھر پر یہ پہلی ملاقات تھی، اس لیے وہ کھُل کے بات نہ کر سکی۔ بہرحال اُس نے اشاروں کنایوں میں سلمیٰ پر یہ واضح کر دیا کہ اُس کا خاوند جو بہت رحم اور محبت کرنے والا آدمی ہے، اُس کا بھائی اس سے بھی کہیں زیادہ شریف النفس ہے۔

سلمیٰ نے یہ اشارہ نہ سمجھا، اس لیے کہ وہ بہت سادہ لوح تھی۔ اُس نے صرف اتنا کہہ دیا "آجکل کے زمانے میں شریف آدمیوں کا ملنا محال ہے — تم خوش قسمت ہو کہ تمھیں ایسا خاندان مل گیا جہاں ہر آدمی نیک اور شریف ہے۔"

"افسوس ہے کہ اس وقت میرے خاوند گھر میں موجود نہیں، ورنہ میں تم سے انھیں ضرور ملاتی۔"

"کبھی پھر سہی — کیا کام کرتے ہیں۔"

"ہائے، انھیں کیا کام کرنے کی ضرورت ہے — لاکھوں روپے کی جائداد ہے — مکانوں اور دکانوں سے کرایہ ہی ہر مہینے دو ہزار کے قریب وصول ہو جاتا ہے — اس کے علاوہ ماشاءاللہ زمینیں ہیں۔ وہاں کی آمدن الگ ہے — اناج کی کوئی قلت نہیں — منوں گندم گھر میں پڑا رہتا ہے — چاول بھی — ہر قسم کی ترکاری بھی ہر وقت میسّر ہو سکتی ہے — اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے — اُن کا چھوٹا بھائی جو آج کل لندن میں ہے، زراعت کے متعلق جانے کیا سیکھ رہا ہے — ایک مہینے تک واپس آ رہا ہے — وہ اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہے — تم اُسے دیکھو گی — تو ——"

سلمیٰ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "ہاں، ہاں — جب وہ آئیں گے تو اُن سے ملنے کا اتفاق ہو جائے گا۔"

شاہدہ نے کہا "بڑا شریف لڑکا ہے — بالکل اپنے بڑے بھائی کی مانند۔"

"جی ہاں —— ضرور ہوگا، آخر شریف خاندان سے تعلق ہے۔"

"وہ بس آنے ہی والا ہے —— تم مجھے اپنی ایک تصویر دے دو۔"

"کیا کرو گی۔"

"بس شہد لگا کے چاٹا کروں گی۔"

یہ کہہ کر شاہدہ نے سلمیٰ کا منہ چوم لیا اور پھر اپنے خاوند کی تعریفیں شروع کر دیں۔ سلمیٰ "تنگ آگئی۔ اُس نے تھوڑی دیر کے بعد کوئی بہانہ بنا کر رخصت چاہی اور بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی، جہاں اُسے "اے روٹ" کی بس پکڑنا تھی۔

وہ جب وہاں پہنچی تو ایک مرد نے اسے بہت بُری نگاہوں سے گھورنا شروع کر دیا —— وہ پریشان ہوگئی۔ جاڑوں کے دن تھے، مگر اس نے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

اسٹینڈ پر ایک بس آئی۔ اُس نے اُس کا نمبر دیکھا اور جب چند مسافر اُترے تو وہ فوراً اُس میں سوار ہوگئی —— وہ آدمی بھی اُس بس میں داخل ہوگیا۔ اُس کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ بس کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی جس کے باعث اُسے رُکنا پڑا۔ سب مسافروں سے کہہ دیا گیا کہ وہ اُتر جائیں، کیونکہ کافی دیر تک یہ بس نہیں چل سکے گی۔

سلمیٰ نیچے اُتری تو وہ آدمی جو اُسے بہت بُری طرح گھور رہا تھا، وہ بھی اُس کے ساتھ باہر نکلا —— سڑک پر ایک کار جا رہی تھی اُس نے اُس کے ڈرائیور کو آواز دی "امام دین"۔

امام دین نے موٹر ایک دم روک لی۔ اُس آدمی نے سلمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور اس سے کہا "چلیے —— یہ میری کار ہے —— جہاں بھی آپ جانا چاہتی ہیں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

سلمیٰ انکار نہ کر سکی۔ موٹر میں بیٹھ گئی۔ اُس کو ماڈل ٹاؤن جانا تھا، مگر وہ اُسے کہیں اور لے گیا —— اور —— !

× × × × ×

سلمیٰ نے محسوس کیا کہ مرد واقعی عورت کے لیے لازم ہوتا ہے —— اس نے اپنی زندگی کا بہترین دن گذارا —— گو اُس نے پہلے بہت حیل و حجت اور احتجاج کیا، مگر اُس آدمی نے اُسے رام کر ہی لیا !

تین چار گھنٹوں کے بعد جب سلمیٰ نے اُس شخص کا بٹوہ کھول کر یونہی دیکھا تو اُس میں ایک طرف شاہدہ کا فوٹو تھا —— اس نے ہکلاہٹ کے ساتھ پوچھا "یہ —— یہ —— عورت کون ہے ؟"

اُس شخص نے جواب دیا "میری بیوی۔"

سلمیٰ کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، "آپ کی بیوی ؟"

شاہدہ کا خاوند مسکرایا "کیا مردوں کی بیویاں نہیں ہوتیں ؟"

۲۰ مئی ۵۴ء

نعیمہ

تالیوں کے شور میں پرنسپل اپنی کرسی سے اُٹھتا ہے اور طلبہ اور طالبات سے مخاطب ہوتا ہے۔

یہ رسم جب سے میں اس کالج میں پرنسپل مقرر ہوا ہوں۔ ہر سال باقاعدہ ادا کی جاتی ہے۔ ہر سال اس موقع پر تالیوں کے شور کے ساتھ میں اپنی کرسی سے اُٹھتا ہوں اور قریب قریب وہی تقریر کرتا ہوں جو میں نے آج سے دس سال پہلے کی تھی۔ انھیں دیکھ کر میرے دل میں وہی جذبات پیدا ہوتے ہیں جو سلسلے کے آغاز میں ہوتے تھے —— آج جب میں نے غور کیا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پوسٹ ماسٹر ہوں اور کالج کی یہ بلڈنگ بہت بڑا ڈاک خانہ۔ تم سب خطوط ہو جو کچھ دیر اس بلڈنگ میں رہ کر اپنے اپنے ٹھکانے پہنچا دیے جاتے ہو —— تم میں سے کچھ بیرنگ ہو جاتے ہیں جس کے باعث تمھارے والدین کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ کچھ غلط ایڈریس کی وجہ سے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں۔

بہر حال یہ کھیل ہے بہت دلچسپ —— ہر حال امتحانوں کا ایک چکر شروع ہوتا ہے —— اس میں کچھ کامیاب ہوتے ہیں، کچھ ناکام —— حسرت اور غم کی ملی جلی لہریں میں ہر سال دیکھتا ہوں۔ اس وقت میرے سامنے ایسے کئی چہرے ہیں جو کامیابی کے باعث تمتمارہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں چند ایسے چہرے بھی دیکھ رہا ہوں جو ناکامی کے صدمے سے مرجھائے ہوئے ہیں —— خزاں اور بہار کا یہ ملا جلا موسم ہر سال آتا ہے اور گذر جاتا ہے —— وہ لڑکیاں اور لڑکے جو بی اے کا امتحان پاس کر چکے ہیں یا تو اُونچی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی بڑے کالج میں داخل ہو جائیں گے یا تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے دنیوی کاموں میں مصروف ہو جائیں گے۔ وہ جو اس امتحان کی دیوار نہیں پھاند سکے دوبارہ کوشش کریں گے —— جو یہاں سے جارہے ہیں، ان کو میں الوداع کہتا ہوں اور ان کی کامیاب زندگی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ جو نئے آئے ہیں، میں ان کو خوش آمدید کہتا ہوں اور ان کے فائدے کے لیے کہتا ہوں کہ اس تعلیم گاہ میں داخل ہوتے وقت اُن لوگوں کو ایک نظر ضرور دیکھ لیں جو باہر جارہے ہیں —— جو خواہش کے باوجود اپنی کمزوریوں کے باعث یا کسی اور وجہ سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان سے مجھے پوری پوری ہمدردی ہے خاص طور پر نعیمہ سے جو محنت کے باوجود اس سال بھی امتحان میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں —— خدا کرے آئندہ سال نعیمہ کامیاب ہو جائے۔"

تقریر ختم کرنے کے بعد جلسہ برخاست ہو جاتا ہے۔

کالج کی لڑکیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

ذکیہ۔ فرخندہ —— کیا نعیمہ ہال میں موجود تھی۔

فرخندہ۔ نہیں تو۔

ذکیہ۔ تو پھر وہ آئی ہی نہیں۔

فرخندہ ۔ بے چاری غم سے نڈھال ہوگی ۔

ذکیہ ۔ ایک بار فیل ہونے ہی سے آدمی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے ۔ وہ بے چاری تو دوسری مرتبہ فیل ہوئی ہے ۔

فرخندہ ۔ محنت تو بے حد کرتی تھی ۔

ذکیہ ۔ اصل میں یہ سب اُس کے مزاج کی خرابی کا نتیجہ ہے ـــــ کسی سے مدد لینے میں کیا مضائقہ ہے ۔ امتحان ہونے سے دو مہینے پہلے میں نے کئی بار اُس سے کہا ۔ نعیمہ تم میرے گھر آجایا کرو، میں تمھیں ساری اکنومکس ازبر کرا دوں گی ـــــ بس یہ سنتے ہی جیسے اُس کے مرچیں لگ گئیں ـــــ کہنے لگی، تم اپنے آپ کو بہت وہ سمجھنے لگی ہو ۔ تمھارے بغیر گویا اکنومکس کسی کو آہی نہیں سکتی ـــــ میں تو گدھی ہوں ۔ بیوقوف ہوں ۔ اب فرخندہ تم ہی بتاؤ کیا میں نے بھیڑ خانی کے لیے اُس کو اپنی مدد پیش کی تھی ۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ اکنومکس میں بالکل صفر ہے ـــــ بس دماغ ہی جو ایسا پایا ہے، کوئی اچھی بات بھی کرے تو اُسے بُری لگتی ہے ۔

فرخندہ ۔ میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا ۔ میں نے کہا، دیکھو نعیمہ، ایسا نہ ہو تمھارا سائیکلوجی کا پرچہ کمزور رہ جائے، کہو تو میں اپنے کیے ہوئے نوٹ دے دوں ۔ بس یہ سنتے ہی بگڑ گئی ۔ نوٹوں کی تو اُس کو ضرورت ہوتی ہے جو کتاب سے کچھ نہ سیکھ سکے ـــــ ویسے بازار میں عام بکتے ہیں ۔ کوئی اتنی بڑی رقم خرچ تو نہیں ہوتی ـــــ بھئی وہ دن اور آج کا دن ۔ میری زبان جلے جو میں نے پھر اُس سے ایسی بات کی ہو ۔

جمیلہ ۔ کسی کو کیا پڑی ہے جو ـــــ

ذکیہ ۔ بڑی وڑی کی بات نہیں جمیلہ ـــــ ہمارے دل پتھر کے تو نہیں ۔ اُس کو دیکھ کر کسے دُکھ نہیں ہوتا ـــــ اور ایسے لمحات میں مُنہ سے ہمدردی کا کوئی کلمہ نکل ہی جاتا ہے ۔

فرخندہ ۔ پر اُسے تو ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں ـــــ کاٹنے کو دوڑتی ہے اگر اُس سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہہ دیا جائے ۔

ذکیہ ۔ جانے اُس کے مزاج میں تلخی کہاں سے آگئی ۔

جمیلہ ۔ اے تلخی کو چھوڑو ۔ سب کو معلوم ہے کہ بے حد مفلس ہے ۔ لیکن اگر اُس سے کہو، نعیمہ تم ہر روز یہ سبز ساڑھی ہی کیوں پہنتی ہو تو بگڑ کر جواب دے گی ۔ میرے پاس ایک نہیں، ایسی کئی ساڑھیاں ہیں ۔ مجھے یہ رنگ پسند ہے ۔

فرخندہ ۔ سر میں تیل ایسا ڈالتی ہے کہ اُس کی بدبُو سے ناک پھٹ جاتی ہے ۔ اُس سے پوچھو تو یہی کہے گی ۔ یہ خاص تیل ہے ۔ اس سے بال لمبے ہوتے ہیں ۔

جمیلہ ۔ لمبے بالوں کی بچی ۔

ذکیہ ۔ نہیں جمیلہ ایسا نہ کہو ـــــ اس کا وحشیانہ پن دُور ہو جائے تو اُس جیسی اچھی سہیلی تمھیں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہ ملے ۔

لڑکیوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک لڑکا اُدھر سے گذرا ۔ کافی خوبصورت تھا، اُس نے سب سے پوچھا کیا باتیں ہو رہی ہیں ؟"

ذکیہ۔ ہم نعیمہ کا ذکر کر رہے تھے —— آپ دوستوں وغیرہ سے مل چکے۔

انور۔ دوستوں وغیرہ سے تو نہیں ملا۔ البتہ نعیمہ سے مل کے آ رہا ہوں۔

فرخندہ۔ کہاں ہے وہ ؟

انور۔ باہر باغ میں۔

جمیلہ۔ چلو ذکیہ چلیں۔

انور۔ نہیں۔ اس وقت آپ اُس کے پاس نہ جائیں۔ اس کی طبیعت بے حد مغموم ہے —— کسی نے اُس کو ذرا بھی چھیڑا تو آفت برپا ہو جائے گی۔

ذکیہ۔ یہ بڑی مصیبت ہے۔ اب اگر کوئی اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہے تو کیا کرے۔

انور۔ بس خاموش رہے۔

ذکیہ۔ کیسے۔

انور۔ بالکل میری طرح —— باغیچے کی طرف میرا گذر ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ بنچ پر بیٹھی ہے اور اس کی آنکھوں میں نامکمل آنسو ہیں —— میرے قدم رُک گئے —— اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔ اُس کے نامکمل آنسو تکمیل کی آرزو میں تڑپ گئے —— اور میں یہاں چلا آیا۔

ذکیہ۔ تو مجھے اُس کے پاس نہیں جانا چاہیے ؟

انور۔ وہ اس وقت غضب ناک حالت میں ہے۔ ناکامیوں کا اثر ایسے آدمیوں پر اسی قسم کا ہوتا ہے جنھیں ضرورت سے زیادہ خود پر اعتماد ہوتا ہے —— دراصل میں کوشش کے باوجود نعیمہ کو نہیں سمجھ سکا۔

ذکیہ۔ لیکن کلاس میں اُس سے آپ کا سلوک ویسا ہی تھا جیسے ایک باپ کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔

انور۔ لیکن اس کے باوجود وہ میری شفقت ٹھکراتی اور میری ہمدردی کو روندتی رہی —— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لڑکی کا انجام کیا ہوگا۔ تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر دُبلی ہو گئی ہے۔ اُس کی ہڈیاں باہر نکل آئی ہیں —— میں اکثر سوچتا ہوں ایک دن وہ اپنی زندگی کے پُراسرار محاذ پر لڑتی لڑتی تنہا ماری جائے گی۔

یہ کہہ کر انور ان لڑکیوں سے رخصت لے کر چلا گیا —— اس کے قدم غیر ارادی طور پر اُسے باغیچے کی طرف لے گئے۔ نعیمہ بنچ پر بیٹھی تھی۔ انور اُس کے پاس پہنچا۔

انور۔ نعیمہ —— کیا میں تمھارے پاس آ سکتا ہوں ؟

نعیمہ۔ تمھیں کس نے روکا ہے۔

انور۔ تم یہاں بہت دیر کی بیٹھی ہو۔

نعیمہ۔ کہتے ہو تو اُٹھ کر چلی جاتی ہوں۔

انور۔ یہ کیسی باتیں کرتی ہو —— میں پوچھتا ہوں تنہائی میں تم کیا بالکل نہیں گھبراتی ہو۔

نعیمہ۔ کیسی تنہائی — میں بالکل تنہا نہیں

انور۔ ہاں، اب تم تنہا نہیں ہو۔

نعیمہ۔ اس سے پہلے بھی تنہا نہیں تھی — تم چلے جاؤ گے تو پھر بھی تنہا نہیں ہوں گی — تم ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے رہے — تم کیا سب کے سب — مجھ میں کیا نقص ہے — کیا خرابی ہے جو دوسروں کے دل میں خواہ مخواہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے — ہمدردی — جاؤ اس ہمدردی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

انور۔ تم نے رونا شروع کر دیا۔

نعیمہ۔ جھوٹ بولتے ہو تم — میں تو ہنس رہی ہوں — تم سمجھتے ہو کہ میں تنہا ہوں بے یار و مددگار ہوں — اسی لیے تم مجھے اپنی ہمدردی کے سُوکھے ٹکڑے دیتے ہو — میں یہ بھیک نہیں لینا چاہتی — جاؤ — جاؤ — یہاں سے چلے جاؤ۔

انور محسوس کرتا ہے کہ اگر اُس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی تو شاید نعیمہ کا دماغی توازن نہ بگڑ جائے، اس لیے وہ خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ نعیمہ پھُوٹ پھُوٹ کے رونا شروع کر دیتی ہے، مگر کوئی آواز پیدا نہیں کرتی۔

انور اپنے گھر چلا گیا۔ وہ اکثر نعیمہ کے بارے میں سوچتا۔ اس نے کئی بار اُس کو خط لکھے، مگر اُس کو اس کا ایڈریس معلوم نہیں تھا، اس لیے پھاڑ دیے۔

ایک دن وہ باہر برآمدے میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا کہ نوکر ایک خط لایا — یہ نعیمہ کا تھا جس میں صرف ایک سطر تھی — "مسٹر انور — میں مرنے کے قریب ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہوں"

انور سخت گھبراہٹ میں اُٹھا۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کی موٹر لی۔ خط میں ایڈریس موجود تھا۔ وہاں پہنچا۔ اندھیرا اور غلیظ سا کمرہ تھا — انور کو کچھ نظر نہ آیا۔

انور۔ نعیمہ، نعیمہ — کہاں ہو تم۔

نعیمہ۔ آجاؤ — اِدھر میرے پاس آجاؤ۔

اب اندھیرے میں انور کو سجائی دینے لگا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک شکستہ سی چارپائی پر نعیمہ کی ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہے۔ انور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

نعیمہ۔ تمھیں حیرت ہو رہی ہے اِس غلیظ کمرے کو دیکھ کر — اسے نہ دیکھو۔ یہاں جس شے کو بھی دیکھو گے، تمھیں حیرت ہوگی — سب سے بڑی حیرت انگیز چیز تو میں ہوں — مجھے دیکھو اور جتنا حیرت زدہ ہونا چاہو ہو لو۔

انور۔ یہ کیا ہو گیا تمھیں ؟

نعیمہ۔ انور میری کشتی پاش پاش ہو چکی ہے — پیندے اور پتواروں کے بغیر اسے کئی برس منجدھار میں کھیتی رہی ہوں۔ اب میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی — انور — کیا وہاں اس کی مرمت ہو جائے گی ؟ — تم بولتے کیوں نہیں۔

انور۔ "میں سن رہا ہوں"

نیعمہ۔ میں اپنی اس ٹوٹی ہوئی کشتی کے لیے اِدھر اُدھر سے چیتھڑے اکٹھے کر کے بادبان بناتی رہی، لیکن طوفان نے بڑی بے رحمی سے ان کو چیر پھاڑ دیا ـــــ انور، "مجھے بتاؤ۔ یہ طوفان اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟"

انور۔ طوفان ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں نیعمہ۔

نیعمہ۔ تم ٹھیک کہتے ہو ـــ میں نے بہت تکلیفیں برداشت کیں، صرف اس لیے کہ بی اے کا امتحان پاس کر لوں اور خود کمانے کے قابل ہو جاؤں ـــ لیکن ان تمام قربانیوں کا انجام تمہارے سامنے ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں لیٹا ہے۔

نیعمہ کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ انور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

نیعمہ۔ میں مر رہی ہوں انور اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا ـــ اب ایسا کرنا کہ میری یہ دو سبز ساڑھیاں جو اسٹول پر پڑی ہیں اور یہ ساری کتابیں اُٹھا کر میرے ساتھ ہی دفن کر دینا ـــ ممکن ہے وہاں یہ چیزیں اور بھی زیادہ مہنگی ملیں ـــ میں نے بڑی مصیبتوں سے خریدی تھیں ـــ اور دیکھو کسی اور کو میری موت کی خبر نہ ہو ـــ مجھ سے اب زیادہ بولا نہیں جاتا ـــ میرا خیال ہے مجھے اور بھی کچھ کہنا تھا۔"

انور نے دیکھا کہ اُس پر حالتِ نزاع طاری ہے ـــ اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ نیعمہ نے جس کی آنکھیں مُندر رہی تھیں بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور انور کے آنسو اپنے میلے دوپٹے سے پونچھے اور کہا "مجھے یاد آ گیا ہے ـــ جو مجھے تم سے کہنا تھا۔"

انور۔ "کیا کہنا تھا۔"

نیعمہ مسکرائی "ایک بے وقوفی کی بات ہے ـــ اپنے ہونٹ میرے مُردہ ہونٹوں کے ساتھ لگا دو۔"

انور نے اس کی تعمیل کی ـــ نیعمہ کو جو مسرت حاصل ہوئی وہ اُس کی تاب نہ لا سکی اور اپنا آخری سانس اس بوسے کے سپرد کر دیا۔

(۲۱ مئی ۱۹۵۴ء)

بدتمیزی

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں۔"

"جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اُس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔"

"آپ تو بس ہر بات پر گلا گھونٹ دیتے ہیں ـــــ آپ نے یہ تو پوچھ لیا ہوتا کہ میں آپ سے کیا کہنا چاہتی ہوں۔"

"اس کے پُوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی ـــــ بس فقط لڑائی مول لینا چاہتی ہو۔"

"لڑائی میں مُول لینا چاہتی ہوں کہ آپ ـــــ سارے ہمسائے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔"

"خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک برس تک میں تم سے کوئی تلخ بات کی ہے نہ شیریں۔"

"شیریں بات کرنے کا آپ کو سلیقہ ہی کہاں آتا ہے ـــــ نوکر کو آواز دے کر بلوائیں گے تو سارے محلے کو پتہ چل جائے گا کہ آپ اُسے گولی سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔"

"میرے پاس بندوق ہی نہیں ـــــ ویسے میں خرید سکتا ہوں، مگر اُس کو چلائے گا کون؟ ـــــ میں تو پٹاخے سے ڈرتا ہوں۔"

"آپ بنیئے نہیں ـــــ میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں ـــــ یہ فراڈ میرے ساتھ نہیں چلے گا آپ کا۔"

"اب میں فراڈ بن گیا؟"

"آپ ہمیشہ سے فراڈ تھے ـــــ"

"یہ فیصلہ آپ نے کن وجوہ پر قائم کیا؟"

"آپ جب پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے، تو کیا آپ نے اباجی کی جیب سے دو روپے نہیں نکالے تھے؟"

"نکالے تھے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ بھنگی کی لڑکی کو ضرورت تھی۔"

"اس لیے کہ وہ بھنگی کی لڑکی تھی ـــــ بہت بیمار ـــــ والد صاحب سے اگر کہا جاتا تو وہ کبھی ایک پیسہ بھی اُسے نہ دیتے میں نے اسی لیے مناسب سمجھا کہ ان کے کوٹ سے دو روپے نکال کر اُس کو دے دوں ـــــ یہ کوئی گناہ نہیں۔"

"جی ہاں ـــــ بہت بڑا ثواب ہے ـــــ باپ کے کوٹ پر چھاپہ مار کر آپ تو اپنے خیال کے مطابق جنت میں اپنی سیٹ بُک کر چکے ہوں گے، لیکن میں آپ سے کہے دیتی ہوں کہ اس کی سزا آپ کو اتنی کڑی ملے گی کہ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔"

"طبیعت تو میری ہر روز صاف کی جاتی ہے —— اب اتنی صاف ہوگئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس طبیعت کو کیچڑ میں لت پت کردوں، تاکہ تمہارا مشغلہ جاری رہ سکے ۔"

"کیچڑ میں تو آپ ہر وقت لتھڑے رہتے ہیں ۔"

"یہ سراسر بہتان ہے ۔"

"بہتان کیا ہے —— حقیقت ہے —— آپ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہیں —— آپ کو کسی نفیس چیز سے دلچسپی ہی نہیں، ہائے کریں گے تو غلاظت کی —— نہاتے آپ نہیں ۔"

"غضب خدا کا —— میں تو دن میں تین مرتبہ نہاتا ہوں ۔"

وہ بھی کوئی نہانا ہے —— بدن پر دو ڈونگے پانی کے ڈالے —— تولیے سے اپنا نیم خشک جسم پونچھا اور غسل خانے سے باہر نکل آتے ——

"دو ڈونگے تو نہیں، کم از کم بیس ہوتے ہیں ۔"

"تو ان سے بھی کیا ہوتا ہے —— کیا آپ نے آج تک کبھی صابن استعمال کیا ہے ؟"

"میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ صابن جلد کے لیے بہت مضر ہے ۔"

"کیوں ؟"

"اس لیے کہ اس میں ایسے تیزابی مادے ہوتے ہیں جو جلد کا ستیاناس کر دیتے ہیں ۔"

"میری جلد کا تو آج تک ستیاناس نہیں ہوئی —— آپ کی جلد بہت ہی نازک ہوگی ۔"

"نازک ہونے کا سوال نہیں —— یہ ایک سائنٹیفک بحث ہے"

"میں سائنٹیفک وائنٹیفک کچھ نہیں جانتی —— بس میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے ۔"

"بھئی، تمہیں بتا تو چکا ہوں کہ یہ مضر ہے ۔"

"تو آپ نہاتے کس طرح ہیں ۔"

"نہانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے —— پانی ڈالتے گئے اور نہاتے گئے ۔"

"جسم پر آپ کوئی چیز نہیں ملتے —— میرا مطلب ہے، صابن نہیں تو کوئی اور چیز ۔"

"ملا کرتا ہوں ۔"

"کیا ؟"

"بیسن ۔"

"وہ کیا ہوتا ہے ؟"

"ارے بھئی، چنے کا آٹا ۔"

"آپ کی جرات نہ، نرالی ہے —— میں تو آپ ایسے سنکی سے خدا قسم تنگ آگئی ہوں —— میری سمجھ میں نہیں آتا، کہاں جاؤں۔"

"اپنے میکے چلی جاؤ —— وہاں تمھیں اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔"

"میں کیوں جاؤں وہاں —— میں یہیں رہوں گی۔"

"میں نے تم سے آج ہی کہا —— اس لیے کہ تم لاکھ مرتبہ مجھے یہ دھمکی دیتی رہی ہو کہ میں چلی جاؤں گی اپنے میکے۔"

"مجھے جب جانا ہوگا چلی جاؤں گی۔"

"آج تمھاری طبیعت نہیں چاہتی؟"

"آپ مجھے چڑانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟"

"میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی —— اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں، تو یقین مانو، تم ابھی تانگہ لے کر اسٹیشن پہنچ جاؤ گی۔"

"کوشش کر کے دیکھ لیجیے —— میں یہاں سے ایک انچ نہیں ہٹوں گی —— یہ میرا گھر ہے۔"

"آپ کا ہے —— آپ کے باپ دادا کا ہے —— لیکن یہ تو بتایئے ——"

"میرے باپ دادا کا نام مت لیجیے —— اُن بیچاروں کا کیا قصور تھا؟"

"قصور تو سارا میرا ہے —— لیکن بیگم، تم کبھی کبھی اتنا تو غور کر لیا کرو کہ میں نے آخر تمھیں کون سا جانی یا مالی نقصان پہنچایا ہے کہ تم لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔"

"لٹھ تو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہا ہے —— میں تو اُسے اُٹھا بھی نہیں سکتی۔"

"تم بڑے سے بڑا گرز اُٹھا سکتی ہو —— تم ایسی عورتوں میں بلا کی قوت ہوتی ہے —— تم عقاب ہو —— تمھارے سامنے تو میری حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے۔"

"باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے —— آپ چڑیا ہیں —— سبحان اللہ۔ جب کڑکتے اور گرجتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔"

"اس شیر کو پہلے ایک نظر دیکھ لو۔"

"کیا دیکھوں؟ —— پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں۔"

"یہ خاکسار شیر ہے کیا؟"

"شیر ہے، مگر خاک میں لپٹا ہوا۔"

"اس تعریف کا شکریہ —— اب آپ یہ بتایئے کہ آپ کہنا کیا چاہتی تھیں۔"

"آپ اتنے لائق فائق بنے پھرتے ہیں —— سمجھیے کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی۔"

"تمھاری باتیں نہ صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے —— میں کیا سمجھوں گا۔"

"خدا کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں۔"

"خدا کو اگر بیچ میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بڑے آئے ہیں آپ خدا کو ماننے والے۔"

"خدا کو تو میں ہمیشہ سے مانتا آیا ہوں ——— وہ طاقت جو دُنیا پر کنٹرول کرتی ہے۔"

"کنٹرول تو آپ مجھ پر کرتے آئے ہیں۔"

"کس قسم کا؟"

"ہر قسم کا ——— میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی چیز نہیں کر سکی ——— کپڑے لیتا ہوں، تو اُس میں آپ کی مرضی کو دخل ہوتا ہے ——— کھانے کے بارے میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے ——— آج یہ پکے، کل وہ پکے ———"

"اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض کیوں نہیں ——— میرا جی اگر کبھی چاہتا ہے کہ اوجھڑی کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔"

"اوجھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے۔"

"آپ کیا جانیں، کتنی مزیدار ہوتی ہے ——— چونے میں ڈال کر اُسے صاف کر لیا جاتا ہے، اس کے بعد اچھی طرح گھی میں تلا جاتا ہے ——— اللہ قسم مزا آجاتا ہے۔"

"لاحول ولا ——— میں ایسی غلط چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"اور ٹینڈے؟"

"بکواس ہیں نرے۔ سبزی کی سب سے بڑی توہین ہیں۔ اُن میں کوئی رس ہوتا ہے نہ لذت ——— بس فقط ٹینڈے ہوتے ہیں ——— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پیدا کس غرض کے لیے کیے گئے تھے ——— نہایت واہیات ہوتے ہیں ——— میں تو اکثر یہ دُعا مانگتا ہوں کہ اُن کا وجود سرے ہی سے غائب ہو جائے ——— بڑے بے جان ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کدو بدرجہا بہتر ہے حالانکہ وہ بھی مجھے سخت ناپسند ہے۔"

"آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟ ——— ہر اچھی چیز میں آپ کیڑے ڈالتے ہیں ——— بھنڈی آپ کو پسند نہیں کہ اُس میں لیس ہوتی ہے ——— گوبھی آپ کو نہیں بھاتی کہ اُس میں یہ نقص نکالا جاتا ہے کہ بدبو ہوتی ہے ——— ٹماٹر آپ کو اچھے نہیں لگتے، اس لیے کہ اُس کے چھلکے ہضم نہیں ہوتے۔"

"تم ان باتوں کو چھوڑو ——— ٹینڈے، گوبھی اور ٹماٹر جائیں جہنم میں ——— تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کہنا کیا چاہتی تھیں۔"

"کچھ بھی نہیں ——— بس، ایسے ہی آگئی ——— میں نے دیکھا کہ آپ کوئی کام نہیں کر رہے، تو آپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔"

"بڑی نوازش ہے آپ کی ——— لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کہنا ہوگا آپ کو۔"

"آپ سے اگر کچھ کہہ بھی دیا تو اُس کا حاصل کیا ہوگا۔"

"جو آگے آپ کو حاصل ہوتا رہا ہے، اُسی حساب سے آج بھی حاصل ہو جائے گا ——— آپ یہاں سے کچھ حاصل کیے بغیر ٹلیں گی کیسے؟"

"میں آپ سے ایک خاص بات کرنے آئی تھی۔"

"کیا؟"

"میں ——— میں یہ کہنے آئی تھی، کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟"

"آپ کیا سمجھانے آئی تھیں مجھے۔"

"آپ کو تو خدا سمجھائے گا ——— میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پتلون پہن کر اُس کے بٹن بالکنی میں بند نہ کیا کریں۔ ہمسایوں کو سخت اعتراض ہے۔ یہ بہت بڑی بدتمیزی ہے۔"

۲۲۔ مئی سنہ ۵۴ء

ﻗــادر اقصائی

عیدن بائی آگرے والی چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی ماں زہرہ جان نے اُس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی۔ بڑی دُور دُور سے رئیس اُس کا مجرا سننے کے لیے آتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں کھیلتا تھا، اُسے محبت ہوگئی۔ اُس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا اور اُس کی ماہوار تنخواہ مقرر کردی۔ کوئی تین سو روپے کے قریب۔ ہفتے میں تین مرتبہ اُس کے پاس آتا اور رات ٹھہرا صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور آگرے کے رہنے والے ہیں۔ ان کا یہ بیان ہے کہ اُس کا چاہنے والا ایک بڑھئی تھا۔ مگر وہ اُسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ وہ بے چارہ ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا مگر وہ اُسے دھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اس بڑھئی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقعہ مل ہی گیا۔ پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اس لیے کہ اُس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رُعب طاری تھا، لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے بعد جرأت سے کام لیا اور اُس سے کہا۔

"زہرہ جان —— میں غریب آدمی ہوں، مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے تمھارے پاس آتے ہیں اور تمھاری ہر ادا پر سینکڑوں روپے نچھاور کرتے ہیں —— لیکن تمھیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے —— میں تم سے محبت کرتا ہوں —— معلوم نہیں کیوں۔"

زہرہ جان ہنسی۔ اس ہنسی سے بڑھئی کا دل مجروح ہوگیا۔ "تم ہنستی ہو —— میری محبت کا مذاق اُڑاتی ہو، اس لیے کہ یہ کنگلے کی محبت ہے جو لکڑیاں چیر کر اپنی روزی کماتا ہے —— یاد رکھو، یہ تمھارے لاکھوں میں کھیلنے والے تمھیں وہ محبت اور پیار نہیں دے سکتے، جو میرے دل میں تمھارے لیے موجود ہے۔"

زہرہ جان اُکتا گئی۔ اُس نے اپنے ایک میراثی کو بلایا اور اُس سے کہا کہ بڑھئی کو باہر نکال دیا۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔

ایک برس کے بعد عیدن پیدا ہوئی —— اس کا باپ عبداللہ تھا یا کوئی اور، اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیٹھ کے نطفے سے ہے —— کسی کے نطفے سے بھی ہو، مگر بلا کی خوبصورت تھی۔

اُدھر زہرہ جان کی عمر ڈھلتی گئی، اِدھر عیدن جوان ہوتی گئی۔ اُس کی ماں نے اُس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی۔ لڑکی ذہین تھی، کئی استادوں سے اُس نے سبق لیے اور اُن سے داد وصول کی۔

زہرہ جان کی عمر اب چالیس برس کے قریب ہوگی۔ وہ اب اُس منزل سے گذر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے۔ وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدن کے سہارے جی رہی تھی۔ ابھی تک اُس نے اُس سے مجرا نہیں کرایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے۔

عیدن بائی کے حُسن کے چرچے عام تھے۔ دُور دُور تک عیاش رئیسوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے۔ وہ اپنے ایجنٹوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدن کی نتھنی اتارنے کے لیے اپنی اپنی پیش کش بھیجتے، مگر اُس کو اتنی جلدی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مِسّی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے —— اس کی لڑکی لاکھوں میں ایک تھی۔ سارے شہر میں اُس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔

اُس کے حُسن کی نمائش کرنے کے لیے وہ ہر جمعرات کی شام کو اُس کے ساتھ پیدل باہر سیر کو جاتی۔ عشق پیشہ مرد اس کو دیکھتے تو دل تھام تھام لیتے۔

پھنسی پھنسی چولی میں گدرایا ہوا جوبن، سڈول بانہیں، مخروطی انگلیاں جن کے ناخنوں پر جیتا جیتا لہو، الیسا رنگ، ٹھگنا سا قد، گھنگریالے بال —— قدم قدم پر قیامت ڈھاتی تھی۔

آخر ایک روز زہرہ جان کی اُمید بر آئی۔ ایک نواب عیدن پر ایسا لٹّو ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرجان نے اپنی بیٹی کی مِسّی کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا۔ کئی دیگیں پلاؤ اور متنجن کی چڑھائی گئیں۔

شام کو نواب صاحب اپنی بگھی میں آئے۔ زہرہ جان نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی —— نواب صاحب بہت خوش ہوئے۔ عیدن دلھن بنی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اُس کا مجرا شروع ہوا —— چلبلے ٹپّے والا شباب تھا جو محوِ نغمہ سرائی تھا۔

عیدن اُس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ہر جنبش، ہر ادا، اُس کے گانے کی ہر سُر زہد شکن تھی۔ نواب صاحب گاؤ تکیے کا سہارا لیے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنّت کی سیر کریں گے، جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے ہنگم سا آدمی اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بہت گھبرائی۔ یہ وہی بڑھئی تھا —— اس کا عاشقِ زار۔ بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب کو جو بہت نفاست پسند تھے ابکائیاں آنے لگیں۔ انھوں نے زہرہ جان سے کہا "یہ کون بدتمیز ہے؟"

بڑھئی مسکرایا "حضور، میں ان کا عاشق ہوں۔"

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ مکدّر ہوگئی۔ "زہرہ جان، نکلواس حیوان کو باہر۔"

بڑھئی نے اپنے تھیلے سے آری نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کو پکڑ کر اُس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی۔ نواب صاحب اور میراثی وہاں سے بھاگ گئے۔ عیدن بے ہوش ہوگئی۔

بڑھئی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور لہو بھری آری اپنے تھیلے میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور اقبالِ جرم کر لیا

ـــــ کہا جاتا ہے کہ اُسے عمر قید کی سزا ہو گئی تھی۔

عیدن کو اپنی ماں کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ ہُوا کہ وہ دو اڑھائی مہینے تک بیمار رہی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی، مگر آہستہ آہستہ اُس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ چل پھر سکے۔ ہسپتال میں اُس کی تیمارداری صرف اُس کے استاد اور میراثی ہی کرتے تھے۔ وہ نواب اور رئیس جو اُس پر اپنی جان چھڑکتے تھے، بھُولے سے بھی اُس کو پُوچھنے کے لیے نہ آئے ـــــ وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی۔

وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی چلی آئی ـــــ مگر اس کی طبیعت اتنی اُداس تھی کہ اُس کا جی قطعاً مجرا کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے پاس بیس پچیس ہزار روپے کے زیورات تھے، جن میں آدھے اُس کی مقتول ماں کے تھے۔ وہ انھیں بیچتی رہی اور گذارہ کرتی رہی۔

عورت کو زیور بڑے عزیز ہوتے ہیں۔ اس کو بڑا دُکھ ہوتا تھا جب وہ کوئی چُوڑی یا نکلس اونے پونے داموں بیچتی تھی ـــــ لیکن آخر کیا کرتی اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ راگ رنگ کی محفلیں قائم کرے۔

ان دنوں پاکستان کے قیام کا مطالبہ بڑے زوروں پر تھا۔ آخر ایک دن یہ اعلان ہُوا، جو عیدن نے اپنے پانچ والو ریڈیو سیٹ پر سنا کہ ہندوستان کے دو حصّے ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد فسادات شروع ہو گئے۔ ہندو مسلمانوں کو مارتے، مسلمان ہندوؤں کو ـــــ عجب عالم تھا۔ خُون پانی سے بھی ارزاں ہو رہا تھا۔

مسلمان دھڑا دھڑ پاکستان جا رہے تھے کہ اُن کی جانیں محفوظ رہیں۔ عیدن نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ دہلی میں نہیں رہے گی، لاہور چلی آئے گی۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کئی زیورات بیچ کر وہ لاہور پہنچ گئی۔ لیکن راستے میں اُس کی تمام بیش قیمت پشوازیں اور باقی ماندہ زیور اس کے اپنے بھائی مسلمانوں ہی نے غائب کر دیے۔

جب وہ لاہور پہنچی تو وہ لُٹی پٹی تھی ـــــ لیکن اُس کا حسن ویسے کا ویسا تھا۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں للچائی ہوئی آنکھوں نے اُس کی طرف دیکھا۔ مگر اس نے بے اعتنائی برتی۔

وہ جب لاہور پہنچی تو اُس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہو گی؟ اُس کے پاس تو چنے کھانے کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے لیکن لڑکی ذہین تھی سیدھی اُس جگہ پہنچی، جہاں اُن کی ہم پیشہ رہتی تھیں۔ یہاں اُس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔

ان دنوں لاہور میں روپیہ عام تھا۔ ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا۔ ہیرا منڈی کے وارے نیارے تھے۔

عیدن کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اُس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اُس کو سینکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اُس کی آواز جواب دے چکی ہوتی، وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی اور اوندھے منہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔

یہ سلسلہ قریب قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا ـــــ عیدن اس کے بعد ایک علیحدہ کوٹھا کرایہ پر لے کر وہاں اُٹھ آئی۔ چونکہ جہاں وہ مقیم تھی، اُس نائکہ کو اُسے اپنی آدھی آمدن دینا پڑتی تھی۔

جب اُس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پر مجرا کرنا شروع کیا تو اُس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اُسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی۔ اس نے کئی زیور بنا لیے۔ کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کرا لیے۔

اسی دوران میں اُس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ کا بادشاہ تھا، اُس نے کم از کم دو کروڑ روپے کمائے تھے۔ خوبصورت تھا۔ اُس کے پاس تین کاریں تھیں۔ پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدن کے حُسن سے اس قدر متاثر ہُوا کہ اُس نے اپنی کھلی سفید پیکارڈ اس کے حوالے کر دی۔

اس کے علاوہ وہ ہر شام آتا اور کم از کم دو ڈھائی سو روپے اُس کی نذر ضرور کرتا۔ ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر میلی تھی۔ اُس نے عیدن سے پُوچھا "کیا بات ہے، آج تمھاری چاندنی اتنی گندی ہے؟"

عیدن نے ایک ادا کے ساتھ جواب دیا "آجکل لٹھا کہاں ملتا ہے؟"

دوسرے دن اُس بلیک مارکیٹ بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوا دیے۔ اس کے تیسرے روز بعد اُس نے ڈھائی ہزار روپے دیے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خرید لے۔

عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا جب وہ آگرے اور دلّی میں تھی تو اُسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا، مگر لاہور میں اُسے قادرا قصائی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا ——— بغیر ریشے کے۔ ہر بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریشم کی بنی ہو۔ دُکان پر اپنا شاگرد بٹھا کر قادرا صبح سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہوتی، عیدن کے حوالے کر دیتا۔ اُس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا، جو عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتیں۔

بلیک مارکیٹ کا بادشاہ، جس کا نام ظفر شاہ تھا، عیدن کے عشق میں بہت بُری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جائداد، منقولہ اور غیر منقولہ اُس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے، اگر وہ اس سے شادی کر لے ——— مگر عیدن نہ مانی۔ ظفر شاہ بہت مایوس ہُوا۔

اُس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدن اُس کی ہو جائے، مگر ہر بار اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ مُجرے سے فارغ ہو کر رات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کر کے ——— یعنی شراب پی کر پیدل ہی چلا آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سائیں ——— کے تکیے کے باہر عیدن ایک نہایت بدنما آدمی کے پاؤں پکڑے التجائیں کر رہی ہے کہ خدا کے لیے مجھ پر نظرِ کرم کرو۔ میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں ——— تم اتنے ظالم کیوں ہو ——— اور وہ شخص جسے غور سے دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ قادرا قصائی ہے، اُسے دھتکار رہا ہے "جا ——— ہم نے آج تک کسی کنجری کو منہ نہیں لگایا ——— مجھے تنگ نہ کیا کر"

قادرا اُسے ٹھوکریں مارتا رہا اور عیدن اسی میں لذّت محسوس کرتی رہی۔

۲۴ مئی ۵۴ء

خودکشی

زاہد صرف نام ہی کا زاہد نہیں تھا۔ اُس کے زہد و تقوے کے سب قائل تھے۔ اُس نے بیس پچیس برس کی عمر میں شادی کی۔ اُس زمانے میں اُس کے پاس دس ہزار روپے کے قریب تھے، شادی پر پانچ ہزار صرف ہوگئے، اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔

زاہد بہت خوش تھا۔ اُس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی۔ اُس کو اُس سے بے پناہ محبت ہوگئی۔ وہ بھی اُس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد اُن کے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جو ماں پر تھی، یعنی ویسی ہی حسین۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ان پر لمبی پلکیں، مہین ابرو۔ چھوٹا سا لب دہن ——— اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اُس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کیے ہوئے نام پسند نہیں آتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ خود زاہد نام بتائے۔

زاہد دیر تک سوچتا رہا، لیکن اُس کے دماغ میں ایسا کوئی موزوں و مناسب نام نہ آیا جو وہ اپنی بیٹی کے لیے منتخب کرتا۔

اُس نے اپنی بیوی سے کہا، "اتنی جلدی کیا ہے ——— نام رکھ لیا جائے گا۔"

بیوی مُصر تھی کہ نام ضرور رکھا جائے۔ "میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی۔"

وہ کہتا، "اس میں کیا حرج ہے ——— جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس گڑیا کی گردن کے ساتھ ٹانک دیں گے۔"

"پر میں اسے کیا کہہ کر پکاروں؟ ——— مجھے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔"

"فی الحال بیٹا کہہ دینا کافی ہے۔"

"یہ کافی نہیں ہے ——— میری بٹیا کا کوئی نام ہونا چاہیے۔"

"تم خود ہی کوئی منتخب کر لو۔"

"یہ کام آپ کا ہے، میرا نہیں۔"

"تو تھوڑے دن انتظار کرو ——— میں اُردو کی لُغت لاتا ہوں ——— اُس کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک غور سے دیکھوں گا ——— یقیناً کوئی اچھا نام مل جائے گا۔"

"میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سُنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچیوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔"

"نہیں میری جان، نکالتے ہیں ——— میرا ایک دوست ہے۔ اُس کے جب بچی پیدا ہوئی تو اُس نے فوراً اُردو کی لُغت نکالی اور اُس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چُن لیا۔"

"کیا نام تھا"

"نکہت"

"اس کے معنی کیا ہیں"

"خوشبو"

"بڑا اچھا نام ہے ——— نکہت ——— یعنی خوشبو"

"تو یہی نام رکھ لو"

زاہد کی بیوی نے اپنی بچی کو جو سو رہی تھی ایک نظر دیکھا اور کہا "نہیں ——— میں اپنی بٹیا کے لیے پرانا نام نہیں چاہتی ——— کوئی نیا نام تلاش کیجیے ——— جائیے ڈکشنری لے آئیے"

زاہد مسکرایا "لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں"

زاہد کی بیوی بھی مسکرائی "میرا پرس الماری میں پڑا ہے، اُس میں جتنے روپے آپ کو چاہئیں، نکال لیجیے"

زاہد نے "بہت بہتر" کہا اور الماری کھول کر اُس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا اور دس روپے کا ایک نوٹ لے کر بازار روانہ ہو گیا کہ لُغت خرید لے۔

وہ کئی کُتب فروش دکانوں میں گیا ——— کئی لُغت دیکھے۔ بعض تو بہت قیمتی تھے۔ جن کی تین تین جلدیں تھیں۔ کچھ بڑے ناقص ——— آخر اُس نے ایک لغت جس کی قیمت واجبی تھی خرید لیا اور راستے میں اُس کی ورق گردانی کرتا رہا تاکہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔

جب وہ انارکلی میں سے گذر رہا تھا تو اس کو ایک دوست مل گیا۔ وہ اُسے اپنی بوٹوں کی دکان میں لے گیا ——— وہاں اُسے قریب قریب ایک گھنٹے تک بیٹھنا پڑا، کیونکہ بہت دیر کے بعد اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب اُس کے دوست کو دورانِ گفتگو میں پتہ چلا کہ زاہد کے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ تجوری میں سے گیارہ روپے نکالے اور زاہد سے کہا "یہ اُس بچی کو دے دینا، کہنا تمہارے چچا نے دیئے ہیں ——— نام کیا رکھا ہے اُس کا؟"

زاہد نے لغت کی طرف دیکھا جس کی جلد لال رنگ کی تھی "ابھی تک کوئی اچھا نام نہیں سوجھا"

اُس کے دوست نے جُوتے کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا "یار نام رکھنے میں دقت ہی کیا پیش آتی ہے۔ شمینہ ہے، شاہینہ ہے۔ نسرین ہے۔ الماس ہے"

زاہد نے جواب دیا "یہ سب بکواس ہے"

اُس کے دوست نے جُوتا ڈبے میں رکھا "تو اب جو بکواس تم کرو گے، وہ بھی ہم سُن لیں گے" اس کے بعد اُٹھ کر اُس نے زاہد کو گلے سے لگایا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے ——— نام ہو نہ ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے"

زاہد جب دُکان سے باہر نکلا تو اُس نے سوچنا شروع کیا کہ واقعی نام میں کیا رکھا ہے۔ خیراتی کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ بڑی خیرات کرتا ہے۔ عیدن کیا بلا ہے ——— اور گھسیٹا ——— کیا اُسے لوگ گھسیٹنا شروع کر دیں ——— اور یہ رُلدو ——— شبراتی؟

اُس کے جی میں آئی کہ لُغت کسی گندی موری میں پھینک دے اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے "میری جان، نام میں کچھ نہیں پڑا۔ بس یہ دعا کرو کہ بچّی کی عمر دراز ہو——"

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا —— لیکن معلوم نہیں کیوں اُس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پراگندہ خیالی کا باعث ہے —— تھوڑی دُور چلنے کے بعد اُس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچے اور اپنی بچّی کی پیشانی پر چومے۔

بغل میں لغت تھی —— اِس کو اُس کو کئی بار دیکھنے کی کوشش کی، مگر اس کا دل و دماغ متوازن نہیں تھا —— اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا —— مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی بہت بُری طرح ہانپنے لگا اور ایک دُکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا —— اتنے میں ایک خالی تانگہ آیا۔ اُس نے اُس کو ٹھہرایا اور اس میں بیٹھ کر تانگے والے سے کہا "چلو مزنگ لے چلو —— لیکن جلدی پہنچاؤ مجھے وہاں ایک بڑا ضروری کام ہے۔"

مگر گھوڑا بہت ہی سُست رفتار تھا۔ یا شاید زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کو عجلت تھی۔ وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ تانگے والے سے سخت سُست الفاظ کہے، جو وہ برداشت کرتا گیا۔ آخر جب اُس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اُس نے زاہد کو تانگے سے اُتار دیا —— ہائی کورٹ کے قریب۔ اُس نے زاہد سے کرایہ بھی طلب نہ کیا۔

زاہد اور زیادہ پریشان ہوا۔ وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر چوک میں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پشاوری تانگہ آیا۔ اس میں بیٹھ کر وہ مزنگ پہنچا۔ کرایہ ادا کیا اور گھر میں داخل ہوا۔

کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں۔ وہ دروازے کے پاس رُک گیا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی "بمشکل ہی سے بچے گی بیچاری —— تشنّج کے یہ دَورے بڑے خطرناک ہیں۔"

زاہد اُن عورتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے دیوانہ وار اندر بھاگا اور اُس کے کمرے میں پہنچا جہاں وہ اور اُس کی بیوی رہتے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اُس نے اپنی بیوی کی فلک شگاف چیخ سُنی۔

اُس کی بٹیا دم توڑ چکی تھی۔ اور اُس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ زاہد نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پردے کو بھول کر بے اختیار اندر چلی آئیں اور زاہد کو اُس کمرے سے باہر نکال دیا۔

ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس موٹر تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر لے آیا۔ اُس نے زاہد کی بیوی کو ایک دوا انجکشن لگائے جن سے وہ ہوش میں آگئی۔

زاہد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اُس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں۔ وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا، بغل میں لُغت دبائے خلا میں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ اپنی بچّی کے لیے کوئی نام تلاش کرنے میں محو ہے۔

بچّی کو دفنانے کا وقت آیا تو زاہد باہوش ہو گیا۔ اُس نے کوئی آنسو نہ بہایا۔ کفن میں پڑی بچّی کو اُٹھایا اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ہمراہ قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پہلے ہی سے تیار کرا لی گئی تھی۔ اس میں اُس نے خود اُسے لٹایا اور اُس کے ساتھ

لغت رکھ دی۔

لوگوں نے سمجھا، قرآن مجید ہے۔ انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ مُردوں کے ساتھ قرآن کون دفن کرتا ہے۔ یہ تو سراسر کفر ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا۔ بس آپس میں کھُسر پھُسر کرتے رہے۔

بچی کو دفنا کر جب گھر آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی بیوی کو بہت تیز بخار ہے۔ سرسام کی کیفیت ہے۔

فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اُس نے اچھی طرح دیکھا اور زاہد سے کہا "حالت بہت نازک ہے ——— میں علاج تجویز کیے دیتا ہوں، لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس پر بجلی آن گری ہے، لیکن اُس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا "تکلیف کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "بہت سی تکلیفیں ہیں ——— ایک تو یہ کہ انھیں بہت صدمہ پہنچا۔ دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے ——— تیسری یہ کہ اُنھیں ایک سو پانچ ڈگری بخار ہے۔"

ڈاکٹر نے چند ٹیکے تجویز کیے۔ دو نسخے پلانے والی دواؤں کے لکھے اور چلا گیا۔

زاہد فوراً یہ سب چیزیں لے آیا۔ ٹیکے لگائے۔ دوائیں بڑی مشکل سے حلق میں ٹپکائی گئیں ——— لیکن مریضہ کی حالت بہتر نہ ہوئی۔

دس پندرہ روز کے بعد اُسے تھوڑا سا ہوش آیا۔ ہذیانی کیفیت بھی دُور ہو گئی۔ زاہد نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس کی پیاری حسین بیوی نے اُسے بلایا اور بڑی نحیف آواز میں کہا "میرا اب آخری وقت آگیا ہے ——— میں چند گھڑیوں کی مہمان ہوں ———"

زاہد کی آنکھوں میں آنسو آگئے "کیسی باتیں کرتی ہو تم ——— تمھیں خدانخواستہ اگر کچھ ہو گیا تو میں کہاں زندہ رہوں گا۔"

زاہد کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ——— میں مر گئی، کل دوسری آجائے گی ——— خدا آپ کی عمر دراز کرے ——— اور ——— اور ———"

اُس نے ہچکی لی اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر اُس کی رُوح پرواز کر گئی ——— زاہد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر وہ رات کو گھر سے باہر نکلا اور ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر ریلوے لائن کا رُخ کیا۔

رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب ایک گاڑی آتی تھی۔ وہ مغل پورہ کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ وہاں پٹڑی پر لیٹ جائے اور اُسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ گاڑی آئے گی تو اُس کا خاتمہ ہو جائے گا ——— مجھے لمبی عمر کی کوئی خواہش نہیں ——— یہ جتنی جلدی مختصر ہو، اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اب اور زیادہ صدمے برداشت نہیں کر سکتا۔

جب وہ ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو اُسے گاڑی کی تیز روشنی جو انجن کی پیشانی پر ہوتی ہے دکھائی دی ——— لیکن ابھی وہ دُور ہی تھی۔ اُس نے انتظار کیا کہ جب قریب آئے گی تو وہ پٹڑی پر لیٹ جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آگئی ——— زاہد آگے بڑھا، مگر اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہوا اور

پٹڑی کے عین درمیان کھڑا ہوگیا۔ گاڑی بڑی تیز رفتار سے آرہی تھی۔ اور قریب تھا کہ وہ آدمی اُس کی جھپٹ میں آجائے وہ تیزی سے لپکا اور اُس آدمی کو دھکا دے کر پٹڑی کے اُس طرف گرادیا ——— گاڑی دندناتی ہوئی گذر گئی۔

اِس آدمی سے زاہد نے "کیا تم خودکشی کرنا چاہتے تھے؟"

اُس نے جواب دیا "جی ہاں۔"

"کیوں؟"

"بس ——— صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔"

زاہد ناصح بن گیا "بھائی میرے، زندگی زندہ رہنے کے لیے ہے۔ اس کو اچھی طرح استعمال کرو، خودکشی بہت بڑی بزدلی ہے ——— اپنی جان خود لینا کہاں کی عقلمندی ہے ——— اُٹھو، اپنے صدموں کو بھول جاؤ ——— انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں تو خوشیوں سے کیا حظ اُٹھائے گا ——— چلو میرے ساتھ۔"

(۲۵ مئی ۱۹۵۴ء)

پشاور سے لاہور تک

وہ انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے سے نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ جاوید پشاور سے اُسے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زنانہ ڈبے کے پاس سے کئی مرتبہ گذرا۔

لڑکی حسین تھی۔ جاوید اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اُس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹا سا تل تھا۔ گالوں میں ننھے ننھے گڑھے تھے جو اُس کے چہرے پر بہت بھلے لگتے تھے

راولپنڈی اسٹیشن پر اُس لڑکی نے کھانا منگوایا۔ بڑے اطمینان سے ایک ایک نوالہ اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی رہی۔ جاوید دُور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ بیٹھ جائے اور دونوں مل کر کھانا کھائیں۔

وہ یقیناً اُس کے پاس پہنچ جاتا مگر مصیبت یہ تھی کہ ڈبہ زنانہ تھا۔ عورتوں سے بھرا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جرأت نہ کر سکا۔

لڑکی نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے، جو بہت نازک تھے۔ لمبی لمبی مخروطی انگلیاں، جن کو اُس نے اچھی طرح صاف کیا اور اٹیچی کیس سے تولیہ نکال کر اپنے ہاتھ پونچھے۔ پھر اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

جاوید گاڑی چلنے تک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا اور اُسی لڑکی کے خیالوں میں غرق ہو گیا۔

معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ بڑے اچھے گھرانے کی ہے۔

دونوں کلائیوں میں قریب قریب بارہ بارہ سونے کی چوڑیاں ہوں گی۔ کانوں میں ٹاپس بھی تھے۔ دو انگلیوں میں، اگر میرا اندازہ غلط نہیں، ہیرے کی انگوٹھیاں ہیں۔ لباس بہت عمدہ۔ ساٹن کی شلوار۔ لٹھے کی قمیص۔ شفون کا دوپٹہ۔

حیرت ہے کہ گھٹیا درجے میں کیوں سفر کر رہی ہے؟

پشاور سے آئی ہے ——— وہاں کی عورتیں تو سخت پردہ کرتی ہیں ——— لیکن یہ برقعے کے بغیر وہاں سے گاڑی میں سوار ہوئی۔ اور اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں ——— نہ کوئی عورت۔ اکیلی سفر کر رہی ہے۔ آخر یہ قصّہ کیا ہے؟

میرا خیال ہے، پشاور کی رہنے والی نہیں ——— وہاں کسی عزیز سے ملنے گئی ہو گی ——— مگر اکیلی کیوں؟

کیا اسے ڈر نہیں لگا کہ اُٹھا کر لے جائے گا کوئی ——— ایسے تنہا حُسن پر تو ہر مرد جھپٹا مارنا چاہتا ہے۔

پھر جاوید کو ایک اندیشہ ہُوا ——— کہ شادی شدہ تو نہیں؟

وہ دراصل دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس لڑکی کا پیچھا کرے گا اور رومان لڑا کر اُس سے شادی کرے گا۔ وہ حرام کاری کا بالکل قائل نہیں تھا۔

کئی اسٹیشن آئے اور گذر گئے ——— اُسے صرف راول پنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اس کا گھر تھا، مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔

ایک اسٹیشن پر چیکنگ ہوئی، جس کے باعث اُسے جرمانہ ادا کرنا پڑا، مگر اُس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔

ٹکٹ چیکر نے پوچھا، "آپ کو کہاں تک جانا ہے۔"

جاوید مسکرایا "جی، ابھی تک معلوم نہیں ——— آپ لاہور کا ٹکٹ بنا دیجیے کہ وہی آخری اسٹیشن ہے۔"

ٹکٹ چیکر نے اُسے لاہور کا ٹکٹ بنا دیا۔ روپے وصول کیے اور دوسرے اسٹیشن پر اُتر گیا۔ جاوید بھی اُترا کہ ٹرین کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرنا تھا۔

ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا۔ وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی دانتوں میں خلال کر رہی تھی۔ جاوید کی طرف جب اُس نے دیکھا تو اُس کے دل و دماغ میں چیونٹیاں دوڑنے لگیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی موجودگی سے غافل نہیں ہے۔ سمجھ گئی ہے کہ وہ بار بار صرف اُسے ہی دیکھنے آتا ہے۔

جاوید کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اُس کا دل باغ باغ ہو گیا ——— مگر جاوید فرطِ جذبات کی وجہ سے فوراً وہاں سے ہٹ کر اپنے ڈبے میں چلا گیا اور رومانوں کی دُنیا کی سیر کرنے لگا ——— اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے آس پاس کی تمام چیزیں مسکرا رہی ہیں۔

ٹرین کا پنکھا مسکرا رہا ہے ——— کھڑکی سے باہر تار کے کھمبے مسکرا رہے ہیں ——— انجن کی سیٹی مسکرا رہی ہے اور وہ بدصورت مسافر جو اس کے ساتھ بیٹھا تھا، اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ہے ——— اُس کے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ لیکن اُس کا دل مسکرا رہا تھا۔

اگلے اسٹیشن پر جب وہ ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہاں چلی گئی؟ ——— کہیں پچھلے اسٹیشن پر تو نہیں اُتر گئی جہاں اُس نے ایک مسکراہٹ سے مجھے نوازا تھا؟ ——— نہیں نہیں غسل خانے میں ہو گی۔

وہ واقعی غسل خانے ہی میں تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ جاوید کو دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ کے اشارے سے اس کو بُلایا۔

جاوید کانپتا لرزتا کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اُس لڑکی نے بڑی مہین اور سُریلی آواز میں کہا "ایک تکلیف دینا چاہتی ہوں آپ کو ——— مجھے دو سیب لا دیجیے ———" یہ کہہ کر اُس نے اپنا پرس نکالا اور ایک روپے کا نوٹ جاوید کی طرف بڑھا دیا۔

جاوید نے جو اس غیر متوقع بُلاوے سے قریب قریب برق زدہ تھا، ایک روپے کا نوٹ پکڑ لیا لیکن فوراً اُس کے ہوش و حواس برقرار ہو گئے۔ نوٹ واپس دے کر اُس نے اُس لڑکی سے کہا، "آپ یہ رکھیے ——— میں سیب لے آتا ہوں۔" اور پلیٹ فارم پر اُس ریڑھی کی طرف دوڑا جس میں پھل بیچے جاتے تھے۔ اُس نے جلدی جلدی چھ سیب خریدے، کیونکہ وسل ہو چکی تھی۔

دوڑا دوڑا وہ اُس لڑکی کے پاس آیا۔ اُس کو سیب دیے اور کہا "معاف کیجیے گا ——— وسل ہو رہی تھی اس لیے میں

اچھے سیب چُن نہ سکا۔"

لڑکی مسکرائی ——— وہی دل فریب مسکراہٹ ——— گاڑی حرکت میں آئی۔ جاوید اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے کانپ رہا تھا۔ لیکن بہت خوش تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کو دونوں جہان مل گئے ہیں۔ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ اِس کی لذت سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔

اُس کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ اُس نے سوچا کہ اتنی دیر میں کتنا خشک رہا ہوں۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ محبت انسان کو کتنی تر و تازہ بنا دیتی ہے ——— وہ سیب کھا رہی ہوگی ——— لیکن اُس کے گال تو خود سیب ہیں۔ میں نے جو سیب اُس کو دیئے ہیں کیا وہ اُن کو دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوں گے۔

وہ میری محبت کے اشاروں کو سمجھ گئی، جبھی تو وہ مُسکرائی، اور اُس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بُلایا اور کہا کہ میں اُسے سیب لا دوں۔

مجھ سے اگر وہ کہتی کہ گاڑی کا رُخ پلٹ دوں تو میں خدا کی قسم اُس کی خاطر یہ بھی کر دیتا۔ گو مجھ میں اتنی طاقت نہیں، لیکن محبت میں آدمی بہت بڑے بڑے کام سر انجام دے سکتا ہے ——— فرہاد نے شیریں کے لیے پہاڑ کاٹ کر نہر نہیں کھود دی تھی؟ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اُس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی پُوچھ لیا ہوتا کہ تمھیں کہاں تک جانا ہے ——— خیر میں لاہور تک کا ٹکٹ تو بنوا چکا ہوں ——— ہر اسٹیشن پر دیکھ لیا کروں گا۔

ویسے وہ اب مجھے بن بتائے جائے گی بھی نہیں ——— شریف خاندان کی لڑکی ہے ——— میرے جذبۂ محبت نے اُسے کافی متاثر کیا ہے ——— سیب کھا رہی ہے۔ کاش کہ میں اُس کے پاس بیٹھا ہوتا۔ ہم دونوں ایک سیب کو بیک وقت اپنے دانتوں سے کاٹتے ——— اُس کا منہ میرے منہ سے کتنا قریب ہوتا۔

میں اُس کے گھر کا پتہ لوں گا ——— ذرا اور باتیں کر لوں، پھر راولپنڈی پہنچ کر امی سے کہوں گا کہ میں نے ایک لڑکی دیکھ لی ہے، اُس سے میری شادی کر دیجیے۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی ——— بس ایک دو مہینے کے اندر اندر شادی ہو جائے گی۔

اگلے اسٹیشن پر جب جاوید اُسے دیکھنے گیا تو وہ پانی پی رہی تھی۔ وہ جرأت کر کے آگے بڑھا اور اُس سے مخاطب ہوا "آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیے۔"

لڑکی مُسکرائی ——— دلفریب مسکراہٹ "مجھے سگرٹ لا دیجیے۔"

جاوید نے بڑی حیرت سے پوچھا "آپ سگرٹ پیتی ہیں؟"

"وہ لڑکی پھر مسکرائی "جی نہیں ——— یہاں ایک عورت ہے، پردہ دار، اُس کو سگرٹ پینے کی عادت ہے۔"

"اوہ! ——— میں ابھی لایا ——— کس برانڈ کے سگرٹ ہوں؟"

"میرا خیال ہے، وہ گولڈ فلیک پیتی ہے۔"

"میں ابھی حاضر کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر جاوید اسٹال کی طرف دوڑا۔ وہاں سے اُس نے دو پیکٹ لیے اور اُس لڑکی کے حوالے کر دیے۔ اُس نے شکریہ اُس عورت کی طرف سے ادا کیا جو سگریٹ پینے کی عادی تھی۔

جاوید اب اور بھی خوش تھا کہ اُس لڑکی سے ایک اور ملاقات ہو گئی۔ مگر اس بات کی بڑی اُلجھن تھی کہ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ خود کو کوسا کہ اُس نے نام کیوں نہ پُوچھا۔ اتنی باتیں ہوتی رہیں، لیکن وہ اُس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا "آپ کا نام ؟"

اُس نے ارادہ کر لیا کہ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اُس سے نام ضرور پُوچھے گا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ فوراً بتا دے گی، کیونکہ اُس میں قباحت ہی کیا تھی۔

اگلا اسٹیشن بہت دیر کے بعد آیا، اس لیے کہ فاصلہ بہت لمبا تھا۔ جاوید کو بہت کوفت ہو رہی تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ ٹائم ٹیبل دیکھا۔ گھڑی بار بار دیکھی ــــ اُس کا جی چاہتا تھا کہ انجن کو پَر لگ جائیں، تاکہ وہ اُڑ کر جلدی اگلے اسٹیشن پہنچ جائے۔

گاڑی ایک دم رک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن کے ساتھ ایک بھینس ٹکرا گئی ہے ــــ وہ اپنے کمپارٹمنٹ سے اُتر کر ساتھ والے ڈبے کے پاس پہنچا، مگر لڑکی اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔

مسافروں نے مری کٹی ہوئی بھینس کو پٹڑی سے ہٹانے میں کافی دیر لگا دی۔ اتنے میں وہ لڑکی جو غالباً دوسری طرف تماشا دیکھنے میں مشغول تھی، آئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جاوید پر جب اُس کی نظر پڑی تو مُسکرائی ــــ وہی دلفریب مسکراہٹ۔

جاوید کھڑکی کے پاس گیا، مگر اُس کا نام پُوچھ نہ سکا۔

لڑکی نے اُس سے کہا "یہ بھینسیں کیوں گاڑی کے نیچے آجاتی ہیں ؟"

جاوید کو کوئی جواب نہ سُوجھا۔ گاڑی چلنے والی تھی، اس لیے وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔

کئی اسٹیشن آئے مگر وہ نہ اُترا۔ آخر لاہور آ گیا۔ پلیٹ فارم پر جب گاڑی رُکی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا۔ لڑکی موجود تھی۔ جاوید نے اپنا سامان نکلوایا اور اُس نے جس نے ہاتھ میں اٹیچی کیس پکڑا ہوا تھا کہا "لائیے یہ اٹیچی کیس مجھے دے دیجیے۔"

اُس لڑکی نے اٹیچی کیس جاوید کے حوالے کر دیا۔ قلی نے جاوید کا سامان اُٹھایا اور دونوں باہر نکلے۔ تانگہ لیا۔ جاوید نے اس سے پوچھا "آپ کو کہاں جانا ہے ؟"

لڑکی نے بڑے نرم و نازک لہجے میں جواب دیا "جی، راوی روڈ۔"

"چلیے۔ میں آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

تانگہ راوی روڈ سے گذر رہا تھا ــــ جاوید نے اُس لڑکی سے پوچھا "کہاں جایئے گا اب آپ ؟"

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ پیدا ہوئی "جی ہیرا منڈی۔"

جاوید بوکھلا سا گیا "کیا آپ وہاں رہتی ہیں ؟"

لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا ــــ "جی ہاں ــــ میرا مکان دیکھ لیں۔ آج رات میرا مُجرا سننے ضرور آیئے گا۔"

جاوید پشاور سے لے کر لاہور تک اپنا مُجرا سُن چکا تھا، اُس نے اس طوائف کو اُس کے گھر چھوڑا اور اسی تانگے میں سیدھا لاری کے اڈے پہنچا اور راولپنڈی روانہ ہو گیا۔

(۲۶، مئی ۵۴ء)

بجلی پہلوان

بجلی پہلوان کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ برق رفتار تھا۔ بجلی کے مانند اپنے دشمنوں پر گرتا تھا اور اُنھیں بھسم کر دیتا تھا۔ لیکن جب میں نے اُسے مغل بازار میں دیکھا تو وہ مجھے بے ضرر کدو کے مانند نظر آیا۔ بڑا بھسپس سا۔ توند باہر نکلی ہوئی، بند بند ڈھیلے۔ گال لٹکے ہوئے۔ البتہ اُس کا رنگ سُرخ و سفید تھا۔

وہ مغل بازار میں ایک بزاز کی دُکان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میں نے اُس کو غور سے دیکھا، مجھے اُس میں کوئی غنڈہ پن نظر نہ آیا۔ حالانکہ اُس کے متعلق مشہور یہی تھا کہ ہندوؤں کا وہ سب سے بڑا غنڈہ ہے۔

وہ غنڈہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ اُس کے خدوخال اس کی نفی کرتے تھے۔ میں تھوڑی دیر سامنے والی کتابوں کی دُکان کے پاس کھڑا اُس کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک مسلمان عورت جو بڑی مفلس دکھائی دیتی تھی، بزاز کی دُکان کے پاس پہنچی۔ بجلی پہلوان سے اُس نے کہا "مجھے بجلی پہلوان صاحب سے ملنا ہے۔"

بجلی پہلوان نے ہاتھ جوڑ کر اُسے پرنام کیا "ماتا، میں ہی بجلی پہلوان ہوں۔"

اُس عورت نے اُس کو سلام کیا "خدا انھیں سلامت رکھے —— میں نے سُنا ہے کہ تم بڑے دیالو ہو۔"

بجلی نے بڑی انکساری سے کہا "ماتا، دیالو پرمیشور ہے —— میں کیا دیا کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے بتاؤ کہ میں کیا سیوا کر سکتا ہوں۔"

"بیٹا، مجھے اپنی جوان لڑکی کا بیاہ کرنا ہے —— تم اگر میری کچھ مدد کر سکو تو میں ساری عمر تمھیں دعائیں دوں گی۔"

بجلی نے اُس عورت سے پوچھا "کتنے روپوں میں کام چل جائے گا۔"

عورت نے جواب دیا "بیٹا، تم خود ہی سمجھ لو —— میں تو ایک بھکارن بن کر تمھارے پاس آئی ہوں۔"

بجلی نے کہا "بھکارن منہ سے نہ کہو —— میرا فرض ہے کہ میں تمھاری مدد کروں۔" اِس کے بعد اُس نے بزاز سے جو تھان تہہ کر رہا تھا کہا "لالہ جی —— دو ہزار روپے نکالیے۔"

لالہ جی نے دو ہزار روپے فوراً اپنی صندوقچی سے نکالے اور گن کر بجلی کو دے دیے۔ یہ روپے اُس نے اُس عورت کو پیش کر دیے۔ "ماتا —— بھگوان کرے کہ تمھاری بیٹی کے بھاگ اچھے ہوں۔"

وہ عورت چند لمحات کے لیے، نوٹ ہاتھ میں لیے بُت بنی کھڑی رہی۔ غالباً اُس کو اتنے روپے ایک دم مل جانے کی توقع ہی نہیں تھی۔

جب وہ سنبھلی تو اُس نے بجلی پہلوان پر دُعاؤں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے دیکھا کہ پہلوان بڑی اُلجھن محسوس کر رہا تھا، آخر اُس

نے اُس نے اُس عورت سے کہا "ماتا، مجھے شرمندہ نہ کرو ——— جاؤ، اپنی بیٹی کے دان وہیز کا انتظام کرو ——— اُس کو میری اشیرباد دینا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا غنڈہ اور بدمعاش ہے جو دو ہزار روپے ایک ایسی عورت کو جو مسلمان ہے اور جسے وہ جانتا بھی نہیں، دو ہزار روپے پکڑا دیتا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا مخیر ہے۔ ہر مہینے ہزاروں روپے دان کے طور پر دیتا ہے۔

مجھے چونکہ اُس کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے کافی چھان بین کے بعد بجلی پہلوان کے متعلق کئی معلومات حاصل کیں۔

مغل بازار کی اکثر دکانیں اُس کی تھیں۔ حلوائی کی دکان ہے، بزاز کی دکان ہے، شربت بیچنے والا ہے، شیشے فروخت کرنے والا ہے، پنساری ہے۔ بغرضکہ اِس سرے سے اُس سرے تک جہاں وہ بزاز کی دکان میں بیٹھا تھا، اُس نے ایک "لائن آف کمیونیکیشن" قائم کر رکھی تھی۔ تاکہ اگر پولیس چھاپہ مارنے کی غرض سے آئے تو اُسے فوراً اطلاع مل جائے۔

دراصل اُس کی دو بیٹھکیں تھیں جو بزاز کی دکان کے بالکل سامنے تھیں، بہت بھاری جُوا ہوتا تھا۔ ہر روز ہزاروں روپے تال کی صورت میں اُسے وصول ہو جاتے تھے۔

وہ خود جُوا نہیں کھیلتا تھا۔ نہ شراب پیتا تھا۔ مگر اس کی بیٹھکوں میں شراب ہر وقت مل سکتی تھی۔ اس سے بھی اُس کی آمدن کافی تھی۔

شہر کے جتنے بڑے بڑے غنڈے تھے، اُن کو اُس نے ہفتہ مقرر کر رکھا تھا، یعنی ہفتہ وار اُنھیں ان کے مرتبے کے مطابق تنخواہ مل جاتی تھی۔ میرا خیال ہے، اُس نے یہ سلسلہ بطور حفظِ ماتقدم شروع کیا تھا کہ وہ غنڈے بڑی خطرناک قسم کے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ غنڈے سب کے سب مسلمان تھے، زیادہ تر باٹھی دروازے کے۔ ہر ہفتے بجلی پہلوان کے پاس جاتے اور اپنی تنخواہ وصول کر لیتے ——— وہ اُن کو کبھی ناامید نہ لوٹاتا، اس لیے کہ اُس کے پاس روپیہ عام تھا۔

میں نے سُنا کہ ایک دن وہ بزاز کی دکان پر حسبِ معمول بیٹھا تھا کہ ایک ہندو بنیا جو کافی مالدار تھا، اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "پہلوان جی، میرا لڑکا خراب ہو گیا ہے ——— اُس کو ٹھیک کر دیجیے۔"

پہلوان نے مُسکرا کر اُس سے کہا "میرے دو لڑکے ہیں ——— بہت شریف۔ لوگ مجھے غنڈہ اور بدمعاش کہتے ہیں، لیکن میں نے انھیں اس طرح پالا پوسا ہے کہ وہ کوئی بُری حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ مہاشہ جی یہ آپ کا قصور ہے، آپ کے بڑے لڑکے کا نہیں۔"

بنیے نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پہلوان جی ——— میں نے بھی اُس کو اچھی طرح پالا پوسا ہے، پر اُس نے اب چوری چوری بہت بُرے کام شروع کر دیے ہیں۔"

بجلی نے اپنا فیصلہ سُنا دیا "اس کی شادی کر دو۔"

اس واقعے کو دس روز گذرے تھے کہ بجلی پہلوان ایک نوجوان لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا، حالانکہ اُس سے اس قسم کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ ہو گی اور بجلی پچاس سے اُوپر ہو گا۔ آدمی بااثر اور مالدار تھا۔ لڑکی کے والدین راضی ہو گئے چنانچہ شادی ہو گئی۔

اس نے شہر کے باہر ایک عالی شان کوٹھی بنائی تھی۔ دولہن کو وہ جب اس میں لے کر گیا، تو اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ تمام جھاڑ اور فانوس ماند پڑ گئے ہیں۔

لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ پہلی رات بجلی پہلوان نے کسرتنہ کو نا چاہی، مگر نہ کر سکا، اس لیے اُس کے دماغ میں، اپنی پہلی بیوی کا خیال کروٹیں لے رہا تھا۔ اُس کے دو جوان لڑکے تھے، جو اُسی کوٹھی کے ایک کمرے میں سو رہے تھے، یا جاگ رہے تھے۔

اُس نے اپنی پہلی بیوی کو کہیں باہر بھیج دیا تھا۔ اُس کو اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اُس کے پتی نے دوسری شادی کر لی ہے ——— بجلی پہلوان سوچتا تھا کہ اُسے اور کچھ نہیں تو اپنی پہلی استری کو مطلع کر دینا چاہیے تھا۔

ساری رات نئی نویلی دولہن جس کی عمر سولہ سترہ برس کے قریب تھی، چوڑے چکلے پلنگ پر بیٹھی بجلی پہلوان کی اُوٹ پٹانگ باتیں سنتی رہی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شادی کیا ہے۔ کیا اُسے ہر روز اسی قسم کی باتیں سننا ہوں گی۔

"کل میں تمھارے لیے دس ہزار کے زیور اور لاؤں گا۔"

"تم بڑی سندر ہو۔"

"برفی کھاؤ گی، یا پیڑے۔"

"یہ سارا شہر سمجھو کہ تمھارا ہے۔"

"یہ کوٹھی میں تمھارے نام لکھ دوں گا۔"

کتنے نوکر چاہئیں تمھیں ——— مجھے بتا دو۔ ایک منٹ میں انتظام ہو جائے گا۔

"میرے دو جوان لڑکے ہیں، بہت شریف ——— تم اُن سے جو کام لینا چاہو لے سکتی ہو۔ وہ تمھارا حکم مانیں گے۔"

دولہن ہر روز اسی قسم کی باتیں سنتی رہی۔ حتیٰ کہ چھ مہینے گذر گئے۔ بجلی پہلوان دن بدن اُس کی محبت میں غرق ہوتا گیا۔ وہ اُس کے تیکھے تیکھے نقش دیکھتا تو اپنی ساری پہلوانی بھول جاتا۔

اُس کی پہلی بیوی بدشکل تھی۔ ان معنوں میں کہ اُس میں کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ ایک عام گھرانی تھی جو ایک بچہ جننے کے بعد ہی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اُس کی یہ دوسری بیوی بڑی ٹھوس تھی۔ دس بچے پیدا کرنے کے بعد بھی وہ ثابت و سالم رہ سکتی تھی۔

بجلی پہلوان کا ایک وید دوست تھا۔ اُس کے پاس وہ کئی دنوں سے جا رہا تھا۔ اُس نے بجلی کو یقین دلایا کہ اب کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پہلوان خوش تھا۔ وید کے ہاں سے آتے ہوئے اُس نے کئی اسکیمیں تیار کیں۔ راستے میں مٹھائی خریدی۔ سونے کے دو بڑے بڑے خوشنما کڑے لیے۔ بارہ قمیصوں اور بارہ شلواروں کے لیے بہترین کپڑا قیمت ادا کیے بغیر حاصل کیا، اس لیے کہ وہ لوگ جو دکان کے مالک تھے، اس سے مرعُوب تھے اور قیمت لینے سے انکاری تھے۔

شام کو سات بجے وہ گھر پہنچا۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں گیا۔ دیکھا تو وہاں اُس کی دوسری بیوی نہیں تھی۔ اُس نے سوچا، شاید غسل خانے میں ہو گی۔ چنانچہ اُس نے اپنا بوجھ، میرا مطلب ہے وہ تھان وغیرہ پلنگ پر رکھ کر غسل خانے کا

رُخ کیا۔ مگر وہ خالی تھا!

بجلی پہلوان بڑا متحیر ہوا کہ اُس کی بیوی کہاں گئی۔ طرح طرح کے خیالات اُس کے دماغ میں آئے مگر وہ کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ اُس نے وید کی دی ہوئی گولیاں کھائیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا کہ اُس کی بیوی آجائے گی۔ آخر اُسے جانا کہاں ہے ؟

وہ گولیاں کھا کر پلنگ پر بیٹھا قمیصوں کے کپڑوں کو انگلیوں میں مسل مسل کر دیکھ رہا تھا کہ اُسے اپنی بیوی کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا۔ اُٹھ کر اُس کے کمرے میں گیا جو اُس نے اپنے بڑے لڑکے کو دے رکھا تھا۔ اندر سے اُس کی بیوی اور اُس کے بیٹے کی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔

اس نے دستک دی —— لیکن دروازہ نہ کھُلا۔ پھر بڑے زور سے چلّانا شروع کیا کہ دروازہ کھولو۔ اُس وقت اُس کا خون کھول رہا تھا۔

دروازہ پھر بھی نہ کھُلا —— اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کمرے کے اندر اس کی بیوی اور اُس کے بڑے لڑکے نے سانس لینا بھی بند کر دیا ہے۔

بجلی پہلوان نے بڑے کمرے میں جا کر گورمکھی زبان میں ایک رقعہ لکھا جس کی عبارت اُردو میں کچھ یُوں ہو سکتی ہے :۔

یہ کوٹھی اب تمہاری ہے —— میری بیوی بھی اب تمہاری بیوی ہے۔ خوش رہو۔
—— تمہارے لیے کچھ تحفے لایا تھا، وہ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔"

یہ رقعہ لکھ کر اُس نے ساٹن کے تھان کے ساتھ ٹانک دیا۔

(۲۷ مئی سنہ ۵۴ء)

ایک زاہد، ایک فاحشہ

جاوید مسعود سے میرا اتنا گہرا دوستانہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اُس کی مرضی کے خلاف اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھ پر نثار تھا میں اُس پر۔ ہم ہر روز قریب قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ ساتھ رہتے۔

وہ اپنے رشتے داروں سے خوش نہیں تھا۔ اس لیے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی بُرائی کرتا اور کہتا سگ باش، برادرِ خورد مباش۔ اور کبھی کبھی گھنٹوں خاموش رہتا جیسے خلا میں دیکھ رہا ہے میں ان کے ان لمحات سے تنگ آ کر جب سے پکارتا، "جاوید، یہ کیا بے ہودگی ہے۔"

وہ ایک دم چونکتا اور معذرت طلب کرتا "اوہ ـــــ سعادت بھائی معاف کرنا ـــــ اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

وہ اُس وقت بالکل خالی الذہن ہوتا ـــــ میں کہتا "بھئی جاوید دیکھو ـــــ مجھے تمہارا یہ وقتاً فوقتاً معلوم نہیں کن گہرائیوں میں کھو جانا بالکل پسند نہیں ـــــ مجھے تو ڈر لگتا ہے، ایک دن تم پاگل ہو جاؤ گے۔"

یہ سن کر جاوید بہت ہنسا "پاگل ہونا بہت مشکل ہے سعادت ـــــ"

لیکن آہستہ آہستہ اُس کا خلا میں دیکھنا بڑھتا گیا اور اُس کی خاموشی طویل سکوت میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ پیاری سی مسکراہٹ جو اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت کھیلتی رہتی تھی، بالکل پھیکی پڑ گئی۔

میں نے ایک دن اُس سے پُوچھا "آخر بات کیا ہے ـــــ تم بغیر پانی بن گئے ہو ـــــ ہوا کیا ہے تمہیں؟ ـــــ میں تمہارا دوست ہوں ـــــ خدا کے لیے مجھ سے تو اپنا راز نہ چھپاؤ۔"

جاوید خاموش رہا۔ جب میں نے اُس کو بہت لعن طعن کی تو اُس نے اپنی زبان کھولی "میں کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب آؤں گا۔ اُس وقت تمہیں جو پُوچھنا ہو گا، بتا دوں گا۔"

وعدے کے مطابق وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے یہاں آیا۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ بے حد خوبصورت۔ اُس میں نسوانیت کی جھلک تھی۔ پڑھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے میں آوارہ گرد تھا۔ لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

میں اس کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ جب میں نے اُس کو سگرٹ پیش کیا تو اُس نے مجھ سے کہا "تم میرے روگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں ـــــ روگ ہے یا سوگ، بہر حال تم نارمل حالت میں نہیں ہو ـــــ تمہیں کوئی نہ کوئی ذہنی

تکلیف ضرور ہے"۔

وہ مسکرایا، "ہے ——— اس لیے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی ہے"۔

محبت! ——— میں بوکھلا گیا ——— جاوید کی عمر بمشکل اٹھارہ برس کی ہوگی ——— خود ایک خوبرو لڑکی کے مانند، اس کو کس لڑکی سے محبت ہوسکتی ہے، یا ہوگئی ہے۔ وہ تو کنواری لڑکیوں سے کہیں زیادہ شرمیلا اور لجیلا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا، تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک دیہاتی دوشیزہ ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی عشقیہ فلم دیکھا ہے۔ آج وہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی ہے۔

میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے، مگر اُس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ فکر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخر میں نے پوچھا، کس لڑکی سے محبت ہوگئی ہے تمھیں؟

اُس نے کوئی جھینپ محسوس نہ کی: "ایک لڑکی ہے زاہدہ ——— ہمارے پڑوس میں رہتی ہے، بس اُس سے محبت ہوگئی ہے۔ عمر سولہ برس کے قریب ہے۔ بہت خوبصورت ہے اور بھولی بھالی ——— چوری چھپے اُس سے کئی ملاقاتیں ہوچکی ہیں۔ اُس نے میری محبت قبول کرلی ہے"۔

میں نے اس سے پوچھا "تو پھر اس اداسی کا مطلب کیا ہے جو تم پر ہر وقت چھائی رہتی ہے"۔

اُس نے مسکرا کر کہا "سعادت، تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو ——— محبت اُداسی کا دوسرا نام ہے ——— ہر وقت آدمی کھویا کھویا سا رہتا ہے، اس لیے کہ اُس کے دل و دماغ میں صرف خیالِ یار ہوتا ہے ——— میں نے زاہدہ سے تمھارا ذکر کیا اور اور اُس سے کہا، کہ تمھارے بعد اگر کوئی ہستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوست سعادت ہے"۔

"یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس، میں نے کہہ دیا ——— اور زاہدہ نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ میں تمھیں اُس سے ملاؤں۔ اُسے میری وہ چیز پسند ہے جسے میں پسند کرتا ہوں ——— بولو، چلو گے اپنی بھابی کو دیکھنے"۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اُس سے کیا کہوں۔ اُس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر لفظ بھابی سجتا نہیں تھا۔

"میری بات کا جواب دو"۔

میں نے سرسری طور پر کہہ دیا چلیں گے ——— ضرور چلیں گے ——— پر کہاں؟

"اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل شام کو پانچ بجے کسی بہانے سے لارنس گارڈن آئے گی ——— آپ اپنے پیارے دوست کو ضرور ساتھ لائیے گا ——— اب تم کل تیار رہنا ——— بلکہ خود ہی پانچ بجے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جانا۔ ہم جم خانہ کلب کے اِس طرف لان میں تمھارا انتظار کرتے ہوں گے"۔

میں انکار کیسے کرتا، اس لیے کہ مجھے جاوید سے بے حد پیار تھا۔ میں نے وعدہ کرلیا۔ لیکن مجھے اُس پر کچھ ترس آرہا تھا میں نے اُس سے اچانک پوچھا "لڑکی شریف اور پاکباز ہے نا؟"

جاوید کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ میں زاہدہ کے بارے میں ایسی باتیں سوچ سکتا ہوں، نہ سن سکتا ہوں —— تمہیں اگر اُس سے ملنا ہے تو کل شام کو ٹھیک پانچ بجے لارنس گارڈنز پہنچ جانا —— خدا حافظ۔"

جب وہ ایک دم اُٹھ کر چلا گیا، تو میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے کیوں اُس سے ایسا سوال کیا، جس سے اُس کے جذبات مجروح ہوئے —— آخر وہ اُس سے محبت کرتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی کسی سے محبت کرے تو ضروری نہیں کہ وہ بدکردار ہو۔ جاوید اُسے اپنا مخلص ترین دوست یقین کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ ناراضی کے باوجود اُس سے برہم نہ ہوا اور اُس کو جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ شام کو لارنس گارڈنز آئے۔

میں سوچتا تھا کہ زاہدہ سے مل کر میں اُس سے کس قسم کی باتیں کروں گا بے شمار باتیں میرے ذہن میں آئیں، لیکن وہ اس قابل نہیں تھیں کہ کسی دوست کی محبوبہ سے کی جائیں۔ میرے متعلق خدا معلوم وہ اُس سے کیا کچھ کہہ چکا تھا —— یقیناً اُس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار بڑے والہانہ طور پر کیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زاہدہ کے دل میں میری طرف سے حسد پیدا ہو گیا ہو، کیونکہ عورتیں اپنے عاشقوں کی محبت بٹتے نہیں دیکھ سکتیں۔ شاید میرا مذاق اُڑانے کے لیے اُس نے جاوید سے کہا ہو کہ تم مجھے اپنے پیارے دوست سے ضرور ملاؤ۔

بہر حال مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے ملنا تھا —— اس تقریب پر میں نے سوچا، کوئی تحفہ تو لے جانا چاہیے —— رات بھر غور کرتا رہا۔ آخر ایک تحفہ سمجھ میں آیا کہ سونے کے ٹاپس ٹھیک رہیں گے۔ انارکلی میں گیا تو سب دکانیں بند معلوم ہوا کہ اتوار کی تعطیل ہے —— لیکن ایک جوہری کی دکان کھلی تھی۔ اُس سے ٹاپس خریدے اور واپس گھر آیا۔ چار بجے تک شش و پنج میں مبتلا رہا، کہ جاؤں یا نہ لاؤں۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہوتا ہے —— لڑکیوں سے بے تکلف باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا، اس لیے مجھ پر گھبراہٹ کا عالم طاری تھا دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر سونا چاہا، مگر کروٹیں بدلتا رہا۔ ٹاپس میرے تکیے کے نیچے پڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ دو دہکتے ہوئے انگارے ہیں —— اُٹھا —— غسل کیا۔ اس کے بعد خوشبو —— پھر نہایا اور کپڑے بدل کر بڑے کمرے میں کلاک کی ٹک ٹک سننے لگا۔

تین بج چکے تھے۔ اخبار اُٹھایا —— مگر اُس کی ایک خبر بھی نہ پڑھ سکا —— عجب مصیبت تھی۔ عشق میرا دوست جاوید کر رہا تھا اور میں ایک قسم کا مجنوں بن گیا تھا۔

میرا بہترین سُوٹ، ریشمی کا سلا ہوا میرے بدن پر تھا۔ رومال نیا۔ قمیص بھی نئے —— میں نے یہ سنگھار اس لیے کیا تھا کہ جاوید نے جو تعریف کے پُل زاہدہ کے سامنے باندھے ہیں، کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔

ساڑھے چار بجے میں اُٹھا۔ اپنی ریلے کی سبز سائیکل لی اور آہستہ آہستہ لارنس گارڈن روانہ ہو گیا۔ جم خانہ کلب کے اُس طرف لان میں مجھے جاوید دکھائی دیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُس نے زور کا نعرہ بلند کیا۔ میں جب سائیکل پر سے اُترا تو وہ میرے ساتھ چمٹ گیا۔ کہنے لگا، "تم پہلے ہی پہنچ گئے۔ بہت اچھا کیا —— زاہدہ اب آتی ہی ہوگی —— میں نے اُس سے کہا تھا کہ میں اپنی کار بھیج دوں گا۔ مگر وہ رضامند نہ ہوئی۔ تانگے میں آئے گی۔"

جاوید کے باپ کی ایک کار تھی۔ بے بی آسٹن، خدا معلوم کس صدی کا موڈل تھا۔ زیادہ تر یہ جاوید ہی کے استعمال میں آتی تھی۔

لارنس گارڈنز میں داخل ہوتے وقت یہ عجوبۂ روزگار موٹر دیکھی تھی۔ میں نے اُس سے کہا "آؤ بیٹھ جائیں"۔

لیکن وہ رضامند نہ ہوا، مجھ سے کہنے لگا "تم ایسا کرو ——— باہر گیٹ پہ جاؤ ——— ایک تانگہ آئے گا، جس میں ایک دُبلی پتلی، لڑکی سیاہ برقع پہنے ہوگی، تم تانگے والے کو ٹھہرا لینا اور اُس سے کہنا۔ میں جاوید کا دوست سعادت ہوں ——— اُس نے مجھے تمہارے استقبال کے لیے بھیجا ہے"۔

نہیں جاوید ——— مجھ میں اتنی جرأت نہیں"۔

"لاحول ولا ——— جب تم نام بتا دو گے تو اُسے چُوں کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوگی ——— تمہاری جرأت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ——— یار، زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے، جسے بعد میں یاد کر کے آدمی محظوظ ہو سکے ——— جب زاہدہ سے میری شادی ہو جائے گی تو ہم آج کے اس واقعے کو یاد کر کے خوب ہنسا کریں گے ——— جاؤ میرے بھائی ——— وہ بس اب آتی ہی ہوگی"۔

میں جاوید کا کہنا کیسے موڑ سکتا تھا۔ بادل نخواستہ چلا گیا اور گیٹ سے کچھ دُور کھڑا رہ کر اُس تانگے کا انتظار کرنے لگا جس میں زاہدہ اکیلی کالے برقعے میں ہو۔

آدھے گھنٹے کے بعد ایک تانگہ اندر داخل ہوا جس میں ایک لڑکی کالے ریشمی برقعے میں ملبوس پچھلی نشست پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔

میں جھینپتا، سمٹتا، ڈرتا، آگے بڑھا اور تانگے والے کو روکا۔ اُس نے فوراً اپنا تانگہ روک لیا۔ میں نے اُس سے کہا "یہ سواری کہاں سے آئی ہے؟"

تانگے والے نے ذرا سختی سے جواب دیا "تمہیں اس سے کیا مطلب ——— جاؤ اپنا کام کرو"۔

برقع پوش لڑکی نے مہین سی آواز میں تانگے والے کو ڈانٹا "تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے"۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "آپ نے تانگہ کیوں روکا تھا جناب"۔

میں نے ہکلا کے جواب دیا "جاوید ——— جاوید ——— میں جاوید کا دوست سعادت ہوں ——— آپ کا نام زاہدہ ہے نا"۔

اُس نے بڑی نرمی سے جواب دیا "جی ہاں! ——— میں آپ کے متعلق اُن سے بہت سی باتیں سن چکی ہوں"۔

"اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اِسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہیں ——— وہ اُدھر جم خانہ کلب کے پاس گھاس کے تختے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے"۔

اُس نے اپنی نقاب اُٹھائی۔ اچھی خاصی شکل صورت تھی۔ مسکرا کر مجھ سے کہا "آپ اگلی نشست پر بیٹھ جائیے ——— مجھے ایک ضروری کام ہے ——— ابھی چند منٹوں میں لوٹ آئیں گے۔ آپ کے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس پر نہیں بیٹھنا پڑے گا"۔

میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تانگہ اسمبلی ہال کے پاس سے گزرا تو میں نے تانگے والے سے کہا "بھائی صاحب یہاں کوئی سگرٹ والے کی دکان ہو تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر جانا میرے سگرٹ ختم ہو گئے ہیں۔

ذرا آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سگرٹ پان والا بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے اپنا تانگہ روکا۔ میں اترا، تو زاہدہ نے کہا "آپ کیوں

تکلیف کرتے ہیں ـــ یہ تانگے والا لے آئے گا۔"

میں نے کہا "اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔" اور اُس پان سگرٹ والے کے پاس پہنچ گیا۔ ایک ڈبیہ گولڈ فلیک کی لی۔ ایک ماچس اور دو پان۔ جب پانچ کے نوٹ سے باقی پیسے لے کر مڑا تو کوچوان میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس نے دبی زبان میں مجھ سے کہا "حضور اس عورت سے بچ کر رہیے گا۔"

میں بڑا حیران ہوا "کیوں ؟"

کوچوان نے بڑے وثوق سے کہا "فاحشہ ہے ـــ اس کا کام ہی یہی ہے کہ شریف اور نوجوان لڑکوں کو پھانستی رہے ـــ میرے تانگے میں اکثر بیٹھتی ہے۔"

یہ سُن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے تانگے والے سے "خدا کے لیے تم اسے وہیں چھوڑ آؤ، جہاں سے لائے ہو کہہ دینا کہ میں اُس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ میرا دوست وہاں لارنس گارڈنز میں انتظار کر رہا ہے۔"

تانگے والا چلا گیا ـــ معلوم نہیں اُس نے زاہدہ سے کیا کہا۔ میں نے ایک دوسرا تانگہ لیا اور سیدھا لارنس گارڈنز پہنچا۔ دیکھا کہ جاوید ایک خوبصورت لڑکی سے محوِ گفتگو ہے۔ بڑی شرمیلی اور لجیلی تھی۔ میں جب پاس آیا تو اُس نے فوراً اپنے دوپٹہ سے منہ چھپا لیا۔

جاوید نے بڑی خفگی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا "تم کہاں غارت ہو گئے تھے ـــ تمھاری بھابی کب کی آئی بیٹھی ہیں۔"

سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں، سخت بوکھلا گیا ـــ اس بوکھلاہٹ میں یہ کہہ گیا "تو وہ کون تھیں جو مجھے تانگے میں ملیں ؟"

جاوید ہنسا "مذاق نہ کرو مجھ سے ـــ بیٹھ جاؤ اور اپنی بھابی سے باتیں کرو۔ یہ تُم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔"

میں بیٹھ گیا اور کوئی سلیقے کی بات نہ کر سکا، اس لیے کہ میرے دل و دماغ پر وہ لڑکی یا عورت مسلط ہو گئی تھی جس کے متعلق تانگے والے نے مجھے بڑے خلوص سے بتا دیا تھا کہ فاحشہ ہے۔

(۲۸ مئی ۵۴ء)

شِیدا

شیدے کے متعلق امرتسر میں یہ مشہور تھا کہ وہ چٹان سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔ اُس میں بلا کی پھرتی اور طاقت تھی۔ گو تن و توش کے لحاظ سے وہ ایک کمزور انسان دکھائی دیتا تھا، لیکن امرتسر کے سارے غنڈے اُس سے خوف کھاتے اور اُس کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

فرید کا چوک۔ معلوم نہیں فسادات کے بعد اُس کی کیا حالت ہے۔ عجیب و غریب جگہ تھی۔ یہاں شاعر بھی تھے، ڈاکٹر اور حکیم بھی، موچی اور جُلاہے، جواری اور بدمعاش، نیک اور پرہیزگار سبھی یہاں بستے تھے۔ ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔

شیدے کی سرگرمیاں چوک سے باہر ہوتی تھیں، یعنی وہ اپنے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا جس پر اُس کے محلے والوں کو اعتراض ہو ——— اُس نے جتنی لڑائیاں لڑیں، دوسرے غنڈوں کے محلّے میں۔

وہ کہا کرتا تھا اپنے محلّے میں کسی دوسرے محلے کے غنڈے سے لڑنا نامردی کی نشانی ہے ——— مزا تو یہ ہے کہ دشمن کو اُس کی اپنی جگہ پر مارا جائے۔

اور یہ صحیح تھا۔ ایک بار پٹرنگوں سے اُس کی ٹھن گئی۔ وہ کئی مرتبہ چوک فرید سے گذرے ——— بڑکیں مارتے، نعرے لگاتے، شیدے کو گالیاں دیتے۔ وہ یہ سب سُن رہا تھا، مگر اُس نے اُن سے بھڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش رحمان "تاندرو" کی دکان میں بیٹھا رہا۔

لیکن دو گھنٹوں کے بعد وہ پٹرنگوں کے محلّے کی طرف روانہ ہُوا۔ اکیلا ——— بالکل اکیلا اور پھر غیر مسلح۔

وہاں جا کر اُس نے ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور پٹرنگوں کو جو اپنے کام میں مصروف تھے للکارا، "نکلو باہر ——— تمھاری ......"

دس پندرہ پٹرنگ لاٹھیاں لے کر باہر نکل آئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ میرا خیال ہے، شیدا گتکے اور بنوٹ کا ماہر تھا۔ اُس پر لاٹھیاں برسائی گئیں، لیکن اُس نے ایک بھی ضرب اپنے پر نہ لگنے دی۔ ایسے پینترے بدلتا رہا کہ پٹرنگوں کی سٹی گم ہو گئی۔

آخر اُس نے ایک پٹرنگ سے بڑی چابکدستی سے لاٹھی چھینی اور حملہ آوروں کو مار مار کے اَدھ مُوا کر دیا۔

دوسرے روز اُسے گرفتار کر لیا گیا ——— دو برس قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ وہ جیل چلا گیا جیسے وہ اُس کا اپنا گھر ہے۔

اِس دوران میں اُس کی بوڑھی ماں وقتاً فوقتاً ملاقات کے لیے آتی رہی۔

وہ مشقت کرتا تھا، لیکن اُسے کوئی کوفت نہیں ہوتی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ چلو ورزش ہو رہی ہے، صحت ٹھیک رہے گی۔

اُس کی صحت باوجود اِس کے کہ کھانا بڑا واہیات ہوتا تھا، پہلے سے بہتر تھی۔ اُس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ لیکن وہ بعض اوقات مغموم ہو جاتا اور اپنی کوٹھڑی میں ساری رات جاگتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر پنجابی کی یہ بولی ہوتی ہے

کی کیجیے تیری باری
مہناں مہناں ہو کے ٹُٹ گئی

ایک برس گذر گیا مشقت کرتے کرتے ——— اب اُس کی افسردگی کا دور شروع ہوا۔ اُس نے مختلف بولیاں گانا شروع کر دیں مجھے ایک قیدی نے بتایا جو اُس کے ساتھ والی کوٹھڑی میں تھا کہ وہ بولیاں گایا کرتا تھا۔ سے

بیہ جان گے یار گواچے
ٹھیکے نے بیڑیاں دے

اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنا گمشدہ محبوب مل جائے گا اگر تو دریا کے ساحل پر کشتیاں چلانے کا ٹھیکہ لے لے۔

گُڈی کٹ جاندی جنہاں دی پریم والی
مُنڈے نے جاندے اُونہاں دی ڈور لُٹ کے

یعنی جن کی محبت کا پتنگ کٹ جاتا ہے تو لڑکے بالے بڑا شور مچاتے ہیں اور اُن کی ڈور لُوٹ کر لے جاتے ہیں۔

میں اب اور بولیوں کا ذکر نہیں کروں گا، کیونکہ اُن سب کا جو شیدے کے ہونٹوں پر ہوتی تھیں، ایک ہی قسم کا مفہوم ہے۔

اُس قیدی نے مجھ سے کہا "ہم سمجھ گئے تھے کہ شیدا کسی کے عشق میں گرفتار ہے ——— کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ اُسے آہیں بھرتے بھی دیکھا ——— مشقت کے دوران میں وہ بالکل خاموش رہتا، ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی اور دُنیا کی سیر کر رہا ہے ——— تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک لمبی آہ بھرتا اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا۔"

ڈیڑھ برس کے بعد جب شیدا خودکشی کا ارادہ کر چکا تھا، اور کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی ختم کر دے کہ اُسے اطلاع ملی کہ ایک جوان لڑکی تم سے ملنے آئی ہے۔ اُس کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جوان لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ اُس کی تو صرف ماں ہی ماں تھی جو اُس سے اپنی ممتا کے باعث ملنے آجایا کرتی تھی۔

ملاقات کا انتظام ہوا۔ شیدا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا اُس کے ساتھ مسلح سپاہی۔ لڑکی کو بلایا گیا۔ شیدے نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ ایک برقع پوش عورت آہنی پنجرے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اُس کو ابھی تک یہ حیرت تھی کہ یہ عورت یا لڑکی کون ہو سکتی ہے۔

سفید برقع تھا جب وہ پاس آئی تو اُس نے نقاب اُٹھائی ——— شیدا چیخا "تم ——— تم کیسے ......"

زلیخا جو کہ چیڑ نگوں کی لڑکی تھی، زار و قطار رونے لگی۔ اُس کے حلق میں لفظ اٹک اٹک گئے "میں تم سے ملنے آئی ہوں ——— لیکن ——— لیکن مجھے ——— مجھے معاف کر دینا اتنی دیر کے بعد آئی ہوں ——— تم ——— خدا معلوم ——— اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچتے ہو گے۔"

شیدے نے سلاخوں کے ساتھ سر لگا کر کہا "نہیں میری جان ——— میں تمہارے متعلق سوچتا ضرور رہا ——— لیکن میں جانتا تھا کہ تم مجبور ہو۔"

زلیخا نے روتے ہوئے کہا "میں واقعی مجبور تھی ——— لیکن آج مجھے موقع ملا تو میں آگئی۔ سچ کہتی ہوں، میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔"

"یہ موقع تمھیں کیسے مل گیا؟"

زلیخا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے "میرے ابّا کا انتقال ہو گیا ہے۔ کل اُن کا چالیسواں تھا"
رشید امرحوم سے اپنی ساری مخاصمت بھول گیا "خدا انھیں جنت بخشے ـــ مجھے یہ خبر سُن کر بڑا افسوس ہوا۔ یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "صبر کرو زلیخا ـــ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں"
زلیخا نے اپنے سفید بُرقعے سے آنسو پونچھے "میں نے بہت صبر کیا ہے، رشیدے، اب اور کتنی دیر کرنا پڑے گا ـــ تم یہاں سے کب نکلو گے؟"
بس چھ مہینے رہ گئے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بہت پہلے ہی چھوڑ دیں گے۔ یہاں کے سب افسر مجھ پر مہربان ہیں
زلیخا کی آواز میں محبت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا "جلدی آؤ پیارے ـــ مجھے اب تمھاری ہونے میں روکنے والا کوئی نہیں۔ خدا کی قسم اگر کسی نے تمھاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو میں خود اُس سے نپٹ لوں گی ـــ میں نہیں چاہتی کہ تم پھر اسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔"
سنتری نے کہا کہ وقت ختم ہو گیا۔ چنانچہ اُن کی ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ زلیخا روتی روتی چلی گئی اور رشید اول میں مسرت اور آنکھوں میں آنسو لیے جیل کے اندر چلا گیا، جہاں اُس کو مشقت کرنا تھی۔ اُس دن اُس نے اتنا کام کیا کہ جیلر دنگ رہ گئے۔
دو مہینوں کے بعد اُسے رہا کر دیا گیا ـــ اس دوران میں زلیخا دو مرتبہ اُس سے ملاقات کرنے آئی تھی۔ اُس نے آخری ملاقات میں اُس کو بتا دیا تھا کہ وہ کس تاریخ کو جیل سے باہر نکلے گا چنانچہ وہ گیٹ کے پاس برقع پہنے کھڑی تھی۔ دونوں فرطِ محبت میں آنسو بہانے لگے۔
رشیدے نے تانگہ لیا۔ دونوں اس میں سوار ہوئے اور شہر کی جانب چلے۔ لیکن رشیدے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زلیخا کو کہاں لے جائے گا۔ "زلیخا تمھیں کہاں جانا ہے" زلیخا نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں ـــ تم جہاں لے جاؤ گے، وہیں چلی جاؤں گی"
رشیدے نے کچھ دیر سوچا اور زلیخا سے کہا "نہیں ـــ یہ ٹھیک نہیں۔ تم اپنے گھر جاؤ ـــ دنیا مجھے گنڈہ کہتی ہے لیکن میں تمھیں جائز طریقے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں ـــ تم سے باقاعدہ شادی کروں گا"
زلیخا نے پوچھا "کب؟"
"بس ایک دو مہینے لگ جائیں گے ـــ میں اپنی جوئے کی بیٹھک پھر سے قائم کر لوں۔ اس عرصے میں اتنا روپیہ اکٹھا ہو جائے گا کہ میں تمھارے لیے زیور کپڑے خرید سکوں ـــ"
زلیخا بہت متاثر ہوئی "تم کتنے اچھے ہو رشیدے ـــ جتنی دیر تم کہو گے، میں اُس گھڑی کے لیے انتظار کروں گی جب میں تمھاری ہو جاؤں گی۔"
رشید اذرا جذباتی ہو گیا "جانی، تم اب بھی میری ہو ـــ میں بھی تمھارا ہوں ـــ لیکن میں چاہتا ہوں جو کام ہو طور طریقے سے ہو ـــ میں اُن لوگوں سے نہیں جو دوسروں کی جوان کنواری کو ورغلا کر خراب کرتے ہیں ـــ مجھے تم سے محبت ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمھاری خاطر میں نے مار کھائی اور قریب قریب دو برس جیل میں کاٹے ـــ خداوند پاک کی قسم کھا کے کہتا ہوں، ہر وقت میرے ہونٹوں پر تمھارا نام رہتا تھا"
زلیخا نے کہا "میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی لیکن تمھارے لیے میں نے ایک ہمسائی سے سیکھی اور بلا ناغہ پانچوں وقت پڑھتی رہی ـــ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ خدا تمھیں ہر آفت سے محفوظ رکھے۔"

شیدے نے شہر پہنچتے ہی دوسرا تانگہ لے لیا اور زلیخا سے جُدا ہو گیا، تاکہ وہ اپنے گھر جائے اور وہ اپنے۔

شیدے نے ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر ایک ہزار روپے پیدا کر لیے۔ ان سے اُس نے زلیخا کے لیے سونے کی چُوڑیاں اور انگوٹھیاں بنوائیں۔ گلے کے لیے ایک نکلس بھی لیا ——— اب وہ پوری طرح لیس تھا۔

ایک دن وہ اپنے گھر میں اُوپر پیڑھی پر بیٹھا کھانا کھانے لگا تھا کہ نیچے سے کسی عورت کے بین کرنے جیسی آواز آئی۔ وہ اُسے پکار رہی تھی اور ساتھ ساتھ کوسنے بھی دے رہی تھی۔

شیدے نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا، تو ایک بڑھیا تھی، جو اُس کے محلّے کی نہیں تھی۔ اُس نے گردن اُٹھا کر اُوپر دیکھا اور پُوچھا کیا تم ہی شیدے ہو؟"

"ہاں ہاں۔"

"خدا کرے نہ رہو اس دُنیا کے تختے پر ——— تمھاری جوانی ٹوٹے ——— تم پر بجلی گرے۔"

شیدے نے کسی قدر غصّے میں بڑھیا سے پُوچھا "بات کیا ہے؟"

بڑھیا کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہو گیا "میری بچّی تم پر جان چھڑکے اور تمھیں کچھ پتا ہی نہیں۔"

شیدے نے حیرت سے اُس بڑھیا سے سوال کیا "کون ہے تمھاری بچّی؟"

"زلیخا اور کون؟"

"کیوں کیا ہُوا اُس کو؟"

بڑھیا رونے لگی "وہ تم سے ملتی تھی، تم غنڈے ہو، اس لیے ایک تھانیدار نے زبردستی اُس کے ساتھ اپنا منہ کالا کیا۔"

شیدے کے ہوش و حواس ایک لحظے کے لیے غائب ہو گئے، مگر سنبھل کر اُس نے بڑھیا سے پوچھا "کیا نام ہے اُس تھانیدار کا؟"

بڑھیا کانپ رہی تھی "کرم داد ——— تم یہاں اُوپر مزے میں بیٹھے ہو۔ بہت بڑے غنڈے بنے پھرتے ہو ——— اگر تم میں تھوڑی سی غیرت ہے، تو جاؤ اور اس تھانیدار کا سر گنڈاسے سے کاٹ کے رکھ دو۔"

شیدا نے کچھ نہ کہا۔ کھڑکی سے ہٹ کر اُس نے بڑے اطمینان سے کھانا کھایا۔ پیٹ بھر کے۔ دو گلاس پانی کے پیئے اور ایک کونے میں رکھی ہوئی کلہاڑی لے کر باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد اُس نے زلیخا کے گھر دروازے پر دستک دی۔ وہی بڑھیا باہر نکلی ——— شیدے کے ہاتھ میں خُون آلود کلہاڑی تھی۔ اُس نے بڑے پُرسکون لہجے میں اُس سے کہا "ماں ——— جو کام تم نے مجھ سے کہا تھا کر آیا ہوں ——— زلیخا سے میرا سلام کہنا ——— میں اب چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ سیدھا کوتوالی گیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

(۳۰ مئی ۵۴ء)

بڈھا کھوسٹ

یہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد کی بات ہے جب میرا عزیز ترین دوست لفٹننٹ کرنل محمد سلیم شیخ (اب) ایران، عراق اور دوسرے محاذوں سے ہوتا ہوا بمبیئے پہنچا۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا میرا فلیٹ کہاں ہے۔ ہم میں گاہے گاہے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ مزا نہیں آتا تھا۔ اس لیے کہ ہر خط سنسر ہوتا ہے۔ اِدھر سے جاتے، یا اُدھر سے آتے۔ عجیب مصیبت تھی۔

مگر اب ان مصیبتوں کا ذکر کیا کرنا۔ اُسے بمبئی کے بی، بی اینڈ سی، آئی، اے کے ٹریننس پر اُس کی پوسٹنگ ہوئی۔ اُس وقت وہ صرف لفٹننٹ تھا۔ ہم دونوں وسیع و عریض ریلوے اسٹیشن کے بُوفے میں بیٹھ گئے اور دوپہر کے بارہ ایک بجے تک ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر پیتے رہے۔ اُس نے اس دوران میں مجھے کئی کہانیاں سنائیں۔ جن میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اس نے ایران، عراق اور خدا معلوم کن کن ملکوں کے اپنے معاشقے سنائے۔ میں سنتا رہا پیشہ ور عاشق تو کالج کے زمانے سے تھا اس کی داستانیں اگر میں سناؤں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ بہرحال آپ کو اتنا بتانا ضروری ہے کہ اُسے لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گُر معلوم تھا۔

گورڈن کالج راولپنڈی میں وہ راجہ اندر تھا۔ اُس کے دربار میں وہاں کی تمام پریاں مُجرا عرض کرتی تھیں —— خوبصورت تھا، کافی خوبصورت، مگر اُس کا حُسن مردانہ حُسن تھا۔ پتلی نوکیلی ناک جو یقیناً اپنا کام کر جاتی ہوگی۔ چھوٹی چھوٹی گہرے بھوسلے رنگ کی آنکھیں جو اُس کے چہرے پر سج گئی تھیں۔ بڑی ہوتیں تو شاید اس کے چہرے کی ساری کشش ماری جاتی۔

وہ کھلنڈرا تھا جس طرح لارڈ بائرن صرف کچھ عرصے کے لیے کسی سے دلچسپی لیتا تھا اور پھر اُسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا، جیسے وہ اُس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں، اسی طرح کا سلوک وہ اپنے جال میں پھنسی ہوئی لڑکیوں سے کرتا۔ مجھے اُس کا یہ رویّہ پسند نہیں تھا کہ یہ میری نظر میں بہت ظالمانہ ہے۔ مگر وہ بے پروا تھا۔ کہا کرتا "اُلّو کے پٹھے —— غالب پڑھو وہ کیا کہتا —— اُسے متن یاد کبھی نہیں رہتا تھا، مگر اُس کا مفہوم اپنے الفاظ میں ادا کر دیا کرتا —— وہ کہتا ہے، وہی شاخِ طوبیٰ اور جنّت میں وہی ایک حُور —— واللہ زندگی اجیرن ہو جائے گی —— شہد کی مکھی بنو، کلی کلی کا رس چوسو —— مکھی کسی مصری کی نہ بنو، جو وہیں چپک کر رہ جائے۔" پھر اُس نے اقبال کے ایک شعر کا حوالہ اپنا بیئر کا گلاس خالی کرتے ہوئے دیا کیا کہا ہے اقبال نے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

"ثابت ہوا کہ تم نہ صرف ناداں ہو، بلکہ درجہ اوّل بناسپتی گھی کی طرح درجہ اوّل چغد بھی ہو —— اب بتاؤ اس بکواس کو،"

میں نے یہ بکواس اس طرح ہٹائی جس طرح بیرے نے میری بیئر کی خالی بوتل

پیشتر اس کے کہ میں اصل کہانی کی طرف آؤں۔ میں آپ کو شیخ تسلیم سے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ہم گورڈن کالج میں بی۔ اے فائنل میں پڑھتے تھے کہ کرسمس کی چھٹیوں میں ایک رکمنی کی شادی کی اُڑتی اُڑتی افواہ ہمیں ملی۔ یہ رکمنی ہماری ہی کسی کلاس میں پڑھتی تھی اور کچھ عرصہ پہلے بُری طرح شیخ تسلیم پر فریفتہ۔ شکل صورت اُس کی واجبی تھی۔ مگر میرا دوست شہد کی مکھی تھا چنانچہ دو مہینے اُن کا معاشقہ چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ اُس سے بالکل اجنبی ہو گیا۔

جب اُس کو بتایا گیا کہ رکمنی جو تمھاری محبوبہ تھی اور جس کی خاطر تم نے اتنے جھگڑے اپنی کلاس کے طالب علموں سے کیے۔" وہ اگر دوسری جگہ بیاہی جائے تو ڈوب مرو ——— لیکن تم تیرنا جانتے ہو۔ ڈبونے کا کام ہم اپنے ذمے لیتے ہیں:"

شیخ تسلیم کو اس قسم کی باتیں عموماً کھا جاتی تھیں۔ اُس نے اپنی مہین مہین مونچھوں کو تاؤ دینے کی کوشش کی اور کہا "اچھا، تم دیکھ لینا کیا ہوگا:"

اس کی پارٹی کے ایک قوی ہیکل لڑکے نے پوچھا "کیا ہوگا؟"

شیخ تسلیم نے اُس کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا "ہوگا تمھاری ماں کا سر ——— جب شادی کا دن آئے گا، دیکھ لینا ——— چلو آؤ میرے ساتھ مجھے تم سے چند باتیں کرنی ہیں:"

شادی کا دن آگیا۔ بارات جب دولہا والوں کے گھر کے پاس پہنچی تو کوئی شخص سر پر سہرے باندھے بڑے اچھے گھوڑے پر سوار اندر داخل ہو گیا۔ دولہا موٹر میں تھا جس پر پھولوں کا جال بنا ہوا تھا۔

گھوڑ سوار سہرے سے لدا پھندا شامیانے کے پاس تھا۔ گھوڑا خود دُولہا بنا ہوا تھا۔ دولہن کا باپ اور اُس کے رشتہ دار آگے بڑھے گھوڑے کا مالک بھاگا بھاگا آگیا تھا۔ اس سہرے سے لدے ہوئے آدمی کو اُس جگہ بٹھا دیا گیا، جہاں دولہن کو بھی ساتھ بیٹھنا تھا۔ بیچ میں ہون کنڈ تھا جس میں چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے ٹکڑے جل رہے تھے۔ اُنھوں نے ننگے بدن اُٹھ کر دولہن کو اشیرواد دی اور دولہن سے کہا "سردار جی دولہن کو جلد بُلا لیجیے۔ مہورت ہو گیا ہے:"

فوراً رکمنی پہنچ گئی اور کچھ عرصے کے لیے دولہا کے ساتھ بٹھا دی گئی۔ پنڈت جی نے کچھ پڑھا جس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا ——— لیکن ایک دم شادی کے اُس جلسے میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی جب کار سے ایک دولہا نکل کر سامنے آگیا اور بلند آواز میں تمام حاضرین کو مخاطب کیا "میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے ——— میں دعویٰ دائر کروں گا:"

وہ دولہا جو ہاتھ پکڑ کر دُولہن کو اُٹھا رہا تھا بڑی خوفناک آواز میں چلایا۔ "اب، جا لے دعوے دائر کرنے کے کچھ لگتے:"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے پھولوں کا گھونگھٹ اُٹھا دیا اور اُن ہزار کے قریب آدمیوں سے جو شامیانے کے نیچے تھے کچھ کہنا چاہا ——— مگر قہقہوں کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا ——— دوسری پارٹی کے آدمی بھی ان قہقہوں میں شریک ہوئے۔ کیونکہ جب یہ پھولوں کا پردہ علیحدہ ہوا تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ سلیم ہے۔

رکمنی بڑی خفیف ہوئی، مگر شیخ تسلیم نے بڑی جرأت سے کام لے کر اُس سے بلند آواز میں پُوچھا "تم اس چغد کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو؟"

رکمنی خاموش رہی۔

"اچھا جاؤ جہنم میں —— لیکن ایک دن نہیں، پُورے تین مہینے تم ہمیں پُوجتی رہی ہو" یہ کہہ کر وہ صحیح دولہا کی طرف بڑھا جس کے مُنہ سے غصّے کے مارے جھاگ نکل رہے تھے۔ آگے بڑھ کر اُس نے اپنے سارے ہار اُس کے گلے میں ڈال دیے —— سب براتی بُت بنے بیٹھے تھے۔ ہنستا، قہقہے لگاتا وہ اپنے گھوڑے پر بڑی صفائی سے سوار ہُوا اور ایڑ لگا کر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ گھوڑے سے اتر کر دہم دُور نکل گئے تھے، اس لیے کہ میں اُس کے پیچھے گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے بھاگا تھا) اُس نے میرا کاندھا بڑے زور سے ہلایا "کیوں بیٹے میں نے تم سے کیا کہا تھا اب دیکھ لیا؟"

ہُوا تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر مجھے ڈر تھا، کہیں شیخ تسلیم گرفتار نہ ہو جائے۔ میں نے اُس سے کہا "جو تم نے کیا وہ اور کوئی نہیں کر سکتا لیکن بھائی میرے، کہیں ہنسی میں پھنسی نہ ہو جائے۔ فرض کرو اگر رکمنی کے باپ نے تمھیں گرفتار کرا دیا؟"

وہ اکڑ کر بولا "اُس کے باپ کا باپ بھی نہیں کر سکتا —— کون اپنی بیٹی کو عدالت چڑھائے گا —— میں تو اسی وقت گرفتار ہونے کے لیے تیار ہوں —— لے جائے مجھے تھانے —— اس سالی کے سارے پول کھول دوں گا —— میرے پاس اُس کے درجنوں خطوط پڑے ہیں"۔

سارے شہر میں یہی افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ رکمنی کا باپ، شیخ تسلیم کو ضرور اُس کی گستاخی کی سزا دلوائے گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھے۔ مگر کچھ نہ ہُوا۔

جب کئی دن گزر گئے تو میرے پاس گاتا ہُوا آیا۔ ؎

"تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ تماشا نہ ہُوا"

اب میں اصل کہانی کی طرف پلٹتا ہوں، جو اس واقعے سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ اور معنی خیز ہے —— یہ خود اُس نے مجھے سنائی جس کی صداقت پر مجھے سو فی صد یقین ہے —— اس لیے کہ شیخ تسلیم جھوٹا کبھی نہیں تھا۔

اُس نے مجھے بتایا "میں ایران میں تھا۔ وہاں کی لڑکیاں عام یورپین لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں، وہی لباس، وہی وضع قطع۔ البتہ ناک نقشے کے لحاظ سے کافی مختلف ہوتی ہیں —— جتنی خرافات وہاں ہوتی ہے، شاید ہی کسی اور ملک میں ہوتی ہے —— میں نے وہاں کئی شکار کیں۔ وہاں میرے ایک بڑے افسر کرنل عثمانی تھے۔ حالانکہ اُن کا عہدہ جیسا کہ ظاہر ہے مجھ سے بہت بڑا تھا۔ لیکن وہ میرے بڑے مہربان تھے۔ میس میں جب بھی مجھے دیکھتے، دور سے پکارتے —— ادھر آؤ شیخ، میرے پاس بیٹھو، اور وہ میرے لیے ایک کرسی منگواتے۔ وسکی کا دور چلتا تو اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے۔ کرنل عثمانی صاحب کو مجھ سے چھیڑ خانی کرنے میں خاص مزا آتا —— جب وہ کوئی فقرہ مجھ پر چُست کرتے تو بہت خوش ہوتے —— کافی معمر آدمی تھا۔ اس کے علاوہ بڑا افسر، میں خاموش رہتا —— اُن کو اُن پولستانی نرسوں سے بڑی دلچسپی تھی جو وہاں ایمبولنس کور میں کام کرتی تھیں —— یہ پولستانی لڑکیاں بلا کی تنومند ہوتی ہیں —— یہ موٹی موٹی سفید پنڈلیاں، بڑی مضبوط چھاتیاں بڑی بڑی اور صحت مند ونعے جوڑے اور گوشت سے بھرے ہوئے، جن میں سختی ہو —— لوہے ایسی سختی —— میری کئی دوست تھیں۔

پر جب میں آئرن سے ملا تو سب کو بھول گیا۔ سارے ایران کو بھول گیا۔ بڑی صفتیں تھیں۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اگر تم اُس کی چھاتیوں اور پنڈلیوں کو پیشِ نظر رکھتے تو یہی سمجھتے کہ اس کے ہاتھ ڈبل روٹی کے مانند ہوں گے۔ اُس کی انگلیاں اتنی موٹی ہوں گی جیسے کسی درخت کے ٹہن ——— مگر نہیں دوست، اُس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے، اور اس کی انگلیاں، تم یہ سمجھ لو کہ چغتائی کی بنائی تصویروں کی مخروطی لانبی نہیں، مگر پتلی پتلی تھیں ——— میں تو اُس پر فریفتہ ہو گیا ——— چند روز کی ملاقاتوں ہی میں اُس کے میرے تعلقات بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئے۔"

یہاں تک پہنچ کر شیخ رُک گیا۔ ایک نیا پیگ گلاس میں ڈالا اور سوڈا ملا کر غٹاغٹ پی گیا "نہ یاد کراؤ یہ قصّہ"، میں نے اُس سے کہا "لفٹنٹ صاحب، آپ نے خود ہی تو شروع کیا تھا۔"

اُس نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک اور پیگ اپنے گلاس میں۔ تین چار پیگ جو بوتل میں باقی بچ گئے تھے۔ انتقاماً میرے گلاس میں ڈالے اور خود سوکھی جسے انگریزی میں نیٹ کہتے ہیں پی گیا اور کھانس کھانس کر اپنا بُرا حال کر لیا "لعنت ہو تم پر!"

"یعنی یہ کیا موقعہ تھا مجھ پر لعنت بھیجنے کا۔"

اُس کی کھانسی اب بند ہو گئی تھی اور وہ رومال سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا "کچھ نہ پوچھو میری جان ——— دوسرے روز رات کو کرنل صاحب سے ملاقات ہوئی ——— انھوں نے بڑے طنز سے کہا، کہو صاحبزادے مجھے بڈھا سمجھتے ہو ——— وہ تم نے ضرب المثل نہیں سُنی ——— نیا ایک دن، پرانا سو دن ——— میں نے اُن سے عرض کی، کرنل صاحب، آپ کا میرا کیا مقابلہ ——— مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کمبخت اس حقیقت سے اب تک غافل ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور عشق فرما رہا ہے۔

"میں تو خدا کی قسم جب اس عمر کو پہنچوں گا تو خودکشی کر لوں گا ——— اس منہ کے ساتھ جس میں آدھے دانت مصنوعی ہیں، میری آئرن پر نگاہیں لگائے بیٹھا ہے۔ کرنل ہو گا تو اپنے گھر میں۔ اس نے کبھی پھر اُس کی بات کی تو ایک ایسا گھونسہ جماؤں گا اس کی سوکھی گردن پر کہ منکا باہر آجائے گا۔"

دیر تک اس بڈھے کھوسٹ سے آئرن ——— نہایت ہی پیاری آئرن کے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔ وسکی کا چوتھا دور چل رہا تھا ... نے اپنے ہونٹوں پر بڑی فرمانبردار قسم کی مسکراہٹ پیدا کی اور اُس سے کہا، کرنل صاحب جو آپ کو بڈھا کہے، وہ خود بڈھا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ دھان پان ہیں۔"

یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔ آئرن نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے روز فلاں فلاں ہوٹل میں شام کو سات بجے ملے گی۔ اس میں فوجیوں کو اجازت تھی۔ اتوار تھا، اس لیے میں وردی کے بجائے نہایت اعلیٰ سُوٹ پہن کر وہاں پہنچا۔ سات بجنے میں ابھی نو منٹ باقی تھے۔ میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا، تو میرے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے ——— کرنل عثمانی صاحب آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے غافل آئرن کا بڑا لمبا بوسہ لے رہے تھے ——— مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اُس کرنل سے کہیں زیادہ بڈھا کھوسٹ بن گیا ہوں۔

(۳۱ مئی سنہ ۵۴ء)

انار کلی

نامُ اُس کا سلیم تھا، مگر اُس کے یار دوست اُسے شہزادہ سلیم کہتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ اس کے خد و خال مغلئی تھے خوبصورت تھا۔ چال ڈھال سے رعونت ٹپکتی تھی۔

اُس کا باپ پی، ڈبلیو، ڈی کے دفتر میں ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ سو رُپیے ہوگی، مگر بڑے ٹھاٹ سے رہتا۔ ظاہر ہے کہ رشوت کھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا۔ جیب خرچ بھی اُس کو کافی ملتا، اس لیے کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بہت بن ٹھن کے رہتا۔ اُس کے پاس کئی سُوٹ، کئی قمیصیں تھیں، جو وہ بدل بدل کے پہنتا۔ شُو کم از کم بیس کے قریب ہوں گے۔

جب کالج میں تھا تو کئی لڑکیاں اُس پر جان چھڑکتی تھیں ــــ مگر وہ بے اعتنائی برتتا۔ آخر اس کی آنکھ ایک شوخ و شنگ لڑکی جس کا نام سیما تھا، لڑ گئی۔ سلیم نے اُس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اس کی التفات حاصل کرے گا ــــــ نہیں وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ سیما اس کے قدموں پر گر پڑے گی اور اُس کی ممنون و متشکر ہو گی کہ اُس نے محبت کی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

ایک دن کالج میں سلیم نے سیما سے پہلی بار مخاطب ہو کر کہا "آپ کتابوں کا اتنا بوجھ اُٹھائے ہوئی ہیں ــــ لایئے مجھے دے دیجیے ــــ میرا تانگہ باہر موجود ہے۔ آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں گا۔"

سیما نے اپنی بھاری بھرکم کتابیں بغل میں دابتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا "آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ــــ بہرحال شکریہ ادا کیے دیتی ہوں۔"

شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا ــــ چند لمحات کے لیے وہ اپنی خفت مٹاتا رہا۔ اس کے بعد اُس نے سیما سے کہا "عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ــــ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا؟"

سیما کا لہجہ اور زیادہ خشک ہو گیا "عورتوں کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہو گی ــــ مگر فی الحال مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ــــ آپ کی پیش کش کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں ــــ اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟"

یہ کہہ کر سیما چلی گئی۔ شہزادہ سلیم جو انار کلی کے خواب دیکھ رہا تھا، آنکھیں جھپکتا رہ گیا۔ اُس نے بہت بُری طرح شکست کھائی تھی۔ اس سے قبل اُس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آ چکی تھیں، جو اُس کے ابرو کے اشارے پر چلتی تھیں ــــ مگر یہ سیما کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو ــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت ہے۔ جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ حسین ہے، مگر مجھے ٹھکرا دینا ــــ یہ بہت بڑی زیادتی ہے ــــ میں ضرور اس سے بدلہ لوں گا ــــ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

شہزادہ سلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی اسکیمیں بنائیں۔ مگر بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ اُس نے یہاں تک سوچا کہ اُس کی ناک کاٹ ڈالے۔ وہ یہ جُرم کر بیٹھتا، مگر اُسے سیما کے چہرے پر یہ ناک بہت پسند تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا مصوّر بھی ایسی ناک کا تصوّر نہیں کر سکتا تھا۔

سلیم تو اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہُوا، مگر تقدیر نے اُس کی مدد کی۔ اُس کی والدہ نے اُس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ نگاہِ انتخاب آخر سیما پر پڑی جو اُس کی سہیلی کی لڑکی تھی۔

بات پکّی ہوگئی، مگر سلیم نے انکار کر دیا۔ اِس پر اُس کے والدین بہت ناراض ہوئے۔ گھر میں دس بارہ روز تک ہنگامہ مچا رہا۔

سلیم کے والد ذرا سخت طبیعت کے تھے، انھوں نے اُس سے کہا "دیکھو، تمھیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔"

سلیم ہٹ دھرم تھا، جواب میں یہ کہا "آپ کا فیصلہ کوئی ہائی کورٹ کا فیصلہ نہیں ——— پھر میں نے کیا جُرم کیا ہے جس کا آپ فیصلہ سُنا رہے ہیں۔"

اُس کے والد کو یہ سن کر طیش آگیا "تمھارا یہ جُرم کہ تُم ناخلف ہو ——— اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ عدول حکمی کرتے ہو۔ میں تمھیں عاق کر دوں گا۔"

سلیم کا جوش تھوڑا سا ٹھنڈا ہو گیا "لیکن ابّا جان، میری شادی مرضی کے مطابق تو ہونی چاہیے۔"

"بتاؤ، تمھاری مرضی کیا ہے۔"

"اگر آپ ٹھنڈے دل سے سُنیں تو میں عرض کر دوں۔"

"میرا دل کافی ٹھنڈا ہے ——— تمھیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ ڈالو ——— میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔"

سلیم نے رُک رُک کے کہا "مجھے ——— مجھے ——— ایک لڑکی سے محبت ہے۔"

اُس کا باپ گرجا "کس لڑکی سے؟"

سلیم تھوڑی دیر ہچکچایا "ایک لڑکی ہے۔"

"کون ہے وہ؟ ——— کیا نام ہے اُس کا؟"

"سیما ——— میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔"

میاں افتخار الدین کی لڑکی؟"

جی ہاں، اُس کا نام سیما افتخار ہے ——— میرا خیال ہے وہی ہے۔"

اُس کے والد بے تحاشہ ہنسنے لگے "خیال کے بچّے ——— تمھاری شادی اسی لڑکی سے قرار پائی ہے ——— کیا وہ تمھیں پسند کرتی ہے؟"

سلیم بوکھلا سا گیا ——— یہ سلسلہ کیسے ہو گیا، اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہیں اُس کا باپ جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا؟ ——— سلیم سے جو سوال کیا گیا تھا اس کا جواب اُس کے والد کو نہیں ملا تھا، چنانچہ انھوں نے کڑک کر پوچھا "سلیم مجھے بتاؤ کیا سیما

تمھیں پسند کرتی ہے؟"

سلیم نے کہا "جی نہیں"۔

"تم نے یہ کیسے جانا؟"

"اُس سے —— اُس سے ایک بار میں نے مختصر الفاظ میں —— محبت کا اظہار کیا —— لیکن اُس نے مجھے ——" تمھیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔"

جی ہاں —— بڑی بے رُخی برتی۔"

سلیم کے والد نے اپنے گنجے سر کو تھوڑی دیر کے لیے کھجلایا اور کہا "تو پھر یہ رشتہ نہیں ہونا چاہیے —— میں تمھاری ماں سے کہتا ہوں کہ وہ لڑکی والوں سے کہہ دے کہ لڑکا رضامند نہیں۔"

سلیم ایک دم جذباتی ہو گیا "نہیں، ابا جان —— ایسا نہ کیجیے گا۔ شادی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ اور کسی کی محبت اکارت نہیں جاتی —— لیکن آپ لوگوں کو —— میرا مطلب ہے سیما کو یہ پتہ نہ لگنے دیجیے کہ اُس کا بیاہ مجھ سے ہو رہا ہے، جس سے وہ بے رُخی اور بے اعتنائی کا اظہار کر چکی ہے۔"

اُس کے باپ نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا "میں اس کے متعلق سوچوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے کہ اُنھیں ایک ٹھیکیدار سے رشوت وصول کرنا تھی۔ اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کے سلسلے میں۔

شہزادہ سلیم، جب رات کو پلنگ پر سونے کے لیے لیٹا تو اُسے انار کی کلیاں ہی کلیاں نظر آئیں۔ ساری رات وہ اِن کے خواب دیکھتا رہا۔

گھوڑے پر سوار باغ میں آیا ہے —— شاہانہ لباس پہنے۔ اسپِ تازی سے اُتر کر باغ کی ایک روش پر جا رہا ہے کیا دیکھتا ہے کہ سیما انار کے بوٹے کی سب سے اونچی شاخ سے ایک نوخیز کلی توڑنے کی کوشش کر رہی ہے —— اُس کی بھاری جلد کتابیں زمین پر بکھری پڑی ہیں —— زُلفیں اُلجھی ہوئی ہیں۔ اور وہ اُچک اُچک کر اُس شاخ تک اپنا ہاتھ پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے، مگر ہر بار ناکام رہتی ہے۔

وہ اُس کی طرف بڑھا۔ انار کی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر اُس نے اُس شاخ کو پکڑا اور جھکا دیا۔ سیما نے وہ کلی توڑ لی جس کے لیے وہ اتنی کوشش کر رہی تھی —— لیکن فوراً اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ شاخ نیچے کیسے جھک گئی۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ شہزادہ سلیم، اُس کے پاس پہنچ گیا۔ سیما گھبرا گئی، لیکن سنبھل کر اُس نے اپنی کتابیں اُٹھائیں اور بغل میں داب لیں، انار کلی اپنے جوڑے میں اُڑس لی اور یہ خشک الفاظ کہہ کر وہاں سے چلی گئی "آپ کی امداد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں —— بہرحال شکریہ ادا کیے دیتی ہوں۔"

تمام رات وہ اسی قسم کے خواب دیکھتا رہا۔ سیما اس کی بھاری بھرکم کتابیں، انار کی کلیاں اور شادی کی دھوم دھام۔

شادی ہو گئی۔ شہزادہ سلیم نے اس تقریب پر اپنی انار کلی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پائی تھی۔ وہ اُس لمحے کے لیے تڑپ رہا تھا

جب تیما اس کی آغوش میں ہوگی۔ وہ اُس کے اتنے پیارے گال کو دونٹنگ اگر رونا شروع کر دے گی۔

سلیم کو رونے والی لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ اُس کا یہ فلسفہ تھا کہ عورت جب رو رہی ہو تو بہت حسین ہو جاتی ہے۔ اُس کے آنسو شبنم کے قطروں کے مانند ہوتے ہیں جو مرد کے جذبات کے پھولوں پر ٹپکتے ہیں جن سے اُسے ایسی راحت، ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔

رات کے دس بجے دولہن کو حجلۂ عروسی میں داخل کر دیا گیا۔ سلیم کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ اُس کمرے میں جا سکتا ہے۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور رسم و رسوم سب ختم ہو گئی تھیں۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔

پھولوں سے سجی ہوئی مسہری پر دولہن گھونگھٹ کاڑھے ریشم کی گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ شہزادہ سلیم نے خاص اہتمام کرایا تھا کہ پھول، انار کی کلیاں ہوں ——— وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسہری کی طرف بڑھا، اور دولہن کے پاس بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک وہ اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کر سکا ——— اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی بغل میں کتابیں ہوں گی جن کو وہ اٹھانے نہیں دے گی۔ آخر اُس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اُس سے کہا "سیما ———"

یہ نام لیتے ہی اُس کی زبان خشک ہو گئی۔ لیکن اُس نے پھر جرأت فراہم کی اور اپنی دولہن کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دیا اور بھونچکا رہ گیا ——— یہ تیما نہیں تھی، کوئی اور ہی لڑکی تھی ——— انار کی ساری کلیاں، اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ مرجھا گئی ہیں۔

(یکم جون ۱۹۵۴ء)

کمیشن

دروازہ کھلتا ہے۔ چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور
اعلان کرتا ہے۔

چوبدار۔ باادب، باملاحظہ ہوشیار۔ نظریں رُوبرو۔ شہنشاہِ عالم لنچ کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔
شہنشاہِ عالم کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ
تشریف لاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ ہیڈ بٹلر کہاں ہے؟

چوبدار ایک بہت بڑی ڈش پر سے سرپوش اُٹھاتا ہے ہیڈ بٹلر پھدک کر باہر نکلتا
ہے اور فرشی سلام عرض کرتا ہے۔

ہیڈ بٹلر۔ غلام سیلوٹ بجا لاتا ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ دسترخوان پر مابدولت کے کیا کیا چیز حاضر ہے؟

ہیڈ بٹلر۔ گوشت پلاؤ۔ ماہی پلاؤ۔ مٹر پلاؤ۔ نارنگی پلاؤ۔ متنجن۔ بریانی۔ زردہ۔ روغن جوش۔ قورمہ۔ ٹماٹر گوشت۔ بھنڈی گوشت۔
مٹر گوشت۔ پائے کا شوربہ۔ قیمہ بھیجا چکن کٹلس۔ پوٹیٹو کٹلس۔ چکن چاپس۔ مٹن چاپس۔ پوٹیٹو چاپس —— اور خدا
جہاں پناہ کو سلامت رکھے —— ارہر کی دال۔

شہنشاہ۔ (غصّے میں) ارہر کی دال مابدولت کو بالکل پسند نہیں۔

ہیڈ بٹلر۔ یور میجسٹی —— آج لنچ پر تین اشتراکی ولایتوں کے وزیراعظم مدعو ہیں —— اس لیے ——

شہنشاہ۔ (خوش ہو کر) مابدولت تمھاری فراست کی داد دیتے ہیں اور خوش ہو کر تمھارا منہ موتیوں سے بھر دینے کا حکم جاری کرتے ہیں۔

ہیڈ بٹلر۔ میری سانس رُک جائے گی عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ (مسکرا کر) تم بہت ذہین ہو —— اچھا مابدولت تمھیں ہر کا خطاب عنایت فرماتے ہیں۔

ہیڈ بٹلر۔ جہاں پناہ کی اس قدر افزائی نے ذرّے کو آفتاب بنا دیا۔

شہنشاہ۔ اور کس صفائی سے —— ہینگ لگی نہ پھٹکڑی

ہیڈ بٹلر۔ غلام سیلوٹ بجا لاتا ہے یور میجسٹی۔

دروازہ کھلتا ہے — چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا
کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار۔ باادب، باملاحظہ۔ ہوشیار۔ نظریں رُوبرو۔ باادب باملاحظہ، ہوشیار۔ نظریں رُوبرو — ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

چھوٹے چھوٹے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے — ملکۂ عالیہ کی سواری
آتی ہے۔

ملکہ۔ جہاں پناہ کو زیادہ دیر تو میرا انتظار نہیں کرنا پڑا؟ — میں اپنی خادماؤں کے سر میں جُوئیں ڈلوا رہی تھی۔

شہنشاہ۔ کیوں؟

ملکہ۔ رعایا کے لیے میں ایک بلڈ بینک کھولنا چاہتی ہوں۔

شہنشاہ۔ امورِ سلطنت سے تمھاری یہ دلچسپی مابدولت کے لیے باعثِ مسرت ہوئی۔

ہیڈ بٹلر۔ رعایا کتنی خوش نصیب ہے کہ آپ ایسا مخلص بادشاہ اور آپ ایسی مخلص ملکہ اُس پر حکمران ہیں۔

شہنشاہ۔ پہلے یونہی مشہور تھا کہ فلاں بادشاہ کے راج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے — لیکن ہمارے راج میں ایسے کئی گھاٹ موجود ہیں جہاں شیر اور بکریاں اکٹھے پانی پیتے ہیں اور اس کو حلقۂ امکان میں لانے کے لیے مابدولت کو تمام شیروں کے دانت نکلوانے اور تمام بکریوں کے سینگ کٹوانے پڑے۔

ہیڈ بٹلر۔ اس میں کیا شک ہے۔

گھنٹی کی آواز آتی ہے

شہنشاہ۔ (چونک کر) یہ کس نے ہمیں بلایا — یہ کون فریادی ہے، جس نے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر کو جنبش دی؟

ملکہ۔ جہاں پناہ، کیا اسی وقت جھروکے میں تشریف لے جائیں گے؟

شہنشاہ۔ اسی وقت، اسی گھڑی۔ جب تک ہم اس فریادی کی فریاد نہیں سُن لیں گے، ارہر کی دال ہم پر حرام۔ ہم ابھی جھروکے میں جا کر فریادی سے ملاقات کریں گے — ضرور اُس پر کوئی ظلم ہوا ہے۔

چوبدار تین مرتبہ مرمریں فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار — نظریں رُوبرو — شہنشاہِ عالم فریادی کی فریاد سننے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ، ملکہ اور ہیڈ بٹلر تینوں جھروکے میں تشریف لے جاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ یہ کون تھا جس نے ہمارے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر ہلائی اور ہمارا انصاف چاہا۔

فریادی۔ یہ غلام انصاف کا طالب ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ تمھارے ساتھ پورا انصاف ہوگا فریادی — دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا ہمارا کام ہے۔

فریادی۔ عالم پناہ۔ آج کل ایک سیر دودھ میں صرف دو قطرے دودھ کے ہوتے ہیں، باقی سب پانی ہوتا ہے۔

شہنشاہ۔ مطمئن رہو فریادی۔ دودھ کے یہ دو قطرے بھی علیحدہ کر کے دکھا دیے جائیں گے ــــ بولو ــــ بے خوف و خطر ہو کے بولو کہ تمھیں کس نے ایذا پہنچائی ہے ــــ کیا ملکۂ عالم کے پستول سے تمھاری بیوی ......

فریادی۔ نہیں عالی جاہ۔ ملکۂ عالم کے پستول سے میری بیوی ہلاک نہیں ہوئی۔

شہنشاہ۔ تاریخ نے، اس کا مطلب ہے خود کو نہیں دہرایا ــــ یہ بھی ایک بہت بڑی بات ہے ــــ بولو، تم کام کیا کرتے ہو؟

فریادی۔ عالم پناہ کے سایے تلے اس غلام نے ایک بہت بڑی لانڈری کھول رکھی ہے۔

شہنشاہ کپڑے گھاٹ پر تم دھوتے ہو؟

فریادی۔ نہیں عالم پناہ ــــ یہ ذلیل کام میں نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔

شہنشاہ۔ ایسا ہی ہونا چاہیے ــــ اب تمھیں کیا دکھ پہنچا ہے؟

فریادی۔ جہاں پناہ۔ مجھے بہت بڑا دکھ پہنچا ہے ــــ میرے پاس الفاظ نہیں جو بیان کر سکوں۔

شہنشاہ۔ ہوں (تھوڑی دیر غور و فکر کرنے کے بعد) فریادی تم کوئی فکر نہ کرو ــــ ہم الفاظ کا بندوبست کر دیتے ہیں ہیڈ بٹلر!

ہیڈ بٹلر۔ غلام حاضر ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہم نے سر کے خطاب سے تمھیں سرفراز کیا تھا۔

ہیڈ بٹلر۔ غلام اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کر چکا ہے۔

شہنشاہ۔ اب خود کو اس قدر افزائی کا حق دار ثابت کرو۔ ہم تمھیں وزیر الفاظ کا رتبہ بخشتے ہیں تاکہ تم اس فریادی کی فریاد کو مناسب و موزوں الفاظ میں ترتیب دے کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

ہیڈ بٹلر۔ غلام اس فرض سے سبکدوش ہونے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

شہنشاہ۔ تم مطمئن ہو فریادی؟

فریادی۔ میں بالکل مطمئن ہوں عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ وزیر الفاظ جاؤ۔ فریادی کی فریاد رپورٹ کی صورت میں پیش کرو۔

ہیڈ بٹلر۔ کام کی اہمیت کے پیش نظر غلام ایک ماہ کی مہلت کے لیے درخواست کرتا ہے۔

شہنشاہ۔ مابدولت دو ماہ کی مہلت عطا فرماتے ہیں۔

ہیڈ بٹلر۔ شکریہ!

فریادی۔ شکریہ۔

دروازہ کھلتا ہے چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار۔ باادب، باملاحظہ —— ہوشیار —— نظریں رُوبرو —— شہنشاہ عالم دو مہینے کے بعد لانڈری والے کیس کے متعلق ہیڈ بٹلر المعروف وزیرِ الفاظ کی رپورٹ سُننے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ جھروکے میں تشریف لاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ وزیرِ الفاظ۔ لانڈری والے فریادی کی رپورٹ موزوں و مناسب الفاظ میں تیار ہوئی۔

ہیڈ بٹلر۔ دو مہینے کی مسلسل محنت و مشقت اور عرق ریزی کے بعد یہ ہیچمدان ایک کروڑ الفاظ کی رپورٹ تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے جو پبلک کی آگاہی کے لیے سرکاری پریس میں چھپ رہی ہے۔

شہنشاہ۔ فریادی —— وزیرِ الفاظ کے اس کام سے کیا تم مطمئن ہو؟

فریادی۔ قطعی طور پر عالی جاہ —— کام بڑے سلیقے سے ہو رہا ہے۔

شہنشاہ۔ وزیرِ الفاظ —— ہم تھوڑے عرصے کے لیے تمھیں وزیرِ خلاصہ بنا کر اس رپورٹ کا ملخص پُوچھنا چاہتے ہیں، جو پبلک کی آگاہی کے لیے پریس میں چھپ رہی ہے۔

ہیڈ بٹلر۔ رپورٹ کا اصل خلاصہ یہ ہے عالم پناہ —— فریادی ایک بہت بڑی لانڈری کا مالک ہے۔ اس لانڈری میں تمام کپڑے صابن سے نہیں، کسی اور ہی چیز سے دھوئے جاتے ہیں، جس کا نسخہ صرف فریادی ہی جانتا ہے۔

فریادی۔ یہ نسخہ سینہ بسینہ چلا آ رہا ہے عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ خُوب!

ہیڈ بٹلر۔ ڈرائی کلیننگ کے کام میں بھی فریادی پٹرول استعمال نہیں کرتا۔

فریادی۔ غلام پٹرول کا سارا کوٹا بلیک مارکیٹ میں بیچ دیتا ہے۔

شہنشاہ۔ بہت خُوب۔

ہیڈ بٹلر۔ فریادی کی لانڈری میں ساڑھے سات سو دھوبی کام کرتے ہیں۔ اِن کو سینہ بہ سینہ چلنے والے اصول کے مطابق تنخواہ ملتی ہے جو مغلیہ بادشاہوں کے عہد میں دھوبیوں کو ملا کرتی تھی۔ فریادی نے چار مہینے ہوئے محسوس کیا کہ اُس کے یہ تنخواہ پانے والے اس کا صابن کھا رہے ہیں۔

شہنشاہ۔ فریادی نے یہ کیسے محسوس کیا۔

فریادی۔ ان کا رنگ دن بدن اُجلا ہو رہا تھا جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ درست!

ہیڈ بٹلر۔ انھوں نے صابن کھانے ہی پر اکتفا نہ کی —— اُس غریب کا پٹرول پینا بھی شروع کر دیا۔

شہنشاہ۔ فریادی —— پٹرول پینے کے متعلق کیسے معلوم ہُوا؟

فریادی۔ عالم پناہ —— ان کی دھوآں دھار تقریروں نے غمازی کی۔

شہنشاہ۔ درست۔

ہیڈ بٹلر۔ اپنے تنخواہ پانے والے ملازمین کی اس بلا خوری اور بلانوشی سے تنگ آکر فریادی نے ایک اور کپڑے سکھانے کے لیے اُن کو اُس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں شہزادیاں چاندماری سیکھتی ہیں۔

شہنشاہ۔ (فکرمند ہو کر) والاشان شہزادیوں نے ان بے گناہوں کو ہلاک کر دیا؟

ہیڈ بٹلر۔ ایسا ہی ہوا جہاں پناہ ——— شہزادیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ وہ ساڑھے سات سو دھوبی جنگلی انسانوں کی وہ کھیپ جو والاشان شہزادیوں کا نشانہ درست کرنے کے لیے ہر ہفتے فراہم کی جاتی ہے۔

شہنشاہ۔ دھوبیوں اور جنگلی انسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ہیڈ بٹلر۔ عالم پناہ کا ارشاد بالکل صحیح ہے ——— ساڑھے سات سو دھوبیوں کے لواحقین چنانچہ فریادی کو اُن کی ہلاکت کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔

فریادی۔ غلام کا قصور صرف اتنا ہے جہاں پناہ کہ اُس نے تنگ آکر اُن کو اُس میدان کی طرف بھیج دیا جہاں والاشان شہزادیاں نشانہ درست کرتی ہیں ——— لیکن ان کی افسوسناک ہلاکت کے بعد جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ غیر ارادی طور پر اس غلام نے جہاں پناہ کو انصاف کرنے کا ایک بہت ہی اچھا موقع فراہم کر دیا ہے۔

شہنشاہ۔ غور کرنے کے بعد مابدولت بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں ——— تاریخ میں اس سے پہلے جہانگیر کو ایسے موقعے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن ہم عہدِ جدید کے شہنشاہ ہیں ——— جہانگیری عدل فی زمانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ——— خون کا بدلہ صرف خون ہے۔

ہیڈ بٹلر۔ کیا والاشان شہزادیاں، خاکم بدہن ———

شہنشاہ۔ وزیر الفاظ، ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دو۔

چوبدار تین مرتبہ فرش پر لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

آدرار۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار ——— نظریں رُوبرو۔ ملکہ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکہ عالیہ گی سنہری بال کھولے ہوئے آتی ہے

ملکہ۔ جہاں پناہ ——— یہ میں کیا سُن رہی ہوں۔

شہنشاہ۔ خُون کا بدلہ خون ——— ہماری مملکت کے ہر در و دیوار سے یہی صدا آرہی ہے۔ خون کا بدلہ خون۔ کوئی خوں بہا نہ ہوگا

ملکہ۔ جہاں پناہ!

ہیڈ بٹلر۔ عالم پناہ!!

فریادی۔ ساڑھے سات سو دھوبیوں کے، گیتی پناہ، خُون کا بدلہ خون نہیں چاہتے ——— فی دھوبی پانچ روپے کافی ہیں۔

شہنشاہ۔ نہیں ——— مابدولت اپنے دامنِ عدل پر جہانگیر کی طرح کوئی دھبہ نہیں لگنے دیں گے ——— خُون کا بدلہ خون ہے ———

خوُں بہا نہیں —— وزیر الفاظ والاشان شہزادیوں کی تعداد کیا ہے ؟

ہیڈ بٹلر۔ پچھلے برس کے اعداد و شمار کے مطابق والاقدر شہزادیوں کی تعداد ایک سو بیس تک پہنچی تھی۔

ملکہ۔ ان میں میری کوئی دختر نیک اختر شامل نہیں —— پھر بھی جہاں پناہ سے درخواست کرتی ہوں کہ ——

شہنشاہ۔ ہمیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو ملکہ —— خوُن کا بدلہ خوُن ہے۔

فریادی۔ جہاں پناہ —— اُن ساڑھے سات سو دھوبیوں میں خوُن کا صرف ایک قطرہ تھا۔

شہنشاہ۔ تمھیں کیسے معلوم ہے ؟

فریادی۔ ان کا سارا خوُن نچوڑ کر میں نے صرف ایک ایک قطرہ باقی چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ ان میں زندگی کی رمق باقی رہے۔

شہنشاہ۔ مابدولت کی نگاہِ عدل میں خوُن کے قطرے اور خوُن کے ایک سمندر میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے پیشتر کہ رجعت پسند قوتیں ہمیں گمراہ کریں۔ مملکت کے طول و عرض میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے سے اعلان کر دیا جائے کہ ہم لانڈری والے کیس کا فیصلہ کرنے میں اپنی مثالی غیر جانبداری برتیں گے —— خوُن کا بدلہ خوُن ہے —— اس میں کوئی شک نہیں کہ والاشان شہزادیوں کی رگوں میں ہمارا نیلا خوُن دوڑ رہا ہے۔ لیکن اسے دھوبیوں کے سُرخ خوُن کا بدلہ دینا ہوگا —— ہر چہار اکناف اعلان کر دیا جائے کہ مابدولت نے اس سنگین مقدمے کا فیصلہ مرتب کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے۔

ہیڈ بٹلر۔ کمیشن ؟

ملکہ۔ کمیشن ؟ ؟

فریادی۔ کمیشن ؟ ؟ ؟

شہنشاہ۔ ہاں —— کمیشن —— یہ کمیشن ملک کے چار بڑے دھوبیوں۔ وہ سب سے بڑے ڈرائی کلینروں اور چھ خطاب یافتہ سرکاری لوگوں پر مشتمل ہوگا —— ہیڈ بٹلر جس کو ہم نے پہلے سر کا خطاب عنایت فرمایا تھا اور بعد میں وزیر الفاظ بنا دیا تھا۔ اس کمیشن کا صدر ہوگا۔

ہیڈ بٹلر۔ غلام سے اتنا بڑا کام سرانجام نہیں دیا جا سکے گا یور میجسٹی۔

شہنشاہ۔ مابدولت کو اس کا علم ہے —— تمھاری صدارت میں تحقیقاتی کمیشن جونہی اپنی رپورٹ مرتب کرے گا۔ عوام کو کافی تشفی کے لیے مابدولت اس کمیشن پر ایک اور کمیشن بٹھا دیں گے۔ تاکہ عدل و انصاف کی نگاہ سے کوئی گوشہ، کوئی کونہ پوشیدہ نہ رہے۔

ہیڈ بٹلر۔ عالم پناہ عوام کی تشفی پھر بھی نہیں ہوگی —— انکار اُن کی سرشت میں داخل ہے۔

شہنشاہ۔ (فکر مند ہو کر) عوام کی تشفی بہت ضروری ہے —— سب سے مقدم ہے۔ ہم اُس وقت تک کوئی فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں، جب تک اس معاملے میں ہماری تشفی نہ ہو کہ عوام ہماری طرف سے بالکل متشفی ہیں

—— ہوالشافی کہہ کر چنانچہ ہم سب سے پہلے، سب سے ضروری کمیشن بٹھاتے ہیں —— اس کا نام شافی کمیشن ہوگا۔

ہیڈ ٹبلر۔ عالم پناہ زندہ باد۔

ملکہ ۔ عدل و انصاف زندہ باد!!

فریادی ۔ شافی کمیشن جو ئندہ باد۔

(۲ جون ۱۹۵۴ء)

سیّاہ حاشیے

فسادات کے بارے میں منٹو نے جن جن لطیف باتوں کو دیکھا اور سُنا انھیں بھی قلمبند کر دیا تھا۔

جُوتا

ہجوم نے رُخ بدلا اور سر گنگا رام کے بُت پر پل پڑا۔ لاٹھیاں برسائی گئیں، اینٹیں اور پتھر پھینکے گئے۔ ایک نے مُنہ پر تارکول مل دیا۔ دوسرے نے بہت پُرانے جُوتے جمع کیے اور اُن کا ہار بنا کر بُت کے گلے میں ڈالنے کے لیے آگے بڑھا۔ اور پولیس آگئی اور گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔

جُوتوں کا ہار پہنانے والا زخمی ہو گیا۔ چنانچہ مرہم پٹی کے لیے اُسے سر گنگا رام ہسپتال بھیج دیا گیا۔

O

حلال اور جھٹکا

"میں نے اس کی شہ رگ پر چھُری رکھی۔ ہولے ہولے پھیری اور اس کو حلال کر دیا۔"

"یہ تم نے کیا کیا؟"

"کیوں؟"

"اس کو حلال کیوں کیا؟"

"مزا آتا ہے اس طرح۔"

"مزا آتا ہے کے بچے، تجھے جھٹکا کرنا چاہیے تھا ——— اس طرح۔"

اور حلال کرنے والے کی گردن کا جھٹکا ہو گیا۔

O

رعایت

"میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔"

"چلو اسی کو مان لو ——— کپڑے اُتار کر ہانک دو ایک طرف۔"

O

آرام کی ضرورت

"مرا نہیں ——— دیکھو ابھی جان باقی ہے۔"

"رہنے دو یار ——— میں تھک گیا ہوں۔"

---

(۳)

منٹو کی کہانیوں، ڈراموں اور مضامین کا انتخاب

(یہ انتخاب بھی منٹو کا ہے)

جب میرے اور منٹو کے درمیان منٹو نمبر چھاپنے کی بات چیت ہوئی تھی تو میں نے کچھ منتخب تخلیقات کی شمولیت پر بھی زور دیا تھا۔ اس وقت انھوں نے جن جن کہانیوں کے نام بتائے تھے، وہی پیش کی جا رہی ہیں سوائے "نیا قانون" "شہید ساز" اور "سیاہ حاشیے" کے چند لطیفوں کے۔

(محمد طفیل)

ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چُور، گھر کو واپس گیا تھا —— وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اُس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اُس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اُس داروغہ سے وصول کیے تھے اُس کی چُست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اُوپر کو اُبھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اُتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکّے کھنکھنانے لگتے اور اُس کی کھنکھناہٹ اُس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھُل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکّوں کی چاندی پگھل کر اُس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے!

اُس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اُس برانڈی کے باعث تھی جس کا اَدھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اُس بیوڑا کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پلنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جُدا ہو جائے —— دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت اُبھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے نُچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سُوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اُوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتّا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتّے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اُڑے ہوئے تھے، دُور سے اگر کوئی اس کتّے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پُرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سُرخی ہونٹوں کی سُرخ بتّی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ غالباً اپنے جُوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اُڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کُرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے

کی بہت بُری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اُوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے، جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا اِدھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی۔ جو تازہ اور سُوکھے ہوئے پھُولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اُتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوارگیر پر، جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا، تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا۔ جس کی لَو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوارگیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دُور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھُوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اُس کی چھاتیاں چونکہ کافی اُبھری ہوئی تھیں، اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی، محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پُونے سے چھُٹی لے کر آتا تو اُسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلّال نے بتایا تھا۔ اُس نے جب یہ سُنا تھا کہ مادھو پُونے سے آکر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا ـــــ اس سالے کو تُو نے کب سے یار بنایا ہے؟ ـــــ یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے! ـــــ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اُڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے ـــــ سوگندھی! مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے ـــــ سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رام لال دلّال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصّوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ سوگندھی کو بتایا ـــــ "سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر ـــــ تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اُتار کرے جائے گا وہ تیری ماں کا یار! ـــــ اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر، اور جب وہ یار آیا کرے تو اُس سے کہا کر ـــــ "تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا مُنہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا، بھُوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں ـــــ سمجھیں؟ بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان ـــــ اس سالی کانگرس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سُونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جُون میں چلا جاؤں۔"

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اُس سے کہا تھا۔ نیچے سے ان بم کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو ان کی سختائی ٹھیک رہے گی۔"

سوگندھی یہ سُن کر ہنس دی "جمنا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تُو تو سمجھتی

ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا ـــــ کوئی مُوا لگائے تو ایسی، ویسی جگہ ہاتھ ـــــ ارے ہاں کل کی بات تُجھے سناؤں رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا ـــــ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھادی ـــــ ارے وہ تو ڈرنے لگا! ـــــ سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اُس کا سارا ٹھاٹھ کِرکرا ہوگیا! ـــــ وہ ڈر گیا! میں نے کہا، چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو، تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ آئے گا ـــــ بولا ـــــ روشنی کرو ـــــ روشنی کرو ـــــ میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا ـــــ بولا لائٹ ـــــ لائٹ! ـــــ اس کی بھنچی ہوئی آواز سُن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی!" ـــــ اور یہ کہہ کر میں نے اُس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی ـــــ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کردی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی، اور کہا، تجھے شرم نہیں آتی مردوے!" ـــــ وہ پلنگ پر آیا تو میں اُٹھی اور لپک کر لائٹ بجھادی! ـــــ وہ پھر گھبرانے لگا ـــــ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی، کبھی اندھیرا! کبھی اُجالا کبھی اُجالا، کبھی اندھیرا ـــــ ٹرام کی کھڑکھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اُٹھ بھاگا ـــــ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا ـــــ جمنا، تو بالکل الھڑ ہے، بڑے بڑے گُر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لیے!"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گُر یاد تھے جو اُس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی ـــــ "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اُس سے خوب شرارتیں کرو، اَن گنت باتیں کرو، اُسے چھیڑو، ستاؤ، اُس کے گدگدی کرو، اُس سے کھیلو ـــــ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو، پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ ـــــ اُس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے ـــــ وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی ـــــ ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن ـــــ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!"

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی، جتنی خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اُس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گُر جو اُسے یاد تھے اس کے دماغ سے پھسل کر اُس کے پیٹ میں آجاتے تھے جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں ـــــ ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اُسے ایسا لگا تھا کہ اُس کے خارش زدہ کُتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنادیے ہیں ـــــ جب جب کوئی کُتیا بڑی بے اعتنائی سے اُس کے پالتو کُتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دُور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی۔ لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات ـــــ کوئی کومل بول ـــــ اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا، مگر اُس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بہت بُری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے ـــــ ایسی تھکن جو انھیں جھنجھوڑ کر ـــــ اُنھیں مار کر سُلانے پر مجبور کردے! ایسی نیند جو تھک کر چُور چُور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے ـــــ وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہوجانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آنند دیتی ہے! ـــــ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو! اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا کہ تم ہوا میں بہت اُونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اُوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں

ہوا، بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا! اور پھر اس میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزا دیا کرتی تھی!

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے! یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی ——— کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا ——— بس یونہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے بے شمار گر یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی!

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا "سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔" اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے ——— پریم ——— کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے! اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے ——— یا پھر خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود میں سلا دے!

پریم کر سکنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چاروں مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی۔ جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ——— ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا ——— سوگندھی ——— تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یونہی اس کے دن بیتتے چلے جائیں، اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے اور مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لیے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی! یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا۔ اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو

چھپاتا گیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں! ——— سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا تھا۔ "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟ ——— اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ ——— چھی چھی چھی ——— دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ——— اب ان ساڑھے سات روپلیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ——— مجھے عورت چاہیے پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیے؟ ——— مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں ——— تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں ——— بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے، تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں ——— تو بھی ان کا بجنا سُن رہی ہے اور میں بھی تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ——— کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری ——— پُونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا، تین چار دن کے لیے ——— یہ دھندا چھوڑ ——— میں تجھے خرچ دیا کروں گا ——— کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ——— ؟"

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اُس کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا ——— "سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا ——— اور پانی کا گھڑا ——— دیکھا، کتنا میلا ہے اور یہ ——— یہ چیتھڑے ——— یہ چندیاں ——— اُف کتنی بُری باس آتی ہے، ——— اُٹھا کے باہر پھینک ان کو ——— اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ——— اور ——— اور ——— "

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اُس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اُس کا ایک گھر ہے جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے، کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا "دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے ——— ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں"۔ مادھو کتنا اچھا تھا۔ اُس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اُس نے سوگندھی کو ——— اسے محسوس ہونے لگا کہ اُسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں سے سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پُونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا "دیکھ سوگندھی! اگر تُو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی ——— اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا ——— دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پُونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ——— ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا......"

نہ مادھو نے کبھی پُونہ سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے، کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا "تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تُو نے؟" اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پُوچھا تھا "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے۔ جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں" ——— دونوں جُھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے ——— لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اُوف کرنا وہ بھول گئی تھی۔ اس کے سر کے اُوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اُس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی ——— رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اُٹھ بیٹھی ——— دو مِلی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے مُنہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیسدار تھا۔ دھوتی کے پلّو سے اُس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جُھک کر اُس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اُس کا کُتّا سُوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اُٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اُس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹاغٹ پی کر اُس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ "رام لال؟"

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنّا کر کہنے لگا۔ "تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟" ——— پھر آواز دبا کر اُس نے ہولے سے کہا۔ "اندر کوئی ہے تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا "نہیں" ——— تو رام لال کی آواز پھر اُونچی ہو گئی۔ "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟" ——— بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اُتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ——— اب تو میرا مُنہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اُتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ ——— باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ——— چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اُٹھا کر اُس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا "رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔"

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مُڑ کر کہا۔ "تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔"

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دُور کر دی "وہ بات نہیں رام لال! ——— ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں ——— بہت پی گئی۔"

رام لال کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ "تھوڑی بچی ہو تو لا ——— ذرا ہم بھی منہ کا مزا ٹھیک کر لیں۔"

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ "بجائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا ـــ دیکھ رام لال، ادھر جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اُسے اندر ہی لے آؤ۔"

رام لال نے جواب دیا۔ "نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں، وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے ـــ تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کی نکڑ تک چل ـــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جبکہ اُس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا کبھی قبول نہ کرتی۔ مگر اُسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اُس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اُس عورت کو جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا۔ لیکن اُس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی سوگندھی نے کل ہی اُس کو ڈھارس دی تھی اور اُس سے کہا تھا۔ "بہن تو چنتا نہ کر، میرا مرد پونے سے آنا ہی والا ہے۔ میں اُس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔" مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اُٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اُس نے دھوتی اُتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سُرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی، بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے، پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث اُن کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی ـــ سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اُسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور چرس کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ "لیجیے وہ آ گئی ـــ بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کیے۔" ـــ پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سوگندھی ادھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اُس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے "اونہہ" نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جا وہ جا .....

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اُس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھُسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس "اونہہ" کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اُس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟ ..... کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی "پسند نہیں کیا تجھے؟ ——— اچھا بھئی میں چلتا ہوں دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیے۔" یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اُس کی بانہوں میں، اُس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں ہے وہ موٹر ——— کہاں ہے وہ سیٹھ ——— تو "اونہہ" کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا ——— اس کی......

گالی اُس کے پیٹ کے اندر سے اُٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رُک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی اُس کی دُم کی سُرخ بتی اُس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال لال انگارہ "اونہہ" ہے جو اُس کے سینے میں برمے کی طرح اُترا چلا جا رہا ہے۔ اُس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے "او سیٹھ ——— او سیٹھ ——— ذرا موٹر روکنا اپنی ——— بس ایک منٹ کے لیے۔" پر وہ سیٹھ تھڑی ہے اُس کی ذات پر بہت دُور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑھی اور اُس کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بُری معلوم ہوتی وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اُڑا دے کیونکہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر "اونہہ، اونہہ" کر رہی تھی۔

گالوں پر اُس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سُرخی جب اُسے خیال آیا کہ یہ سنگار اُس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اُسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دُور کرنے کے لیے اُس نے کیا کچھ نہ سوچا ——— "میں نے اس موئے کو دکھانے کے لیے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا یہ تو میری عادت ——— میری کیا سب کی یہی عادت ہے ——— پر ——— پر ——— ——— یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور ——— یہ بازار ——— اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک" ——— یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اُس کی حدِ نگاہ تک فضا میں اِدھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑپھڑاہٹ اُسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اُس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اُس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اُس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اُسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اُس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور اُن کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اُوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُس کا انگ انگ دُکھنے لگے۔ اُس کے سر میں درد ہو، اُس کی ٹانگوں میں درد ہو، اُس کے پیٹ میں درد ہو، اُس کی بانہوں میں درد ہو، ——— ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اُس کے دل میں کچھ ہوا ——— کیا یہ درد تھا؟ ——— ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا ——— یہ کیا تھا؟..... لعنت! یہ تو وہی "اونہہ" تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اُٹھتے ہی تھے کہ رُک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اُسے میری شکل ہی پسند نہیں آئی ——— شکل کا تو اُس نے ذکر نہیں کیا۔ اُس نے تو یہ کہا تھا "سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا!" اُسے ——— اُسے ——— صرف میری شکل ہی

پسند نہیں آئی ——— نہیں آئی تو کیا ہوا؟ ——— مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی ——— وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا کتنی بُری شکل تھی اس کی ——— کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ ——— کیا مجھے اُبکائی آتے آتے نہیں رُک گئی تھی؟ ——— ٹھیک ہے پر سوگندھی ——— تُو نے اُسے دھتکارا نہیں تھا، تو اُسے ٹھکرایا نہیں تھا ——— اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے ——— اونہہ ——— اس "اونہہ" کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ ——— یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل ——— اونہہ ——— یہ منہ اور مسور کی دال ——— ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کے لایا ہے ——— اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تُو ——— دس روپے اور یہ عورت ——— خچر کیا بُری ہے . . . ."

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اُس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اُس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلّال پر جس نے رات کے دو بجے اُسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اُس کی آنکھیں، اُس کے کان، اُس کی بانہیں، اُس کی ٹانگیں، اُس کا سب کچھ مُڑتا تھا کہ اُس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے ——— اُس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو ——— صرف ایک بار . . . . . وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اُس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ "اونہہ" کی آواز آئے اور وہ ——— سوگندھی ——— اندھا دُھند اپنے دونوں پنجوں سے اُس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلّی کی طرح جھپٹے اور ——— اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اُس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے ——— بالوں سے پکڑ کر اُسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکّے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے ——— جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا کہ اُس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا "تم روتی کیوں ہو؟ تمھیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟" ——— آنکھوں کیا ہوا سوال چند لمحات تک اُن آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اُس خلا کو گھورتی رہی، جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ ——— یہ آواز کہاں سے آئی؟ ——— سوگندھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا ——— ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے ——— اُس کا دل ——— یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو! ——— آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے ——— اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا ——— بالکل اُس گھِسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رُک جاتا تھا۔ "رات کٹی گِن گِن تارے" کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اَٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا "کتنے سندر ہیں" ——— وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اُس نے سُندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اُس کے دماغ میں کُودا "یہ تارے سندر ہیں پر تُو کتنی بھونڈی ہے ——— کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گذرتے گذرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اُس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اُسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی اس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اُس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اُس سے ناخوش ہو کر گیا ہو ——— بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی، ایک نوجوان لڑکا اُس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اُس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اُتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اُڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گذارنے کے لیے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا، اب اُس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اُسے اُس کے دس روپے واپس دے دیے تھے ——— "مجھ میں کیا برائی ہے؟"

سوگندھی نے یہ سوال ہر اُس چیز سے کیا جو اُس کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری ——— ان سب چیزوں کی طرف اُس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائیں جو اُس کے اُوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اُس کے اندر موجود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بُری نہیں اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کی تائید کرے ——— کوئی ——— کوئی ——— اُس وقت کوئی اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے "سوگندھی! کون کہتا ہے، تو بُری ہے، جو تجھے بُرا کہے وہ آپ بُرا ہے" ——— نہیں۔ یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا "سوگندھی تو بہت اچھی ہے!"

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اُسے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے اُن پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اُس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں "ماں" بن رہا تھا ——— وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ ——— اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اُس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے ——— اپنے گرم گرم گال اور اُس کی ساری سردی چُوس لے۔

تھوڑی دیر کے لیے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اُس کے آس پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے اور اُس کے اُوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیلے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں، اُس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کو ٹمٹمانا سمجھتی ہے ——— لیکن اُس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟ ——— وہ کیوں اپنے اندر اُس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے ——— اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے، اور جو کچھ اُس کے اندر اُبل رہا

ہے ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پھر یہ کیسے ہو ——— کیسے ہو؟

سوگندھی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی ——— ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اُس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اُس طرف اُٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اُسے کچھ نظر نہ آیا ——— اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ——— اور ———

"نہ آئے ——— بلا سے ——— میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں ——— گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردِ سری ہی تو ہے ——— چل سوگندھی گھر چل' ——— ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی، اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا ——— فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا ——— سیٹھ اور اُس موٹر کی ایسی تیسی ———"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے جس طرح پوجا کرنے کے بعد اُس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا۔ اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اُس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اُس کے دل میں اُٹھا اور درد کی طرح اُس کے رُویں رُویں پر چھا گیا ——— قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بُلا کر باہر بازار میں مُنہ پر روشنی کا جانٹا مار کر ایک آدمی نے اُس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اُس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اُسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ——— اُس سیٹھ نے ——— پرماتما کرے . . . . سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بددُعا دے مگر سوچا، بددُعا دینے سے کیا بنے گا مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اُس کے وجود کے ہر ذرے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ——— اُس کے مُنہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا ——— کپڑے پھاڑ کر اُس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی "یہی لینے آیا تھا نا تو؟ ——— لے دام دیے بنا لے جا اسے ——— پر جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ———"

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے، اگر اُس سیٹھ سے ایک بار ——— صرف ایک بار ——— اُس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے، نہیں، یہ نہیں یہ کرے ——— یُوں اُس سے انتقام لے، نہیں یُوں نہیں، یوں ——— لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اُس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اُسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی ——— بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اُس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی اُدھیڑ بُن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی! کُنڈے میں تالا نہیں تھا! سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کُنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا "آج تُو نے میرا کہا مان ہی لیا ——— صبح کی سیر

تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اس طرح صبح اُٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سُستی دُور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے ——— وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو ؟ ——— کیوں ؟

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصّہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصّہ لے ——— چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پُشت پر اُس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا ایک بہت بڑا دھبّہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی "میں آج تیرا انتظار ہی کر رہی تھی"۔

مادھو بڑا اپٹپایا۔ "انتظار ؟ ——— تجھے کیسے معلوم ہُوا کہ میں آج آنے والا ہوں"۔

سوگندھی کے بھنچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی "مَیں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا ——— اُٹھی تو کوئی بھی نہ تھا، سوجی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں...... اور ......"

مادھو خوش ہو کر بولا۔ "اور میں آ گیا ——— بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں، کسی نے ٹھیک کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہے ——— تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا ؟

سوگندھی نے جواب دیا "چار بجے کے قریب"۔

مادھو کرسی پر سے اُٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا "اور میں نے تجھے دو بجے سپنے میں دیکھا ——— جیسے تو پھولوں والی ساڑھی ——— ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے، تیرے ہاتھوں میں ——— کیا تھا تیرے ہاتھوں میں ! ——— ہاں تیرے ہاتھوں میں روپیوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تُو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا۔ مادھو، تو چنتا کیوں کرتا ہے ؟ ——— لے یہ تھیلی ——— ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں ؟ ——— سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اُٹھا اور ٹکٹ کٹا کر اِدھر کا رُخ کیا ——— کیا سُناؤں بڑی پریشانی ہے ! ——— بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو ——— انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے ——— تھک تو نہیں گئی تو ؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے ——— ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا"۔

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کا تکیہ بنا کر وہ اُن پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اور اُس لہجے میں جو اُس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی "مادھو، یہ کس مُوئے نے تجھ پر کیس کیا ہے ؟ ——— جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے ——— بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے ——— جان بچی لاکھوں پائے ——— بس بس اب جانے دے، تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے ——— مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سُنا ——— کیس کا نام سُنتے

ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے ـــــ واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اُس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا: "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑیگا ـــــ اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو ...... زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اُٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اُس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی۔ "ہمارا فوٹو اترے گا۔ ہمارا فوٹو اترے گا!" کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اُسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی ـــــ اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی۔ کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اُٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ "کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی۔ "اُس کی ـــــ منشی پال ٹ کے اس داروغہ کی ...... ذرا دیکھ تو اس کا تھوبڑا ـــــ کہتا تھا، ایک رانی مجھ پر عاشق ہوگئی تھی ـــــ اونہہ! یہ مُنہ اور مسور کی دال!" یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اُکھڑ آئی۔!

مادھو کی حیرت ابھی دُور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا: "رانی بھنگن کچرا اُٹھانے آئے گی تو میرے اِس راجہ کو بھی لے جائے گی۔"

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ اُن پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا۔ "ہی ہی ہی ......"

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ "اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے؟ ـــــ بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا ...... کیوں مادھو؟"

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور پھر ہنسا۔ "ہی ہی ہی ......"

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اُتاری اور دوسرا ہاتھ اُس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا جیسے ہاتھ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا "اچھا کیا؟ ——— مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا ——— پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کونسی چیز جو کسی کو پسند آسکتی ہے ——— یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سُوجے ہوئے نتھنے یہ تیرے مڑے ہوئے کان، یہ تیرے مُنہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟ ——— تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اُونہہ ..... پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اُس نے ..... آجکل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی بُرا ———"

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اُس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔ "دیکھ سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تُو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے ——— اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں ......"

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا "اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تُو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چُٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا ——— اس مہینے کا خرچ میں تجھے پُونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ——— ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔ "میں بتاتی ہوں ——— پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا ——— اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا ——— اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپلیوں میں مَیں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا، جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تُو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تُو لے ہی نہیں سکتا تھا ——— تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری ——— پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے، آج پچاس بج رہے ہیں تو بھی اُن کا بجناسُن رہا ہے اور میں بھی اُن کا بجناسُن رہی ہوں ——— یہ تُو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اُڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اُس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔ "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سُونگھا اور زمین پر پھینک دیا "یہ چیتھڑے، یہ چِندیاں ——— اُف کتنی بُری باس آتی ہے، اُٹھا کے باہر پھینک ان کو ....."

مادھو چلّایا۔ "سوگندھی!"

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔ "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟ ——— تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے روپے دے گی؟ یا تُو کوئی ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں ..... کُتّے، کمینے، مجھ پر رُعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری

ذلیل ہوں گیا! ——— بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟ ——— میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟ ——— چور یا گٹھ کترا؟ ——— اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟ ——— بلاؤں پولیس کو؟ ——— پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں ———"

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔ "سوگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

تیری ماں کا سر ——— تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا ——— بھاگ یہاں سے، ورنہ ———" سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی۔ "خبردار ——— پڑی رہنے دے وہیں ——— تو جا، تیرے پونہ پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی ——— اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا ——— ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے ——— جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے ...... یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا، اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پُر کرتی تھی، ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی!

(منٹو کے افسانے میں سے)

موذیل[1]

ترلوچن نے پہلی مرتبہ —— چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی —— رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، ترو تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا، کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا اور اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان —— محلے میں تھا۔ جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا، مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا ... غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا —— اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا۔ آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک مسلمان تھے۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ... مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لیے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا "نرنجن یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک

---

[1] یہ افسانہ سب سے پہلے نقوش ہی میں چھپا تھا۔ منٹو کے نمائندہ افسانوں کی صورت میں اسے دوبارہ نقوش میں پیش کیا جا رہا ہے

دَور سے گذر رہے ہیں۔ تمھارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہاں سے اُٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گذارہ کر لیا کرتا ہے ——— مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا الیکچرشن کو صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مُسکرا دیا۔ یار، تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ——— ہم نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں۔ بمبئی ہے ——— یہ بمبئی۔ تمھیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ——— بارہ برس سے۔"

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے۔ اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے، جیسے اس کے پاس چھو منتر ہے ——— یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ——— محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لیے اچھا تھا ——— وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگھر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کی بجائے کھنگھر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی ——— ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے ——— کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگھر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی۔ وہ گٹھاؤ۔ وہ مردانہ پن نہیں تھا، جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنھیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ——— لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سُنا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما، سنگاپور، ہانگ کانگ ——— پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی۔ جو بُری نہیں تھی ——— خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزارہا دیئے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے، وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موزیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بیحد پریشان ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی۔ جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ بانہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے۔ مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو موزیل باہر نکلی کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موزیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی —— ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موزیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موزیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی۔ بڑی بڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں اور۔۔

جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موزیل —— ساری موزیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

جب ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موزیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی۔ "یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے۔" اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنسائی کوری ڈوڑ سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موزیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی پیلرا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر سے گھڑکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں، وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں "گوڈے گوڈے" دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موزیل کے لیے پرتکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنّا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر جھنجوڑ کر اپنے اُن پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سردرد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی "تم سکھ ہو ——— یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں"۔

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا "کون سی نازک باتیں ——— تمہارے پرانے یاروں کی؟"

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو ——— ہاں وہ میرے یار ہیں ——— اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو"۔

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟"

موذیل کا زوردار قہقہہ لگاتی "تم سچ مچ سکھ ہو ——— ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ——— اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کرلو ——— میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا"۔

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہشمند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی حقیقت ہی نہیں تھی اسے خفیف ہونا پڑتا تھا مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردّعمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس لیے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی ——— پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا، لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب کہ موذیل موج میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا "موذیل ——— کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی، پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اُٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی"۔

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ——— "موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اُڑاتی ہو ——— یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے"۔

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا "تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ——— تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے ——— تم خوبصورت ہو"۔

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں

میں اپنے مونچھو بھرے ہونٹ پیوست کر دیے۔

موزیل نے ایک دم "بھوں بھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں —— تم تکلیف نہ کرو۔"

ترلوچن چلایا۔ "موزیل۔"

موزیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں "خدا کی قسم —— تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے —— ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں —— بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہو گی۔"

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موزیل بھی آ گئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی —— اس میں جو پنیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اُگی تھی تو واقعی لوگ اُس کے کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لیے تھے۔ اُس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موزیل سے پوچھا۔ "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مُسکرائی۔ "تمھارے بال بہت ملائم ہیں —— میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا —— ترلوچ —— تم یہ مجھے دے دو۔ میں انھیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی۔"

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موزیل سے مخاطب ہوا۔ "میں نے آج تک تمھارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا —— تم کیوں اُڑاتی ہو —— دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا —— میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے —— کیا تمھیں اس کا پتہ نہیں۔"

موزیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"پھر۔" ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کیے اور موزیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں —— میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اُٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ "میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔"

ترلوچن اُچھل پڑا۔ "سچ؟"

موزیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھُلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لیے چمکے۔ "ہاں!"

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی ڈاڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا تو ...... تو کب ؟"
موذیل الگ ہٹ گئی "جب —— تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے !"
ترلوچن اس وقت جو ہو سو ہو، بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا "میں کل ہی کٹوا دوں گا"
موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی "تم بکواس کرتے ہو ترلوچ —— تم میں اتنی ہمت نہیں ہے "
اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا "تم دیکھ لوگی"
"دیکھ لوں گی" اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور "پھوں پھوں" کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا —— وہ کن کن اذیتوں سے گذرا، اس کا تذکرہ فضول ہے۔ اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیے اور داڑھی بھی منڈوا دی —— یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس کی آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیرس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آ جائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکی۔ پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچن" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا —— موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا —— ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا۔ "نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔"

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے —— ایسے ہی چلتا ہے۔"

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "شادی کل ہوگی ؟"

"ضرور" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لیے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی

تھی۔ اس لیے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز ایکسپریس پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا ——— ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گذری؟ ——— یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا ———

"اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے ہیں اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو یک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کدکڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی وہ بے حیا تھی ——— بے مروّت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا، مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی "تم سکھ ہو ——— مجھے تم سے نفرت ہے!" ———

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گذارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لیے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی "یہ حیا ویا کیا بکواس ہے ——— اگر تمھیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو ——— تم مجھے یہ بتاؤ کہ کونسا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا ——— یا جس میں سے تمھاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں ——— مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ——— تم سکھ ہو ——— مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا

ہے ——— یہ بھی تمھاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمھارے مذہب میں شامل ہے ——— شرم آنی چاہیے تمھیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمھارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے!"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سُن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اُس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اُسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اُٹھائے اُٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رُک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اُس نے اِس کے متعلق سوچنا بند کر دیا ——— کرپال کور۔ ایک پاکیزہ لڑکی۔ جس سے اس کو محبت ہوئی تھی۔ خطرے میں تھی، وہ ایسے محلّے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں ——— لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلّے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا، مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری ——— اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ ——— بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں ——— آواز قریب آتی گئی۔ یک لخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ——— اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن، پانی کے نل پر سے اُٹھا۔ اس نے سوچا "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ——— اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟"

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی ——— اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کُرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ——— ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل اُبھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا۔ موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِّعمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منّی داڑھی دیکھنے لگی۔ "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن؟"

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پُشت رگڑی اور مسکرا کر کہا۔ "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلو سکرٹ صاف کر سکے ——— مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی "بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟"

ترلوچن اپنی پچھلی بے وقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ——— کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا۔ "بیمار رہی ہو؟"

"نہیں" موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں" موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی "تم گویا کہ ——— اب پھر ——— نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو؟"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ "ہاں!"

"مبارک ہو" موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اُتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔ "کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کر دی؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں!"

"مبارک ہو ——— اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں"

"یہ بہت بُری بات ہے" موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اُٹھی۔ "ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اُٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا "کیا اسی لڑکی نے تمھیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں"

ترلوچن بڑی اُلجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں اُلجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی "تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا ——— موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے، بدصورت ہے، بے وقوف ہے، بے مروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا "موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ——— جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔ "وہ مذہب کی پابند ہے تو تمھیں کیسے قبول کرے گی؟ —— کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟"

اس کو ابھی تک معلوم نہیں —— داڑھی میں نے تمھارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی —— محض انتقامی طور پر —— اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں —— مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔" ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی۔ "یہ بہت اچھا ہے ...... مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے —— دیکھا کس زور سے کاٹا ہے۔"

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی "کب ہو رہی ہے تمھاری شادی؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں۔" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔

"ترلوچن —— تم کیا سوچ رہے ہو؟"

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی۔ "تم اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو —— جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟"

"مشکل! —— موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں —— کسی بھی معاملے کی نزاکت —— تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو —— یہی وجہ ہے کہ تمھارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔ "افسوس بی ڈیمڈ —— سلی ایڈیٹ —— تم یہ سوچو کہ تمھاری اس ...... کیا نام ہے اس کا ...... اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے ...... تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے ...... تمھارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے —— تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو —— اور بہت ڈرپوک، مجھے نڈر مرد چاہیے ...... لیکن چھوڑو ان باتوں کو ...... چلو آؤ، تمھاری اس کور کو لے آئیں!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا —— ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا "کہاں سے؟"

"وہیں سے، جہاں وہ ہے —— میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں —— چلو آؤ میرے ساتھ۔"

"مگر سنو تو —— کرفیو ہے۔"

"موذیل کے لیے نہیں —— چلو آؤ۔"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے

لی تھی کہ رُک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

موذیل نے کہا "یہ تمھاری داڑھی ——— لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے ——— ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا نہ تم سکھ ہو۔

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔ "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا"

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لِٹ ٹھیک کی "تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ——— وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشاں نہیں کرنا چاہتا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری "تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو ——— گدھے کہیں کے...... اس کی جان کا سوال ہے ——— کیا نام ہے، تمھاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو۔

ترلوچن نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی "موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے ——— اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔

موذیل چڑھ گئی۔ "اوہ، تمھاری محبت بی ڈیمڈ ——— میں پوچھتی ہوں، کیا سارے سکھ تمھاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں ——— اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے ——— اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔"

ترلوچن نے کہا۔ "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو ——— مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلّے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ——— تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیے جاؤ گے۔"

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا "مجھے اس کی پروا نہیں ——— اگر میں تمھارے ساتھ وہاں جاؤں تو پگڑی پہن کر جاؤں گا ——— میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے ——— تمھاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے ——— تمھاری وہ ——— کیا نام ہے اس بھڑوی کا ——— جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا ——— تم سکھ ہو ——— خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچن بھنّا گیا۔ "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر

کہا۔ ڈارلنگ، چلو، جیسے تمھاری مرضی ——— جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ "تم کپڑے نہیں پہنو گی!"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ "نہیں ——— چلے گا اسی طرح۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اُتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اُتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اُتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کیے سگریٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر مُنہ بھر کے دھواں اُس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا۔ "تم بہت ذلیل ہو۔"

موذیل مسکرائی۔ "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی ——— اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے تمھارے کیس ہیں۔"

بازار بالکل سنسان تھا ——— ایک طرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گذرا ہے نہ گذرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اُتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اُتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لیے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگریٹ کا دھواں اُڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔ "اے ——— کدھر جا رہا ہے۔"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا۔ "اوہ، تم ——— ہم کو پہچانا نہیں تم نے ——— موذیل...... پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ "ادھر اس باجو ——— ہمارا بہن رہتا ہے، اس کی طبیعت خراب ہے ——— ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے......"

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیہ نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر اس کو دیا۔ "لو پیو ———"

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے مُنہ سے سُلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا۔ "ہیر از لائٹ!"

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف

چل دی —— جس میں سے گذر کر انھیں —— محلّے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے —— خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دُور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اُسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے ڈر ڈر کے ادھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رُک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اُس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا "ترلوچ ڈیر —— اس طرح ڈرنا اچھا نہیں —— تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا —— سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے، جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی، جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رُک گئی —— کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لحظے کے لیے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا "کوئی بات نہیں —— چلو آؤ۔"

دونوں چلنے لگے —— ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اُٹھائے چلا آ رہا تھا، ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا —— کہ موذیل آ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چُور ہے۔ اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا۔ "اے کیا کرتا ہے —— اپنے بھائی کو مارتا ہے —— ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔" پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ "کریم —— اُٹھاؤ، پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔"

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا "عیش کر سالی —— عیش کر۔" پھر اس نے پرات اُٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا۔ "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے!"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔ "کوئی ذلیل حرکت نہیں —— سب چلتا ہے ...... آؤ۔"

اور وہ تیز تیز چلنے لگی —— ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے۔ جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا "کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "تیسری گلی میں —— نکڑ والی بلڈنگ!"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ——— ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔ "ترلوچن ڈیئر ——— یہ پگڑی اتار دو!"

ترلوچن نے جواب دیا "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اُتار سکتا!"

موذیل جھنجلا گئی۔ "تمہاری مرضی ——— لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے؟"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ——— صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پُراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اُٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا۔ "دیکھو، ایسا کرو ——— میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ——— تم میرے پیچھے آنا ——— بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو ——— سمجھے ——— مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔"

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے ——— سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا۔ "کون سا مالا؟"

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "دوسرا۔"

"چلو۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اُس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبّے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دُور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دُور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی۔ "مہنگا سنگھ جی ——— مہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین آواز آئی۔ "کون؟"

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھُلا ——— ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے ——— موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ——— جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا

لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کُرتے کا دامن اُٹھا کر اُس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سُرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔ "ڈرو نہیں، ترلوچن تمھیں لینے آیا ہے۔"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔ "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ــــ اور ماتا جی سے بھی ــــ لیکن جلدی کرو۔"

اتنے میں اُوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی۔ "اسے پکڑ لیا انھوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا۔ "کسے؟"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔ "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ــــ تم یہ کپڑے اُتار دو۔"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیص اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ اُتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا آزار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اُتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی۔ "جاؤ، اسے لے جاؤ ــــ لیکن ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیے اور اس سے۔ "جاؤ ــــ جلدی نکل جاؤ۔"

ترلوچن نے اس سے کہا۔ "آؤ۔" مگر فوراً ہی رُک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوتے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑا پن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔"

"جہنم میں جائیں وہ ــــ تم اسے لے جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں آ جاؤں گی۔"

ایک دم اُوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اُترنے لگے۔ دروازے کے پاس آ کر انھوں نے کوٹنا شروع کر دیا، جیسے وہ اُسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف جھٹکا دے کر اُس نے ترلوچن سے کہا۔ "سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب میری

سمجھ میں آتی ہے —— میں دروازہ کھولتی ہوں ......"

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی: "دروازہ"

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی: "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں —— تم میرے پیچھے بھاگنا —— میں اُوپر چڑھ جاؤں گی —— تم بھی اُوپر چلے آنا —— یہ لوگ دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے ....."

ترلوچن نے پھر پوچھا "پھر؟"

موذیل نے کہا "یہ تمھاری —— کیا نام ہے اس کا —— موقع پا کر نکل جائے —— اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری —— سب بوکھلا گئے اُٹھ کر اس نے اُوپر کی سیڑھیوں کا رُخ کیا۔ ترلوچن اُس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی —— کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی —— وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا —— اُوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ اُلجھتی وہ نیچے آ رہی —— پتھریلے فرش پر

ترلوچن ایک دم نیچے اُترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خُون بہ رہا تھا۔ مُنہ سے خون بہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اردگرد جمع ہو گئے —— کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی "موذیل —— موذیل۔"

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اُتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے مُنہ میں خون کے بلبلے اُڑاتے ہوئے کہا۔ "جاؤ، دیکھو —— میرا انڈر ویئر وہاں ہے کہ نہیں —— میرا مطلب ہے وہ ....."

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اُٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا۔ "تم سچ مچ سکھ ہو ...... جاؤ دیکھ کر آؤ۔"

ترلوچن اُٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "یہ میاں بھائی ہے ..... لیکن بہت دادا قسم کا ..... میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔"

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے ..... موذیل نے اطمینان کا سانس لیا —— لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اُس کے مُنہ سے بہ نکلا۔ "اوہ ڈیم اِٹ ....." یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اَٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ "آل رائٹ ڈارلنگ —— بائی بائی۔"

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی۔ "لے جاؤ اس کو —— اپنے اس مذہب کو۔" اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بےحس ہو کر گر پڑا

(ترشک کے کنارے میں سے)

ممی

نام اس کا مسز سٹیلا جیکسن تھا مگر سب اُسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی پنشن سٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔

وہ پونہ میں کیسے آئی کب سے وہاں تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دراصل میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات سے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون وابستہ ہے، اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ وہ پونہ کے ہر ذرّے سے وابستہ تھی ہو سکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو مگر پونہ میرے لیے وہی پونہ ہے، اور اس کے وہی ذرّے، اس کے تمام ذرّے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں اور ممی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات پونے ہی میں ہوئی...... میں نہایت سُست الوجود انسان ہوں۔ یوں تو سیر و سیاحت کی بڑی بڑی امنگیں میرے دل میں موجود ہیں۔ آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھیں گا کہ میں عنقریب کنچن جنگا یا ہمالہ کی اسی قسم کے نام کی کسی اور چوٹی کو سر کرنے کے لیے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کر کے وہیں کا ہو رہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب پونے گیا تو بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اُس کو مرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں...... ٹھہریئے میں حساب لگاؤں...... آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آٹھ برس سے بمبئی میں تھا۔ مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا وکٹوریہ گارڈنز اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا اس کے مالکوں سے ایک نکمّی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ تکدر دُور کرنے کے لیے پُونہ آؤں۔ وہ بھی اس لیے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے پربھات نگر جانا تھا جہاں میرا فلموں کا ایک پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دُور ہے۔ مگر اُس وقت ہم ٹانگہ لے چکے تھے۔ سُست رو چیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے۔ مگر میں اپنے دل سے کدورت دُور کرنے کے لیے آیا تھا اس لیے مجھے پربھات نگر پہنچنے میں کوئی عجلت نہیں تھی۔ ٹانگہ بہت واہیات قسم کا تھا علی گڑھ کے یکّوں سے بھی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چلتا ہے اور سواریاں پیچھے۔ ایک دو گرد سے اٹے ہوئے بازار افتاں و خیزاں طے ہوئے تو میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ دھوپ تیز ہے۔ میں نے جو اور ٹانگے دیکھے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہو گا جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں نے اس سے اختلاف نہ کیا۔ سب

نہ سمجھا —— دھوپ واقعی تیز تھی۔

گھوڑا ایک فرلانگ آگے بڑھا ہوگا کہ پاس سے اسی جونق ٹائپ کا ایک ٹانگہ گزرا میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا۔ "اوئے منٹو کے گھوڑے!"

میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا ردِعمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہے عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جھریاں پاؤڈر اور روج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آرہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوئی تھی۔

چڈے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ "اوئے منٹو کے گھوڑے" کے جواب میں یقیناً میں نے بھی کچھ اسی قسم کا نعرہ بلند کیا ہوتا، مگر اس عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری ساری بے تکلفی جھریاں ہوگئی۔

میں نے اپنا تانگہ رکوا لیا۔ چڈے نے بھی اپنے کوچوان سے کہا کہ ٹھیر جائیے۔ پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہوکر انگریزی میں کہا "ممی جسٹ اے منٹ" تانگے سے کود کر وہ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا۔ "تم؟ —— تم یہاں کیسے آئے" پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری پُر تکلف بیوی سے ملاتے ہوئے کہا "بھابی جان —— آپ نے کمال کر دیا —— اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں"

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم جا کہاں رہے ہو؟"

چڈے نے اونچے سروں میں کہا۔ "ایک کام سے جا رہا ہوں —— تم ایسا کرو، سیدھے......" وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو صاحب کو ہمارے گھر لے جاؤ —— کرایہ ورایہ مت لینا ان سے" ادھر سے فوراً ہی فارغ ہو کر اس نے نمٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا۔ "تم جاؤ۔ نوکر وہاں ہوگا —— باقی تم دیکھ لینا"

اور وہ پھدک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا جس کو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آپڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کا تانگہ چل پڑا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین یا چار فرلانگ چل کر وہ ایک ڈاک بنگلہ نما قسم کی عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا۔ "چلیے صاحب......"

میں نے پوچھا۔ "کہاں؟"

اس نے جواب دیا۔ "چڈہ صاحب کا مکان یہی ہے"

"اوہ" میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیوروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڈے کے مکان کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو وہ پونہ ہی کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پینے پلانے والے دوست مل جائیں گے۔ مکدر دور کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود ہے، اس لیے دن رات اڑے گی —— میں تانگے سے اتر

گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا وہ میں نے اُٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا "چلو!"

غالباً تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے حیل وحجت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ چل پڑی۔

بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا تھا۔ تھوڑی دیر اُسے استعمال کیا اور چھوڑ کر چلتے بنے۔ چونے اور گچ کا کام بڑا کچا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کنوارے کا ہو سکتا ہے، جو فلموں کا ہیرو ہو اور ایسی کمپنی میں ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر تیسرے مہینے ملتی ہے۔ اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو بیوی ہو، ایسے گندے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی۔ مگر میں نے یہ سوچا تھا کہ چڈہ آجائے تو اس کے ساتھ ہی پربھات نگر چلیں گے۔ وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی قہر درویش بر جانِ درویش دو تین دن گزار سکتی تھی۔

نوکر بھی عجیب لاابالی آدمی تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے۔ مگر وہ موجود نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے، اور اسی طرح بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر ہمیں دیکھے بغیر پاس سے گذر گیا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکٹر ہے جو چڈہ کے ساتھ رہتا ہے۔ پر جب میں نے اس کے نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذاتِ شریف چڈہ صاحب کے چہیتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا مگ الماری کے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا۔ "رات ایک درجن گلاس صاحب نے منگوائے تھے۔ معلوم نہیں کدھر گئے۔"

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شکستہ مگ کی طرف اشارہ کیا "کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں؟"

تیل لینے جانا، بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی، مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوکھلا گیا "نہیں صاحب میں...... تلاش کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔"

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا مگ واپس الماری کے نیچے اس انداز سے رکھا کہ جیسے وہی اس کی جگہ تھی۔ اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چڈے کا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں چڈہ آگیا وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے مہمان ہیں اور اس لحاظ سے ہماری خاطر داری اس پر لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی سے اس نے مجھ سے کہا "ویٹ از ویٹ —— تو تم آگئے اولڈ بوائے —— چلو ذرا اسٹوڈیو تک ہو آئیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی۔۔

...... آج شام کو ......" میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رُک گیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا "بھائی جان، کہیں آپ نے اِسے مولوی نہیں بنا دیا" پھر اور زور سے ہنسا "مولویوں کی ایسی تیسی، اُٹھو منٹو۔ بھابی جان یہاں بیٹھتی ہیں، ہم ابھی آجائیں گے۔"

میری بیوی جل کر پہلے کوئلہ تھی تو اب بالکل راکھ ہو گئی تھی۔ میں اُٹھا اور چڈہ کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افراتفری میں مہتہ جی کے سر چڑھ کے چڈے نے مبلغ دو سو روپے وصول کیے اور پون گھنٹے میں جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اُسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کباڑ خانے سے ملتا جلتا تھا اس میں جو چیز تھی حیرت انگیز طریقے پر ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب مل کر ایک سالمگی اختیار کر گئی تھیں۔

ہر شے گرد آلود تھی، اور اس کی آلودگی میں ایک ضروری پن تھا جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی بوہیمی فضا کی تکمیل کے لیے لازمی تھی۔ چڈے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا "چین کے شہزادے ...... دو بوتلیں تھرڈ کلاس رم کی لے آؤ ——— میرا مطلب ہے تھری ایکس رم کی اور نصف درجن گلاس۔"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین ہی کا نہیں، دُنیا کے ہر بڑے مُلک کا شہزادہ تھا۔ چڈے کی زبان پر جس مُلک کا نام آجاتا، وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا تھا ——— اس وقت کا چین کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔

چڈے نے ٹوٹے ہوئے سپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس رم کے استقبال میں چٹخارتے ہوئے کہا۔

"ویٹ از ویٹ ——— ٹو آفنزآل تم اِدھر آہی نکلے ——— لیکن ایک دم متفکر ہو گیا "یار بھابی کا کیا ہو ...... وہ تو گھبرا جائے گی۔"

چڈہ بغیر بیوی کے تھا، مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا، وہ کہا کرتا تھا "یہ احساس کمتری ہے جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا ہے تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں۔ لیکن بعد میں یہ سوچ کر میں بیوی کے قابل نہیں ہوں ساری تیاری کولڈ سٹوریج میں ڈال دیتا ہوں۔"

رم فوراً ہی آگئی گلاس بھی چڈے نے چھ منگوائے تھے اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ لقایا تین راستے میں ٹوٹ گئے تھے۔ چڈے نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس نے کنوارے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا "تمہارے پُونے آنے کی خوشی میں۔"

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیے۔

دوسرا دَور شروع کر کے چڈہ اُٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ کر آیا کہ میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا "میں شور کرتا ہوں ان کی نیند کھل جائے گی ——— پھر ایسا کریں گے ...... ٹھہرو ——— پہلے میں چائے منگواتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نوکر کو آواز دی "جمیکا کے شہزادے۔"

جمیکا کا شہزادہ فوراً ہی آگیا۔ چڈے نے اُس سے کہا "دیکھو، ممّی سے کہو ایک دم فسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے۔

——— ایک دم!"

نوکر چلا گیا۔ چڈے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پگ ڈال کر کہا "میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پگ مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھابی کو چھوڑنے تمہارے ساتھ پربھات نگر جانا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آگئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چڈے نے ٹی کوزی اُٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرت کا اظہار کیا۔ "ممّی! از لائے جیول ..... !" پھر اس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسنا شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان بلبلا اُٹھے۔ اس کے بعد اُس نے ٹرے اُٹھائی اور مجھ سے کہا "آؤ۔"

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چڈے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مؤدبانہ کہا۔ "حاضر ہے، بیگم صاحب!"

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہ آیا۔ لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا اس لیے اُس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں ان سے اس کو کچھ فرحت پہنچی۔ اور اُس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں۔"

میں نے جواب نہ دیا مگر چڈے نے جھک کر بڑے ایماندارانہ طور پر کہا ...... "جی ہاں، یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے۔ لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی۔"

میری بیوی مسکرائی تو کھلکھلا کے ہنسا۔ "ہم دونوں بہت اُونچی نسل کے سُور ہیں ..... جن پر ہر حرام شے حلال ہے! چلیے، اب ہم آپ کو مسجد تک چھوڑ آئیں!"

میری بیوی کو پھر چڈے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چڈے ہی سے نفرت تھی، بلکہ یوں کہیے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی اور چڈہ بالخصوص اُسے بہت کھلتا تھا، اس لیے کہ وہ بعض اوقات بے تکلفی کی حدود بھی پار کر جاتا تھا، مگر چڈے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرا خیال ہے اُس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک اِن ڈور گیم سمجھتا تھا جو لُڈو سے کہیں گنا لایعنی ہے۔ اُس نے میری بیوی کے جلے بھنے تیوروں کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی۔ "کبابستان کے شہزادے ——— ایک عدد ٹانگہ لاؤ۔ رولز رائس قسم کا۔"

کبابستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چڈہ۔ وہ غالباً دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ تخلیہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کباب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جایا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ اُن کو گزر جانے دیا جائے۔ لیکن حسبِ معمول اُس نے میری اس فیلسوفانہ نصیحت کو پلّے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کبابستان کا شہزادہ رولز رائس قسم کا ٹانگہ لے کر آگیا۔ ہم پربھات نگر روانہ ہو گئے۔

بہت ہی اچھا ہُوا کہ میرا فلموں کا پُرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی، چڈے نے میری بیوی اُس کے سپرد کی اور کہا۔ "خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ بیوی، بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے، یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "چلو منٹو، اسٹوڈیو میں تمہارے دوست کو پکڑیں۔"

چڈہ کچھ ایسی افراتفری مچا دیا کرتا تھا کہ مخالف قوّتوں کو سمجھنے سوچنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اُس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا اور میری بیوی سوچتی ہی رہ گئی۔ تانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا۔ "یہ تو ہو گیا

——اب کیا پروگرام ہے ؟" پھر کھلکھلا کر ہنسا۔" ممی — گریٹ ممی !"
میں اُس سے پُوچھنے ہی والا تھا، یہ ممی کس توتیخ آموں کی اولاد ہے کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر طبعی موت مر گیا۔

تانگہ واپس اُس ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹیج تھا، مگر چڈہ اس کو کبیدہ کاٹیج کہتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں رہنے والے سب کے سب کبیدہ خاطر رہتے ہیں " حالانکہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کاٹیج میں کافی آدمی رہتے تھے حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اُسی فلم کمپنی میں ملازم تھے جو مہینے کی تنخواہ ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی اور وہ بھی کئی قسطوں میں ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائرکٹر، کوئی اس کا نائب، کوئی نائب در نائب ہر دوسرا، کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا، مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیزیں بھی جو تھوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یہ لوگ بلیک مارکٹ سے خریدتے تھے۔ پکچر ضرور دیکھتے تھے۔ ریس کا موسم ہو تو ریس کھیلتے تھے ورنہ سٹہ جیتتے شاذ و نادر تھے، مگر ہارتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لیے موٹر گراج بھی رہائش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی۔ شیریں نام کی ایک عورت تھی جس کا خاوند شاید، محض یکسانیت توڑنے کے لیے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نہیں تھا وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا۔ معلوم نہیں، وہ کب آتا تھا — اور کب جاتا تھا، کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا —— شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کو سعیدہ کاٹیج کے تمام ساکن فرصت کے اوقات میں پیار کرتے۔ شیریں جو قبول صورت تھی اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کاٹیج کا معتزز حصہ چڈے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا۔ یہ دونوں بھی ایکٹر تھے، مگر ہیرو نہیں تھے۔ ایک سعید تھا جس کا فلمی نام رنجیت کمار تھا —— چڈہ کہا کرتا تھا سعیدہ کاٹیج اسی خرذات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورنہ اس کا نام کبیدہ کاٹیج ہی تھا۔" خوش شکل تھا اور بہت کم گو۔ چڈہ کبھی کبھی اُسے کچھوا کہا کرتا تھا، اس لیے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اُسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدر آباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں یہاں چلا آیا تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر اس دوران میں اُس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لیے تھے، وہ بھی چڈے کے لیے کہ اُس پر ایک بڑے خونخوار پٹھان کے قرض کی ادائیگی لازم ہو گئی تھی۔ ادب لطیف قسم کی عبارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اُس کا شغل تھا کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کاٹیج کا ہر شخص اُس کا مقروض تھا۔

شکیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور برعکس نام نہند نام زنگی باکافور کی ضرب المثل کے ابطال کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

بڑے تین، یعنی چڈہ، سعید اور غریب نواز شیریں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تینوں اکٹھے گراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پُرسی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ تینوں کالج کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے تو ان میں سے ایک اُٹھ کر گراج میں چلا جاتا اور کچھ دیر بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات چیت کرتا رہتا۔ باقی دو اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔

جو اسسٹنٹ قسم کے لوگ تھے وہ شیریں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ کبھی بازار سے اُس کو اُس کو سودا سلف لا دیا، کبھی لانڈری میں اُس کے کپڑے دُھلنے دے آئے اور کبھی اُس کے روتے بچّے کو بہلا دیا۔

ان میں سے کبیدہ خاطر کوئی بھی نہ تھا۔ سب کے سب مسرور تھے، شاید اپنی کبیدگی پر۔ وہ اپنے حالات کی ناسا عدت کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و فرحاں انداز میں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔

ہم کالج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز صاحب باہر آ رہے تھے۔ چڈے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے بغیر گنے اُس نے کچھ غریب نواز کو دیے اور کہا۔ "چار بوتلیں اسکاچ کی چاہئیں کمی آپ پوری کر دیجیے گا، بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے۔"

غریب نواز کے حیدرآبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ چڈہ کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اُس نے غریب نواز سے کہا۔ "یہ منٹو کن ڈیڑھ ہیں...... لیکن ان سے ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ رَم پیتے ہیں۔ شام کو اسکاچ آ جائے تو...... لیکن آپ جائیے۔"

غریب نواز چلا گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ چڈے نے زور کی جمائی لی اور رَم کی بوتل اُٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ اُس نے روشنی میں مقدار کا سرسری اندازہ کیا اور نوکر کو آواز دی۔ "قزاقستان کے شہزادے"۔ جب وہ نمودار ہوا تو اُس نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا۔ "زیادہ پی گیا ہے، کم بخت!"

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکر مند ہو گیا۔ "یار، بھائی کو تو خواہ مخواہ یہاں لائے ——— خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔" پھر اُس نے خود ہی اپنے کو تسکین دی۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ بور نہیں ہوں گی وہاں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی"۔ اور میں نے اپنے گلاس میں رَم ڈالی جس کا ذائقہ پسے ہوئے گُڑ کی طرح تھا۔

جس کباڑ خانے میں ہم بیٹھے تھے اُس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جن سے باہر کا غیر آباد حصہ نظر آتا تھا۔ اِدھر سے کسی نے باآواز بلند چڈہ کا نام لے کر پکارا۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ میوزک ڈائرکٹر وَن کٹر رہے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس نسل کا ہے۔ منگولی ہے، حبشی ہے، آریہ ہے، یا کیا بلا ہے۔ کبھی کبھی اُس کے کسی خد و خال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر پہنچنے ہی والا ہوتا تھا کہ اُس کے تقابل میں کوئی ایسا نقش نظر آ جاتا کہ فوراً ہی نئے سرے سے غور کرنا پڑ جاتا تھا۔ ویسے وہ

مرہٹہ تھا۔ مگر شیواجی کی تیکھی ناک کے بجائے اس کے چہرے بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی ہوئی چپٹی ناک جو اُس کے خیال کے مطابق اُن سردں کے لیے بہت ضروری تھی جن کا تعلق براہِ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو چلایا "منٹو — منٹو سیٹھ ہے؟" چڈے نے اُس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا "سیٹھ کی ایسی تیسی ...... چل اندر آ۔"

وہ فوراً اندر آ گیا۔ اپنی جیب سے اُس نے ہنستے ہوئے رم کی ایک بوتل نکالی، اور تپائی پر رکھ دی، میں سالا اُدھر ممی کے پاس گیا۔ وہ بولا، تمہارا فرینڈ آئے لا ...... میں بولا سالا یہ فرینڈ کون ہونے کو سکتا ہے ...... سالا معلوم نہ تھا سالا منٹو ہے۔"

چڈے نے ون گُترے کے کدو ایسے سر پر ایک دھول جمائی۔ اب چپک کر سلے کے ...... تو رم لے آیا ...... بس ٹھیک ہے۔" ون گُترے نے اپنا سر سہلایا اور میرا خالی گلاس اُٹھا کر اپنے لیے پیگ تیار کیا "منٹو ...... یہ سالا آج ملتے ہی کہنے لگا۔ آج پینے کو جی چاہتا ہے ...... میں ایک دم کڑکا ...... سوچا کیا کروں ......"

چڈے نے ایک اور دھپا اُس کے سر پر جمایا "بیٹھ بے، جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہوگا۔"

"سوچا نہیں تو سالا یہ اتنی بڑی باٹلی کہاں سے آیا — تیرے باپ نے دیا مجھ کو؟" ون گُترے نے ایک ہی جرعے میں رم ختم کر دی۔ چڈے نے اُس کی بات سُنی ان سُنی کر دی اور اُس سے پوچھا۔ "تو یہ تو بتا کہ ممی کیا بولی؟ — پولی تھی؟ — موزیل کب آئے گی؟ ...... ارے ہاں ...... وہ پلیٹنم بلونڈ!"

ون گُترے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا، مگر چڈے نے میرے بازو پکڑ کر کہنا شروع کر دیا "منٹو — خدا کی قسم کیا چیز ہے — سُنا کرتے تھے ایک شے پلیٹنم بلونڈ بھی ہوتی ہے۔ مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا — بال ہیں، جیسے چاندی کے مہین مہین تار ...... گریٹ — خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ ...... ممی زندہ باد!" پھر اُس نے قہر آلود نگاہوں سے ون گترے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا "کن گُترے کے بچے — نعرہ کیوں نہیں لگاتا — ممی زندہ باد!"

چڈے اور ون گُترے دونوں نے مل کر "ممی زندہ باد" کے کئی نعرے لگائے اس کے بعد ون گترے نے چڈے کے سوالوں کا پھر جواب دینا چاہا مگر اُس نے اُسے خاموش کر دیا۔ "چھوڑو یار — میں جذباتی ہو گیا ہوں ...... اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں جنہیں کالی گھٹا سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے ...... مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے —" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "منٹو — بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اُس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں ...... چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا — معلوم نہیں پلیٹنم کا رنگ کیسا ہوتا ہے، کیونکہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی ...... کچھ عجیب ہی سا رنگ ہے ...... فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے ......"

ون گترے نے دوسرا پیگ ختم کیا "اور اُس میں تھوڑی سی تھری ایکس رم مکس کر دی جائے۔"

چڈے نے بھنا کر اس کو ایک فربہ اندام گالی دی — "بکواس نہ کر" پھر اس نے بڑی رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا "یار ...... میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں ...... ہاں ...... وہ رنگ ...... خدا کی قسم لاجواب رنگ ہے ...... وہ تم نے دیکھا ہے ...... وہ جو مچھلیوں کے پیٹ پر ہوتا ہے ...... نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے ...... پومفریٹ مچھلی ...... اُس کے وہ

کیا ہوتے ہیں؟ ...... نہیں نہیں ...... سانپوں کے ...... وہ ننھے ننھے کپھرے ...... ہاں کپھرے ...... بس اُن کا رنگ ...... کپھرے ...... یہ لفظ مجھے ایک ہندستوڑے نے بتایا تھا ...... اتنی خوبصورت چیز اور ایسا واہیات نام ...... پنجابی میں ہم انھیں پچانے کہتے ہیں۔ اس لفظ میں چپچپاہٹ ہے ...... وہی ...... بالکل وہی جو اُس کے بالوں میں ہے ...... ننھی ننھی سینپولیاں معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں ......" وہ ایک دم اُٹھا۔ سنپولیوں کی ایسی تیسی میں جذباتی ہو گیا ہوں۔

وِن کُترے نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

چڈے نے جواب دیا۔ "سنٹی منٹل ...... لیکن تو کیا سمجھے گا، بالاجی باجی راؤ اور نانا فرنویس کی اولاد ......"

وِن کُترے نے اپنے لیے ایک اور پگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ سالا چڈہ سمجھتا ہے، میں انگلش نہیں سمجھتا ہوں۔ میٹری کولیٹ ہوں ...... سالا میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا ...... اُس نے ......"

چڈے نے چڑ کر کہا۔ "اُس نے مجھے تان سین بنا دیا ...... تیری ناک مروڑ دی کہ نکوڑے سر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں ...... بچپن ہی میں اُس نے مجھے دھرپد گانا سکھا دیا تھا۔ اور دودھ پینے کے لیے تومیاں کی ٹوڑی میں رویا کرتا تھا اور پیشاب کرتے وقت اُڑانہ میں ...... اور تو نے پہلی بات پٹ دیپکی میں کی تھی۔ اور تیرا باپ ...... جگت اُستاد تھا۔ تجو باوڑے کے بھی کان کاٹتا تھا ...... اور تو آج اس کے کان کاٹتا ہے، اس لیے تیرا نام کن کُترے ہے!" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "منٹو ...... یہ سالا جب بھی پیتا ہے، اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے ...... وہ اس سے محبت کرتا تھا تو مجھ پر اُس نے یہ احسان کیا ہے اور اُس نے اُسے میٹریکولیٹ بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی اے کی ڈگری پھاڑ کے پھینک دُوں۔"

وِن کُترے نے اس پوچھاڑ کی مدافعت کرنا چاہی مگر چڈے نے اُس کو وہیں دبا دیا۔ "چپ رہ ...... میں کہہ چکا ہوں کہ سنٹی منٹل ہو گیا ہوں ...... ہاں، وہ رنگ ...... پومفریٹ مچھلی کے ...... نہیں نہیں — سانپ کے ننھے ننھے کپھرے ...... بس اسی کا رنگ ...... ممی نے خدا معلوم اپنی بین پر کونسا رنگ بجا کر اس ناگن کو باہر نکالا ہے؟"

وِن کُترے سوچنے لگا۔ "پیٹی منگاؤ، میں بجاتا ہوں۔"

چڈہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ "بیٹھ بے میٹری کولیٹ کے چاکولیٹ ......" اُس نے رَم کی بوتل میں سے رَم کے باقیات اپنے گلاس میں انڈیلے اور مجھ سے کہا۔ "منٹو، اگر پلیٹینم بلونڈ نہ پٹی تو مسٹر چڈہ ہمالیہ پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر دھونی رما کر بیٹھ جائے گا ......" اور اُس نے گلاس خالی کر دیا۔

وِن کُترے نے اپنی لائی ہوئی بوتل کھولنی شروع کی۔ "منٹو، لگی ایک دم جانگی ہے ......"

میں نے کہا۔ "دیکھ لیں گے۔"

"آج ہی ...... آج رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں، یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئے اور شری ایک سو آٹھ دھنا جی نے تمہاری وجہ سے وہ ایڈوانس دے دیا ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی ...... آج کی رات ......" چڈے نے بڑے بھونڈے سُروں میں گانا شروع کر دیا۔

آج کی رات ساز دردِ نہ چھیڑ!

ڈن کٹرے بیچارہ اُس کی زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب نواز اور رنجیت کمار آ گئے۔ دونوں کے پاس اسکاچ کی دو دو بوتلیں تھیں۔ یہ انھوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت کمار سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے، مگر بے تکلف نہیں اس لیے ہم دونوں نے تھوڑی سی، "آپ کب آئے"، "آج ہی آیا"، ایسی رسمی گفتگو کی اور گلاس ٹکرا کر پینے میں مشغول ہو گئے۔

چڈہ واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اُس پلیٹینم بلونڈ کا ذکر لے آتا تھا۔ رنجیت کمار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب نواز نے اسکاچ کے تین پگ پیے تھے۔ نشے کے معاملے میں اُن سب کی سطح اب تک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لیے میرے جذبات معتدل تھے۔ میں نے اُن کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں اس نئی لڑکی پر بہت بُری طرح فریفتہ تھے جو مس نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس نایاب دانے کا نام فی لس تھا۔ پونے میں کوئی ہیئر ڈریسنگ سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اُس کے ساتھ عام طور پر ایک ہیجڑہ نما لڑکا رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب نواز تو یہاں تک اُس پر گرم تھا کہ وہ حیدرآباد میں اپنے حصے کی جائداد بیچ کر بھی اس داؤں پر لگانے کے لیے تیار تھا۔ چڈے کے پاس ترپ کا صرف ایک پتا تھا، اپنا قبول صورت ہونا ڈن کٹرے کا بزعم خود یہ خیال تھا کہ اُس کی ہیٹی سن کروہ بری ضرور شیشے میں اُتر آئے گی۔ اور رنجیت کمار جارحانہ اقدام ہی کو کارگر سمجھتا تھا ...... لیکن سب آخر میں یہی سوچتے تھے کہ دیکھیے فی لس پر مہربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پلیٹینم بلونڈ فی لس کو وہ عورت جسے میں نے چڈے کے ساتھ تانگے میں دیکھا تھا، کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔

فی لس کی باتیں کرتے کرتے چڈے نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی، اور مجھ سے کہا: "جہنم میں جائے یہ لونڈیا ـــــ چلو یار .... بھابی وہاں کباب ہو رہی ہو گی ـــــ لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سنٹی مینٹل نہ ہو جاؤں ...... خیر ـــــ تم مجھے سنبھال لینا۔" اپنے گلاس کے چند آخری قطرے حلق میں ٹپکا کر اُس نے نوکر کو آواز دی "ممیوں کے ملک مصر کے شہزادے۔"

ممیوں کے ملک مصر کا شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا، جیسے کسی نے اس کو صدیوں کے بعد کھود کھاد کے باہر نکالا ہے۔ چڈے نے اُس کے چہرے پر زم زم کے چھینٹے مارے اور کہا: "دو عدد ٹانگے لاؤ ...... جو مصری رتھ معلوم ہوں۔"

ٹانگے آ گئے۔ ہم سب ان پر لد کر پربھات نگر روانہ ہوئے ـــــ میرا پرانا فلموں کا ساتھی ہریش گھر پر موجود تھا۔ اس دُور دراز جگہ پر بھی اُس نے میری بیوی کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ چڈے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا تھا، چنانچہ یہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیظ و غضب کا اظہار نہ کیا۔ اُس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے جو عورتوں کے نفسیات کا ماہر تھا۔ بڑی پُرلطف باتیں کیں، اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اُس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جو اُس روز ہونے والی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا "کوئی گانا فلما رہے ہیں آپ؟"

ہریش نے جواب دیا "جی نہیں ـــــ وہ کل کا پروگرام ہے ...... میرا خیال ہے آپ کل چلیے گا۔"

ہریش کی بیوی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اور دھکا دھکا کر عاجز آ گئی ہوئی تھی۔ اُس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا "ہاں کل ٹھیک رہے گا ـــــ آج تو انھیں سفر کی تھکن بھی ہے۔"

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہرنش نے پھر کچھ دیر تک پُرلطف باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا "چلو یار —— تم چلو میرے ساتھ" اور میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "ان کو چھوڑو ..... سیٹھ صاحب تمھاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔"

میں نے بیوی کی طرف دیکھا اور ہرنش سے کہا "اُن سے اجازت لے لو۔"

میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس لیے ہرنش سے کہا "میں نے بمبے سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈوکیومنٹ کیس ساتھ لے چلیے، پر انھوں نے کہا کوئی ضرورت نہیں —— اب یہ کہانی کیا سنائیں گے۔"

ہرنش نے کہا "زبانی سُنا دے گا۔" پھر اُس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہے کہ ہاں کہو جلدی۔

میں نے اطمینان سے کہا "ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔"

چڈے نے اس ڈرامے میں تکمیلی تیج دیا۔ "تو بھئی ہم چلتے ہیں۔" اور وہ تینوں اُٹھ کر سلام نمستے کر کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہرنش نکلے —— پربھات نگر کے باہر تانگے کھڑے تھے۔ چڈے نے ہمیں دیکھا تو زور کا نعرہ بلند کیا "راجہ ہرنش چندر زندہ باد ......"

ہرنش کے سوا ہم سب ممی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اُس کو اپنی ایک سہیلی سے ملنے جانا تھا۔

یہ بھی ایک کاٹیج تھی۔ شکل و صورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی، مگر بہت صاف ستھری جس سے ممی کے سلیقے اور قرینے کا پتہ چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں تھی سجی ہوئی تھی۔ پربھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی قحبہ خانہ ہو گا، مگر اُس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کا عیسائی ہوتا ہے۔ لیکن ممی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوان جوان دکھائی دیتا تھا۔ اُس پر وہ میک اپ نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھریوں والے چہرے کو دیکھا تھا۔ جب ممی ڈرائنگ روم میں آئی، تو میں نے سوچا کہ گرد و پیش کی جتنی چیزیں ہیں، وہ آج کی نہیں، بہت برسوں کی ہیں۔ صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہو گئی ہے اور وہ ویسی کی ویسی پڑی رہی ہیں —— اُن کی جو عمر تھی، وہ وہیں کی وہیں رہی ہے ...... لیکن جب میں نے اُس کے گہرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے گرد و پیش کے ماحول کی طرح سنجیدہ ذہنیں طور پر جوان بن جائے۔

چڈے نے اُس سے میرا تعارف کرایا، جو بہت مختصر تھا، اور اختصار ہی کے ساتھ اُس نے ممی کے متعلق مجھ سے یہ کہا "یہ ممی ہے —— وی گریٹ ممی ..."

ممی اپنی تعریف سُن کر مسکرا دی، اور میری طرف دیکھ کر اُس نے چڈے سے انگریزی میں کہا "تم نے جائے منگوائی تھی حسبِ معمول نہایت افرا تفری میں —— معلوم نہیں انھیں پسند بھی آئی ہو گی یا نہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "مسٹر منٹو میں بہت شرمندہ ہوں ...... اصل میں سارا قصور تمھارے دوست چڈے کا ہے جو میرا ناقابل اصلاح لڑکا ہے۔"

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں جائے کی تعریف کی اور اُس کا شکریہ ادا کیا۔ ممی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور چڈے سے کہا۔ "رات کا کھانا تیار ہے ...... یہ میں نے اس لیے کیا کہ تم عین وقت کے وقت میرے سر پہ سوار ہو جاؤ گے ....."

چڈے نے ممی کو گلے سے لگا لیا ”یو آر ے جیول ممی ...... یہ کھانا اب ہم کھائیں گے۔“

ممی نے چونک کر پوچھا ”کیا؟ ...... نہیں، ہرگز نہیں۔“

چڈے نے اُسے بتایا ”مسز منٹو کو ہم پربھات نگر چھوڑ آئے ہیں۔“

ممی چلائی۔ ”خدا تمہیں غارت کرے —— یہ تم نے کیا کیا ——“

چڈہ کھلکھلا کر ہنسا۔ ”آج پارٹی جو ہونے والی تھی۔“

”وہ تو میں نے مسز منٹو کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی۔“ ممی نے اپنا سگرٹ سلگایا۔

چڈے کا دل ڈوب گیا ”خدا اب تمہیں غارت کرے ...... اور یہ سب پلین ہم نے صرف اس پارٹی کے لیے بنایا تھا“ وہ کرسی پر یاس زدہ ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے کے ہر ذرّے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”لو سارے خواب ملیامیٹ ہو گئے ...... پلیٹی نم بلونڈ ...... اونہہ سانپ کے ننھے ننھے کھپروں جیسے رنگ والے بال ......“ ایک دم اُس نے اُٹھ کر ممی کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ”کینسل کی تھی —— اپنے دل میں کینسل کی تھی نا ...... لو اس پر صاد بنا دیتا ہوں۔“ اور اس نے ممی کے دل کے مقام پر انگلی سے بہت بڑا صاد بنا دیا اور باآواز بلند پکارا۔ ”ہُرے —— !“

ممی متعلقہ لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چڈے کو دلگیر کرنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اُس نے بڑی شفقت سے اُس کے گال تھپتھپائے اور کہا ”تم فکر نہ کرو ...... میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔“

وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔ چڈے نے خوشی کا ایک اور نعرہ بلند کیا اور ون کترے سے کہا ”جنرل وَن کترے —— جاؤ ہیڈ کوارٹرز سے ساری توپیں لے آؤ۔“

وَن کترے نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ سعیدہ کاٹیج بالکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ بوتلیں لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ اُس کے چڈے کا نوکر تھا۔ چڈے نے اُس کو دیکھا تو اُس کا استقبال کیا۔ ”آؤ آؤ —— میرے کوہ قاف کے شہزادے ...... وہ —— وہ سانپ کے کھپروں جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا آ رہی ہے ...... تم بھی قسمت آزمائی کر لینا۔“

رنجیت کمار اور غریب نواز دونوں کو چڈے کی یہ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے، والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ چڈے کی بہت بے ہودگی ہے۔ اس بیہودگی کو انھوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ چڈہ حسبِ عادت اپنی ہانکتا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ رم پی کر ایک دوسرے سے اپنے دُکھ کا اظہار کرتے رہے۔

میں ممی کے متعلق سوچتا رہا۔ ڈرائنگ روم میں، غریب نواز، رنجیت کمار اور چڈہ بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی ماں باہر کھلونے لینے گئی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ چڈہ مطمئن ہے کہ سب سے بڑھیا اور اچھا کھلونا اُسے ملے گا، اس لیے کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا اس لیے وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے ...... شراب اس ماحول میں دودھ معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹینم بلونڈ ...... اُس کا تصور ایک چھوٹی سی گڑیا کے مانند دماغ میں آتا تھا ——

ہر فضا، ہر ماحول کی اپنی موسیقی ہوتی ہے...... اُس وقت جو موسیقی میرے دل کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اُس میں کوئی شر اشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے اماں اور اُس کے بچے اور اُن کے باہمی رشتے کی طرح قابلِ فہم اور یقینی تھی۔

میں نے جب اُس کو تانگے میں چڈے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جمالیاتی حس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق واہیات خیال پیدا ہوئے۔ لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اُس کی جھریوں کی توہین ہے۔ اُس ممتا کی تضحیک ہے جو اُس کے دل میں چڈے، غریب نواز اور رَن کترے کے لیے موجود ہے...... اور خدا معلوم اور کس کس کے لیے......"

باتوں باتوں میں چڈے سے میں نے پوچھا "یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے؟"

اس لیے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے...... تمہارے اور میرے جیسے اُتو اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدھم سُر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں، جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور...... اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں کرتے...... ہم جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں، اُتو کے پٹھے ہیں...... میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں...... بیساکھی کا میلہ تھا...... تمہارے امرت سر میں...... رام باغ کے اُس بازار میں جہاں ٹکھیائیاں رہتی ہیں...... جاٹ گذر رہے تھے...... ایک صحت مند جوان نے...... خالص دودھ اور مکھن پر پلے ہوئے جوان نے جس کی نئی جوتی اُس کی لاٹھی پر بازی گری کر رہی تھی۔ اُوپر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا جس کی تیل میں چپڑی ہوئی بیریاں، اُس کے ماتھے پر بڑے بدنما طریقے پر جمی ہوئی تھیں اور اپنے ساتھی کی پسلیوں میں ٹھوکا دے کر کہا...... اوئے لہنا نیاں...... ویکھ اوئے اُوپر ویکھ...... اسی تے پنڈ وچ مجھاں ای...... آخری لفظ وہ خدا معلوم کیوں گول کر گیا۔ حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈال کر بولا۔ "اُس جاٹ کے لیے وہ چڑیل ہی اُس وقت کوہ قاف کی پری تھی...... اور اُس کے گاؤں کی حسین و جمیل مٹیاریں، بے ڈول بھینسیں...... ہم سب چغد ہیں...... درمیانے درجے کے...... اس لیے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اوّل درجے کی نہیں...... تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی...... لیکن...... لیکن نی لس...... خاص الخاص درجے کی چیز ہے...... وہ سانپ کے کھپروں......"

رَن کترے نے اپنا گلاس اُٹھا کر چڈے کے سر پر انڈیل دیا "کھپرے...... کھپرے...... تمہارا مسٹک پھر گیا ہے۔"

چڈے نے ماتھے پر سے رم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیے اور رَن کترے سے کہا "لے اب سُنا...... تیرا باپ سالا تجھ سے کتنی محبت کرتا تھا...... میرا دماغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے!"

رَن کترے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا "بائی گاڈ...... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا...... میں ففٹین ائرز کا تھا کہ اُس نے میری شادی بنا دی۔"

چڈہ زور سے ہنسا۔ "تمہیں کارٹون بنا دیا اُس سالے نے...... بھگوان اُسے سورگ میں کسیریل کی بیٹی دے کر وہاں بھی اسے بجا بجا کر تمہاری شادی کے لیے کوئی خوبصورت حُور ڈھونڈتا رہے۔"

"تمھاری فیملی کی ایسی تیسی ...... فی لس کی بات کرو ......اس سے زیادہ اور کوئی خوبصورت نہیں ہوسکتا"۔ چڈے نے غریب نواز اور رنجیت کمار کی طرف دیکھا جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے والے تھے۔ "گن پاؤڈر پلوٹ کے بانیو...... سن لو تمھاری کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی — میدان چڈے کے ہاتھ رہے گا ...... کیوں ویلز کے شہزادے ؟"

ویلز کا شہزادہ رم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چڈے نے قہقہہ لگایا اور اس کو آدھا گلاس بھر کے دے دیا۔

غریب نواز اور رنجیت کمار ایک دوسرے سے فی لس کے بارے میں گھل مل کے باتیں تو کر رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اُسے حاصل کرنے کی مختلف اسکیمیں علیحدہ طور پر بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرزِ گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں اب بجلی کے بلب روشن تھے، کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چڈہ مجھ سے بمبے کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سُن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں ممی کی تیز تیز آواز سنائی دی۔ چڈے نے نعرہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے رنجیت کمار کی طرف اور رنجیت کمار نے غریب نواز کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر دونوں دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

ممی چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اُس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ مختلف قدوقامت اور خطوط والوں کی پولی ڈولی، کٹی، ایلما اور تھیلما...... اور وہ ہیجڑا نما لڑکا...... اس کو چڈہ سسی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی چڈے کے ساتھ۔ اُس کا ایک بازو اس پلیٹینم بلونڈ کی پتلی کمر میں حائل تھا۔ میں نے غریب نواز اور رنجیت کمار کا ردِ عمل نوٹ کیا۔ ان کو چڈے کی یہ نمائشی فتحمندانہ حرکت پسند نہ آئی تھی۔

لڑکیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم اتنی انگریزی برسی کہ ڈن کنٹرے میٹری کولیشن امتحان میں کئی بار فیل ہوا۔ مگر اس نے کوئی پروا نہ کی اور برابر بولتا رہا جب اُس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ ایلما کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اُس نے ہندوستانی ڈانس کے اور کتنے نئے توڑے سیکھے ہیں۔ وہ ادھر دھانی ناکت اور تا تھئی تھئی کی دُون، لو، ٹھمری بنا بنا کر اس کو توڑے بتا رہا تھا، اُدھر چڈہ باقی لڑکیوں کے جھرمٹ میں انگریزی کے ننگے لمرک سُنا رہا تھا۔ جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں زبانی یاد تھے — ممی سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی — رنجیت کمار سگرٹ کے کش لگا کر ٹکٹکی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا اور غریب نواز ممی سے بار بار کہتا تھا کہ روپے کم ہوں تو وہ اُس سے لے لے۔

اسکاچ کھلی اور پہلا دَور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شامل ہونے کے لیے کہا گیا تو اُس نے اپنے پلیٹینمی بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر انکار کر دیا کہ وہ وسکی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر نہ مانی۔ چڈے نے بددلی کا اظہار کیا تو ممی نے فی لس کے لیے ہلکا سا مشروب تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے کہا۔ "بہادر لڑکی بنو اور پی جاؤ"۔

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چڈہ خوش ہو گیا اور اُس نے اِسی خوشی میں بیس پچیس اور لمرک سنائے۔ سب مزے لیتے رہے ——

میں نے سوچا، عریانی سے تنگ آ کر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہو گی، یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اُکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا ردِ عمل یقیناً ناشائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکش پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ایک مسلسل یک آہنگی کی کوفت سے چند گھڑیوں کے لیے نجات مل جاتی ہے......"

میں نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش جوان لڑکیوں میں گھُلی ملی چڑے کے ننگے لمرک سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی ——— اُس کے چہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھریاں صاف نظر آ رہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھیں...... میں نے سوچا، آخر لوگ کیوں فرار کو بُرا سمجھتے ہیں..... وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھے، اُن کا ظاہر گو بدنما تھا، لیکن باطن اُن کا بے حد خوبصورت تھا..... اُس پر کوئی بناؤ سنگھار، غازہ، کوئی اُبٹنا نہیں تھا۔

پترا تھی، وہ ایک کونے میں رنجیت کمار کے ساتھ کھڑی، اپنے نئے فراک کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اُسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بڑے سستے داموں پر ایسی عمدہ چیز تیار کرائی ہے۔ دو ٹکڑے تھے جو بظاہر بالکل بیکار معلوم ہوتے تھے، مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو گئے تھے ——— اور رنجیت کمار بڑے خلوص کے ساتھ اس کو دو نئے ڈریس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ حالانکہ اُسے فلم کمپنی سے اتنے روپے یکمشت ملنے کی ہرگز ہرگز امید نہیں تھی۔ ڈولی تھی وہ غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُس کو یقین دلا رہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر وہ یہ قرض ضرور ادا کر دے گی۔ غریب نواز کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسبِ معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کیے جا رہا تھا۔ تھیلما، ڈن کترے سے ٹانڈیو ناچ کے بڑے مشکل توڑے سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈن کترے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اُس کے پیر کبھی اُن کے بول ادا نہیں کر سکیں گے، مگر وہ اس کو بتائے جا رہا تھا اور تھیلما بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ڈن کترے کا وقت ضائع کر رہی ہے مگر بڑے شوق اور انہماک سے سبق یاد کر رہی تھی۔ ایلما اور کِٹی دو دلوں پیئے جا رہی تھیں اور آپس میں کسی آنٹی کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلی ریس میں اُن دونوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹِپ دی تھی۔ اور چڈہ فی ٹس کے سانپ کے کچرے ایسے رنگ کے بالوں کے پگھلے ہوئے سونے کی رنگ کی اسکاچ میں ملا ملا کر پی رہا تھا۔ فی ٹس کا یہ چڑہ نما دوست بار بار جیب سے کنگھی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ ممی کبھی اس سے بات کرتی تھی، کبھی اُس سے، کبھی سوڈا کھلواتی تھی، کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی...... اُس کی نگاہ سب پر تھی۔ اُس بلی کی طرح، جو بظاہر آنکھیں بند کیے سستاتی ہے، مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔

اِس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا؟..... ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس تصویر کا ایک ضروری جُزو ہے۔

غالبؔ کہتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

قیدِ حیات اور بندِ غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے — اس نجات کے لیے کون ملک الموت کا انتظار کرے ...... کیوں آدمی چند لمحات کے لیے خود فریبی کے دلچسپ کھیل میں حصّہ نہ لے۔

ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اُس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں ان سب کے لیے ممتا تھی — میں نے سوچا شاید اس لیے اُس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اُس کی اصلیت معلوم نہ ہو ...... اُس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی ...... اس نے اپنی شفقت اور محبت کے لیے چند آدمی چن لیے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

ممی کو معلوم نہیں تھا، چڈہ ایک نگڑا پگ فی لس کو پلا چکا تھا۔ چوری چھپے نہیں سب کے سامنے، مگر ممی اُس وقت اندر باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی ...... فی لس نشے میں تھی، ہلکے ہلکے سرور میں، جس طرح اُس کے پالش کیے ہوئے فولاد کے رنگ کے بال آہستہ آہستہ لہراتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ رون کترے، تھیما کو نوڑے سکھا سکھا کر اب اُسے بتا رہا تھا کہ اُس کا باپ سالا اُس سے بہت محبت کرتا تھا۔ چنانچہ ڈربی میں اُس نے اُس کی شادی بنا دی تھی۔ اُس کی وائف بہت بیوٹی فل ہے ...... اور غریب نواز، ڈوڈلی کو قرض دے کر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت کمار، پولی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ ایلما اور کٹی دونوں جہان بھر کی باتیں کر کے اب تھک گئی تھیں — تپائی کے اردگرد، فی لس، اُس کا ہیجڑا نما ساتھی اور ممی بیٹھے تھے۔ چڈہ اب جذباتی نہیں تھا، فی لس اُس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا — اُس کو حاصل کرنے کا عزم اُس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا۔ ممی اس سے غافل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد فی لس کا ہیجڑہ نما دوست اُٹھ کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا — غریب نواز اور ایلما اُٹھ کر کہیں چلے گئے۔ ایلما اور کٹی نے آپس میں کسی مارگرٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ممی سے رخصت لی اور چلی گئیں ...... رون کترے نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور فی لس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر تھیلما کی طرف جو اُس کے پاس بیٹھی تھی اور اُس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانے کے لیے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ چڈے اور ممی میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چڈے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچے کی طرح ممی سے بدزبانی کرنے لگا۔ فی لس نے دونوں میں مصالحت کی مہین مہین کوشش کی، مگر چڈہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ فی لس کو اپنے ساتھ سعیدہ کاٹیج میں لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ وہ اُس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اس ارادے سے باز آئے، مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار ممی سے کہہ رہا تھا "تم دیوانی ہو گئی ہو ...... بوڑھی ولالہ ...... فی لس میری ہے — پوچھ لو اس سے۔"

ممی نے بہت دیر تک اُس کی گالیاں سُنیں، آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز میں اُس سے کہا "چڈہ، مائی سن ...... تم کیوں نہیں سمجھتے ...... شی از ینگ — شی از ویری ینگ!"

اُس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی، ایک سرزنش تھی، ایک بڑی بھیانک تصویر تھی، مگر چڈہ بالکل نہ سمجھا۔ اُس وقت اس کے پیشِ نظر صرف فی لس اور اُس کا حصول تھا۔ میں نے فی لس کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی بمشکل پندرہ برس کی ...... اُس کا سفید چہرہ، نقرئی بادلوں میں گھرا ہوا بارش کے پہلے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔ چڈے نے اُس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز میں اُسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا ——— ممی نے احتجاج کی چیخ بلند کی "چڈہ ...... چھوڑ دو ...... فور گاڈ سیک ...... چھوڑ دو اسے۔"

جب چڈے نے فی لس کو اپنے چوڑے سینے سے جُدا نہ کیا تو ممی نے اُس کے منہ پر ایک چانٹا مارا۔ "گٹ آوٹ ...... گٹ آوٹ!"

چڈہ بھونچکا رہ گیا۔ فی لس کو جُدا کر کے اُس نے دھکا دیا اور ممی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ میں نے اُٹھ کر رخصت لی اور چڈے کے پیچھے چلا گیا۔

سعیدہ کاٹیج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون، قمیص اور بوٹ سمیت پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بڑے میز پر سو گیا۔

صبح دیر سے اُٹھا۔ گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ چڈہ صبح ہی صبح اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اُس کی آواز سُنی جو گراج سے باہر آ رہی تھی۔ میں رُک گیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "وہ لاجواب عورت ہے ——— خدا کی قسم وہ لاجواب عورت ہے ...... دُعا کرو کہ اُس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی گریٹ ہو جاؤ۔"

اُس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی ——— معلوم نہیں اُس کا رُخ اُس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اُس شخص کی طرف جس سے وہ مخاطب تھا ——— میں نے زیادہ دیر وہاں رُکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے اُس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو میں پربھات نگر روانہ ہو گیا۔

میری بیوی کا مزاج معتدل تھا ——— ہریش گھر میں نہیں تھا۔ اُس کی بیوی نے اُس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پُونے میں کافی تفریح ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے ہریش کی بیوی سے کہا۔ کہ ہمیں اجازت دے دی جائے۔ رسماً اُس نے ہمیں روکنا چاہا، مگر میں سعیدہ کاٹیج ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لیے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی ہے۔ ہم چل دیے ...... راستے میں ممی کی باتیں ہوئیں جو کچھ ہوا تھا میں نے اُس کو مِن و عَن سُنا دیا۔ اُس کا ردِ عمل یہ تھا کہ فی لس اُس کی کوئی رشتہ دار ہو گی۔ یا وہ اُسے کسی اچھی اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی جبھی اُس نے چڈے سے لڑائی کی ...... میں خاموش رہا۔ اُس کی تردید کی نہ تائید۔

کئی دن گذرنے پر چڈے کا خط آیا جس میں اُس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا اور اُس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا "میں اُس روز حیوان بن گیا تھا ——— لعنت ہو مجھ پر!"

تین مہینے کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پُونے جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ چڈہ موجود نہیں تھا۔ غریب نواز سے اُس وقت ملاقات ہوئی جب وہ گراج سے باہر نکل کر شیریں کے خورد سال بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ تھوڑی دیر

کے بعد رنجیت کمار آ گیا، کچھوے کی چال چلتا اور خاموش بیٹھ گیا۔ میں اگر اُس سے کچھ پُوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہُوا کہ چڈّہ اس رات کے بعد ممی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فی لس کو اس نے دوسرے روز ہی اپنے ماں باپ کے پاس بجھوا دیا۔ وہ اُس ہیجڑہ نما لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی...... رنجیت کمار کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پُونے میں رہتی تو وہ ضرور اُسے لے کر اُڑتا۔ غریب نواز کو ایسا کوئی زعم نہیں تھا۔ اُسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی۔

چڈّے کے متعلق یہ پتہ چلا کہ دو تین روز سے اس کی طبیعت ناساز ہے..... بخار رہتا ہے۔ مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا۔۔۔ سارا دن اِدھر اُدھر گھومتا رہتا ہے۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت کمار اُٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا، اُس کا رُخ گیراج کی طرف تھا۔

میں غریب نواز سے گراج والی شیریں کے متعلق کچھ پُوچھنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا کہ ون کترے سخت گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چڈّے کو سخت بخار تھا۔ وہ اسے ٹانگے میں یہاں لا رہا تھا کہ راستے میں بیہوش ہو گیا..... میں اور غریب نواز باہر دوڑے۔ ٹانگے والے نے بیہوش چڈّے کو سنبھالا ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر اُسے اُٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سو چھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہو گا۔

میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔ اس نے ون کترے سے مشورہ کیا۔ وہ "ابھی آتا ہوں" کہہ کر چلا گیا۔

جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اُس نے چڈّے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا "کیا ہوا میرے بیٹے کو؟"

ون کترے نے جب اُسے بتایا کہ چڈّہ کئی دن سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور غصّے کے ساتھ کہا "تم کیسے لوگ ہو۔۔۔ مجھے اطلاع کیوں نہ دی" پھر اس نے غریب نواز، مجھے اور ون کترے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڈّے کے پاؤں سہلانے کی دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڈّے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہو گئی تھی لیکن اُس نے تحمل سے کام لیا اور ڈاکٹر بلانے چل گئی۔

معلوم نہیں رنجیت کمار کو گراج میں کیسے پتہ چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہوا آیا۔ جب اُس نے استفسار کیا تو ون کترے نے اس کے بیہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا، اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ یہ سُن کر رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک دُور ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے، جیسے چڈّے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اپنے سر لے لی ہے۔

اس کی ہدایات کے مطابق چڈّے کے پاؤں سہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں جب ممی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڈّے کی زندگی خطرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ممی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے ——— میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گراج

کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ممی آئی۔ غریب نواز، نون کنڑے اور رنجیت کمار سے اُس نے فوراً کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڈہ اب آنکھیں کھول کر شن رہا تھا۔ ممی کو اُس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اُلجھن سی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ ممی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اُس نے ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا۔ ممی، یُو آر گریٹ!

ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڈے کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اُس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ "میرے بیٹے ...... میرے غریب بیٹے!"

چڈے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ "نہیں —— تمھارا بیٹا اوّل درجے کا سکاؤنڈرل ہے ...... جاؤ اپنے مرحوم خاوند کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پر داغ دو!"

ممی نے چڈے کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا۔ "فضول بکواس نہ کرو۔" پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اُٹھی اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا۔ "لڑکو —— چڈہ بیمار ہے اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے —— سمجھے؟"

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈے کو اُٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ ایسی کونسی آفت آ گئی ہے جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ممی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈہ بہت ضدی تھا۔ مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ممی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چڈہ ہسپتال میں داخل ہو گیا —— ممی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے، یعنی پلیگ۔ یہ سُن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ خود ممی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو اُمید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی اور چڈہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

علاج ہوتا رہا۔ پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور بخار بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ، مگر ممی نہ مانی۔ اس نے چڈے کو اسی حالت میں اُٹھوایا اور اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پونے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے سے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلیگ کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے پندرہ روز کے بعد لوٹا تو میری بیوی نے چڈے کا ایک خط دیا جس میں صرف یہ لکھا تھا۔ "عظیم المرتبت ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے مُنہ سے بچا لیا ہے۔"

ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلافِ معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا۔ "ایسی عورتیں عموماً خدمت گزار ہوا کرتی ہیں۔"

میں نے چڈے کو دو تین خط لکھے، جن کا جواب نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ممی نے اس کو تبدیلیِ آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لوناولہ بھجوا دیا تھا۔ چڈہ وہاں بمشکل ایک مہینہ رہا اور اُکتا کر چلا آیا۔ جس روز وہ پُونے پہنچا اتفاق سے میں وہیں تھا۔

پلیگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا، مگر اس کی نمو عالپسند طبیعت اسی طرح زوروں پر تھی اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا کہ جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب کہ وہ جانبر ہو گیا تھا اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو اسے بیکار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کاٹیج میں چڈے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ایلی برادران یعنی عقیل اور شکیل کہیں اور اُٹھ گئے تھے کیونکہ انھیں اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لیے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر آ گیا تھا۔ اس کا نام سین تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے بھاگا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس سے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور خدمت گذار تھا۔ چڈے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ممی کے کہنے پر لوناولہ جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز اور رنجیت کمار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ لیا جائے۔ سین کے کمرے میں چونکہ جگہ خالی تھی، اس لیے اس نے وہیں اپنا ڈیرہ جما دیا تھا۔

رنجیت کمار کو کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو منتخب کر لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوا تو اس کو دوسرا فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چڈہ اپنی دو برس کی جمع شدہ تنخواہ میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ یکمشت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت کمار سے کہا تھا "میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو پلیگ میں مبتلا ہو جاؤ — ہیرو اور ڈائرکٹر بننے سے میرا خیال ہے، یہی بہتر ہے۔"

غریب نواز تازہ تازہ حیدر سے واپس آیا تھا، اس لیے سعیدہ کاٹیج کسی قدر مرفع الحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ گراج کے باہر الگنی سے ایسی قمیصیں اور شلواریں لٹک رہی تھیں جن کا کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شیریں کے خورد سال بچے کے پاس نئے کھلونے تھے۔

مجھے پونے میں پندرہ روز رہنا پڑا۔ میرا پُرانا فلموں کا ساتھی اب نئے فلم کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر ڈرتا تھا۔ کیونکہ یہ ہیروئن پنجابی تھی اور اس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا ہٹا کٹا مشٹنڈا تھا۔ چڈے نے اس کو حوصلہ دیا تھا۔ "کچھ پروا نہ کرو اس سالے کی...... جس پنجابی ایکٹرس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پہلوان ہو، وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں شانے چت گرا کرتا ہے — بس اتنا کرو کہ سو روپے فی گالی کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بیس بڑی ہیوی ویٹ قسم کی گالیاں سیکھ لو۔ یہ تمھاری خاص مشکلوں میں بہت کام آیا کریں گی۔"

ہریش ایک بوتل فی گالی کے حساب سے چھ گالیاں پنجاب کے مخصوص لب و لہجے میں یاد کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے اپنے عشق کے راستے میں کوئی ایسی خاص مشکل درپیش نہیں آتی تھی جو وہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ممی کے گھر حسب معمول محفلیں جمتی تھیں۔ پولی۔ ڈولی۔ کٹی۔ ایلما، تھیلما وغیرہ سب آتی تھیں۔ ون گُترے بدستور تھیلما کو کتھا کلی اور تانڈیو ناچ کی تاتھئی، اور دھاتی ناکت کی وَن، تُو، تھری بنا بنا کر بتاتا تھا۔ اور وہ اسے سیکھنے کی پُرخلوص کوشش کرتی تھی۔ غریب نواز حسب توفیق قرض دے رہا تھا اور رنجیت کمار جس کو اب کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو کا چانس مل رہا تھا، ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی ہوا میں لے جاتا تھا — چڈے کے ننگے لمرک شن کر اسی طرح قہقہے برپا ہوتے تھے...... ایک صرف وہ نہیں تھی...... وہ جس کے بالوں

کے رنگ کے لیے صحیح تشبیہہ ڈھونڈنے میں چڈے نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ مگر ان محفلوں میں چڈے کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی نہیں تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھی جب چڈے کی نظریں ممی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دیوانگی کا افسوس ہے۔ ایسا افسوس جس کی یاد سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ چوتھے پیگ کے بعد کسی وقت اس قسم کا جملہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا۔ "چڈہ ——— یو آر اے ڈیمڈ بروٹ!"

یہ سن کر ممی زیرِ لب مسکرا دیتی تھی، جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیرینی میں لپیٹ لپیٹ کر یہ کہہ رہی ہے۔ "ڈونٹ ٹوک روٹ۔"

وِن کترے سے بدستور اس کی چخ چلتی تھی۔ سرور میں آکر جب بھی وہ اپنے باپ کی تعریف میں یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بہت بڑے گنڈاسے کاٹ ڈالتا۔ وہ غریب چپ ہو جاتا، اور اپنا میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیتا۔

ممی، وہی ممی تھی ——— پولی کی ممی، ڈولی کی ممی، چڈے کی ممی، رنجیت کمار کی ممی، ——— سوڈے کی بوتلوں، گزک کی چیزوں اور محفل جمانے کے دوسرے ساز و سامان کے انتظام میں وہ اسی پُرشفقت وانہماک سے حصہ لیتی تھی۔ اس کے چہرے کا میک اَپ ویسا ہی واہیات ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ و شنگ تھے۔ غازے اور سُرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کہ پلیگ کے کیڑے ان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ڈر کر، سمٹ کر، وہ دوڑ گئے تھے .... چڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ اس پر ان جھریوں کا سایہ تھا .... ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واہیات رنگوں میں لتھڑی رہتی تھیں۔

وِن کترے کی خوبصورت بیوی کے جب اسقاط ہوا تھا تو ممی ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ تھیلما جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مارواڑ کے ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو ممی نے اُس کو بہت ڈانٹا تھا۔ اور اس کو جہنم سپرد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات سُنا دی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیلما کا علاج کرائیں۔ کِٹی کو ایک معاملہ حل کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تھا، تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دے دے، کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔ اس نے کِٹی سے کہا تھا "تم اس وقت اسے دے دو ——— بعد میں لیتی رہنا" اور مجھ سے اس نے پندرہ روز کے قیام کے دوران میں کئی مرتبہ میری مسز کے بارے میں پوچھا تھا، اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچے کی موت کو اتنے برس ہو گئے ہیں، دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوا۔ رنجیت کمار سے زیادہ رغبت کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تشویش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دو مرتبہ لفظوں میں بھی کر چکی تھی۔ میوزک ڈائرکٹر تبین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چڈہ اُس کو اپنے ساتھ لاتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی "ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو۔" چڈہ اس سے وجہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے یہ جواب دیتی تھی "کہ مجھے یہ آدمی اوپرا اوپرا سا معلوم ہوتا ہے ——— فٹ نہیں بیٹھتا میری نظروں میں۔" یہ سن کر چڈہ ہنس دیتا تھا۔

ممی کے گھر کی محفلوں کی پُر خلوص گرمی بیبے میں واپس ہمیشہ چلا گیا۔ ان محفلوں میں زندگی تھی، بلانوشی تھی، جنسیاتی رنگ تھا۔ مگر کوئی اُلجھاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح قابلِ فہم تھی۔ اسی طرح اُبھری ہوئی۔ بظاہر اسی طرح کڈھب، بینڈی اور دیکھنے والے کو گومگو کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح، باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں یہ پڑھا کہ سعیدہ کاٹیج میں بنگالی میوزک ڈائرکٹر سین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پونے ٹیلیفون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔

ایک ہفتے کے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثۂ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوتے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین ہے۔ خون میں لت پت۔ چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش و حواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے میں رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت کمار بھی آ گئے۔ ساری سعیدہ کاٹیج بیدار ہو گئی۔ رنجیت کمار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا۔ اور اس سے زخموں کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اُس نے آخری ہچکی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

رام سنگھ، غریب نواز اور رنجیت کمار کی گرفت میں تھا۔ مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا۔ بھاپا جی ——— مر گیا؟

چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب نواز سے کہا "مجھے چھوڑ دیجیے، میں بھاگوں گا نہیں۔"

چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر بھیج کر ممی کو بلوایا۔ ممی آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آزاد کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں ان کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ، بیانات، پھر عدالت میں مقدمے کی پیروی۔ ممی اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی تھی۔ چڈے کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت ہی نے اسے صاف بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اُس نے تھانے میں دیا تھا۔ ممی نے اُس سے کہا تھا "بیٹا گھبراؤ نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے سچ سچ بتا دو ——— اور اُس نے تمام واقعات من و عن بیان کر دیے تھے کہ سین نے اس کو پلے بیک سنگر بنا دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس کو خود بھی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا اور سین بڑا اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس چکر میں آ کر اس کی شہوانی خواہشات کو پوری کرتا رہا، مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی، اس کا دل بار بار اسے لعنت ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے سین سے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر اس نے پھر اسے مجبور کیا تو وہ اُسے جان سے مار ڈالے گا۔ چنانچہ واردات کی رات کو یہی ہوا۔

عدالت میں اس نے یہی بیان دیا۔ ممی موجود تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں وہ رام سنگھ کو دلاسا دیتی رہی کہ گھبراؤ نہیں۔ جو سچ ہے کہہ دو۔ سچ کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمھارے ہاتھوں نے خون کیا ہے۔ مگر ایک نجس چیز کا۔ ایک خباثت کا۔ ایک غیر فطری سودے کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی، بڑے بھولپن اور بڑے معصومانہ انداز میں سارے واقعات بیان کیے مجسٹریٹ اس قدر متاثر ہوا کہ

اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ چڈے نے کہا "اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے ——— اور اس کا سہرا میری بڈھی ممی کے سر ہے!"

چڈے نے مجھے اس جلسے میں بلایا تھا جو رام سنگھ کی رہائی کی خوشی میں سعیدہ کاٹیج والوں نے کیا تھا۔ مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایل برادرز شکیل اور عقیل دونوں واپس سعیدہ کاٹیج آ گئے تھے۔ باہر کی فضا بھی ان کی ذاتی فلم کمپنی کی تاسیس و تعمیر کے لیے راس نہ آئی تھی۔ اب وہ پھر اپنی پُرانی فلم کمپنی میں کسی اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس اس سرمایے میں سے چند سو باقی بچے ہوئے تھے جو انھوں نے اپنی فلم کمپنی کی بنیادوں کے لیے فراہم کیا تھا۔ چڈے کے مشورے پر انھوں نے یہ سب روپیہ جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے دے دیا۔ چڈے نے ان سے کہا تھا "اب میں چار پیگ پی کر دعا کروں گا کہ وہ تمھاری ذاتی فلم کمپنی فوراً کھڑی کر دے۔"

چڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں وِن کترے نے شراب پی کر خلاف معمول اپنے سالے باپ کی تعریف نہ کی اور نہ اپنی خوبصورت بیوی کا ذکر کیا۔ غریب نواز نے کمٹی کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کو دو سو روپے قرض دیے اور رنجیت کمار سے اس نے کہا تھا "تم ان بیچاری لڑکیوں کو یونہی جھانسے نہ دیا کرو...... ہو سکتا ہے کہ تمھاری نیت صاف ہو، مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی ...... کچھ نہ کچھ دے دیا کرو!"

ممی نے اس جلسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا اور سب کو یہ مشورہ دیا کہ اُسے گھر واپس جانے کے لیے کہا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ ہوا اور دوسرے روز غریب نواز نے اس کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا ——— شیریں نے سفر کے لیے اس کو کھانا پکا کر دیا۔ اسٹیشن پر سب اس کو چھوڑنے گئے۔ ٹرین چلی تو وہ دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں۔ جب مجھے ایک ضروری کام سے پُونے جانا پڑا۔ سعیدہ کاٹیج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم تھا کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل و صورت ہزار ہا قافلوں کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسی جگہ تھی جو اپنا خلا خود ہی پُر کر دیتی تھی۔ میں جس روز وہاں پہنچا، شیریں بٹ رہی تھی۔ شیریں کے گھر ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ وِن کترے کے ہاتھ میں گلیکسو کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لیے کہیں سے دو پیدا کیے تھے۔ ان میں سے ایک وہ شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کے لیے لے آیا تھا۔ چڈے نے آخری دو لنڈے اس کے منہ میں ٹھونسے اور کہا "تو گلیکسو کا ڈبہ لے آیا ہے ——— بڑا کمال کیا ہے تو نے ...... اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کی دیکھنا، ہرگز کوئی بات نہ کرنا۔"

وِن کترے نے بڑے بھولپن کے ساتھ کہا "سالے، میں اب کوئی پیتے لاہوں ...... وہ تو دارو بولا کرتی ہے ...... ویسے باتی گاڈ ...... میری بیوی بڑی ہینڈسم ہے ......"

چڈے نے اس قدر بے تحاشا قہقہہ لگایا کہ وِن کترے کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار مجھ سے متوجہ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہو گئیں جو میں اپنے پُرانے فلموں کے ذریعے سے وہاں کے ایک پروڈیوسر کے لیے

لکھ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چڈے کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا کہ جائے پیدائش یعنی سعیدہ کاٹیج کی رعایت سے اس کا مولود مسعود ہے۔ اس لیے مسعود نام بہتر رہے گا۔ چڈے کو پسند نہیں تھا لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار تینوں کی طبیعت کسی قدر بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے سوچا شاید یہ خزاں کے موسم کی وجہ ہے۔ جب آدمی خواہ مخواہ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ بھی اس خفیف اضمحلال کا باعث ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سین کو قتل کی ٹریجڈی؟...... معلوم نہیں کیا وجہ تھی...... لیکن میں نے یہ قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب افسردہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے، بولتے تھے، مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں پربھات نگر میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے گھر میں کہانی لکھتا رہا۔ یہ مصروفیت پورے سات دن جاری رہی، مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ اس دوران میں چڈے نے خلل اندازی کیوں نہیں کی۔ کون کتر سے بھی کہیں غائب تھا۔ رنجیت کمار سے میرے کوئی اتنے مراسم نہیں تھے کہ وہ میرے پاس آتی دور آتا۔ غریب نواز کے متعلق میں نے سوچا تھا کہ شاید حیدرآباد چلا گیا ہو۔ اور میرا پرانا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی ہیروئن سے اس کے گھر میں اس کے بڑی بڑی مونچھوں والے خاوند کی موجودگی میں عشق لڑانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔

میں اپنی کہانی کے ایک بڑے دلچسپ باب کا منظر نامہ تیار کر رہا تھا کہ چڈہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ "اس بکواس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے"۔

اس کا اشارہ میری کہانی کی طرف تھا جس کے معاوضے کی دوسری قسط میں نے دوروز ہوئے وصول کی تھی — "ہاں...... دو سو ہزار پرسوں لیا ہے"۔

"کہاں ہے یہ ہزار؟ یہ کہتا ہوا چڈہ میرے کوٹ کی طرف بڑھا۔

"میری جیب میں!"

چڈے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو کے چار نوٹ نکالے اور مجھ سے کہا۔ "آج شام کو ممی کے ہاں پہنچ جانا — ایک پارٹی ہے!"

میں اس پارٹی کے متعلق اس سے کچھ دریافت کرنے ہی والا تھا کہ وہ چلا گیا۔ وہ افسردگی جو میں نے چند روز پہلے اس میں محسوس کی تھی بدستور موجود تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا — میں نے اس کے متعلق سوچنا چاہا مگر دماغ مائل نہ ہوا۔ کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ اس میں بری طرح پھنسا تھا۔

اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے اپنی بیوی کی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سے روانہ ہو کر سات بجے سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ گراج کے باہر الگنی پر گیلے گیلے پوتڑے لٹک رہے تھے اور نل کے پاس ایل برادران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور شیریں ان سے غالباً ممی کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ جیب

ہو گئے۔ میں نے چڈے کے متعلق پُوچھا تو عقیل نے کہا کہ وہ ممی کے گھر مل جائے گا۔

میں وہاں پہنچا تو ایک شور برپا تھا۔ سب ناچ رہے تھے۔ غریب نواز پولی کے ساتھ رنجیت کمار، کرٹی اور ایلما کے ساتھ اور ون کترے تھیلما کے ساتھ۔ وہ اس کو کتھا کلی کے مدرے بتا رہا تھا۔ چڈہ ممی کو گود میں اُٹھائے اِدھر اُدھر کُود رہا تھا ـــ سب نشے میں تھے۔ ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے چڈے نے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دیسی اور نیم بدیشی آوازوں کا ایک گولہ سا پھٹا جس کی گونج دیر تک کانوں میں سرسراتی رہی۔ ممی بڑے تپاک سے ملی ـــ ایسے تپاک سے جو بے تکلفی کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے کہا، "کس می ڈیئر!"

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چُوم لیا اور گھسیٹ کر ناچنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چڈہ ایک دم پکار اُٹھا "بند کرو ـــ اب شراب کا دور چلے گا۔" پھر اس نے نوکر کو آواز دی "اسکاٹ لینڈ کے شہزادے ـــ وسکی کی نئی بوتل لاؤ۔" اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔ نشے میں دھت تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور چکنا چُور ہو گئی۔ ممی نے اُس کو ڈانٹنا چاہا تو چڈے نے روک دیا اور کہا "ایک بوتل ٹوٹی ہے ممی ـــ جانے دو، یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔"

محفل ایک دم سونی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی چڈے نے اس لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے درہم برہم کر دیا۔ نئی بوتل آئی۔ ہر ایک بوتل میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چڈے نے بے ربط سی تقریر شروع کی "لیڈیز اینڈ جنٹلمین...... آپ سب جہنم میں جائیں...... منٹو ہمارے درمیان موجود ہے۔ بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی ـــ وہ کیا کہتے ہیں عمیق ترین گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے...... مگر میں کہتا ہوں کہ بکواس ہے...... کنوئیں میں اُترنے والے...... کنوئیں میں اُترنے والے"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ افسوس کہ یہاں کوئی ہندستوڑ نہیں۔ ایک حیدرآبادی ہے جو قاف کو خاف کہتا ہے اور جس سے دس برس پیچھے ملاقات ہوئی ہو گی، پرسوں آپ سے ملا تھا ـــ لعنت ہو اس کے نظام حیدرآباد پر جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے، کروڑہا جواہرات ہیں، لیکن ایک ممی نہیں...... ہاں...... وہ کنوئیں میں اُترنے والے..... میں نے کیا کہا تھا کہ سب بکواس ہے..... پنجابی میں جنھیں ٹوبے کہتے ہیں...... وہ غوطہ لگانے والے، وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسیات کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں...... اس لیے میں کہتا ہوں......"

سب نے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چڈہ چیخا "یہ سب سازش ہے ـــ اس منٹو کی سازش ہے۔ ورنہ میں نے ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باد کے نعرے کا اشارہ کیا تھا...... تم سب مُردہ باد...... لیکن پہلے میں...... میں......" وہ جذباتی ہو گیا۔ "میں...... جس نے اس رات اُس...... سانپ کے پیٹ کے کھپروں ایسے رنگ والے بالوں کی ایک لڑکی کے لیے اپنی ممی کو ناراض کر دیا...... میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جوان سمجھتا تھا...... لیکن نہیں...... اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم۔ ایک ہی بوسے میں پلیٹینم بلونڈ کے کنوار پنے کا عرق میں اپنے ان موٹے موٹے ہونٹوں سے چُوس سکتا تھا...... لیکن یہ ایک...... یہ ایک نامناسب حرکت تھی...... وہ کم عمر تھی...... اتنی کم عمر، اتنی کمزور، اتنی کیریکٹرلس...... اتنی......" اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، "بتاؤ یار اسے اُردو، فارسی یا عربی میں کیا کہیں

گے..... بیریکٹیلس ..... لیڈیز اینڈ جنٹلمین...... وہ اتنی چھوٹی، اتنی کمزور اور اتنی لاکردار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہوکر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی، یا اسے قطعاً بھول جاتی...... اِن چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا..... مجھے اس کا دُکھ ہوتا — اچھا ہوا کہ ممی نے اُسی وقت میرا حقہ پانی بند کر دیا..... میں اب اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا...... میں ایک پیگ اور پیتا ہوں۔"

اس نے ایک پیگ اور پیا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ ممی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غازے اور سُرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جھریاں بھی دکھائی دیتا تھا کہ غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بولنے کے بعد چڈہ جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا، جیسے کوئی چیز کھونے کے لیے ایسا کونہ ڈھونڈھ رہا ہے جو اس کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہے۔ میں نے اس سے ایک بار پوچھا کیا بات ہے چڈے؟"

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "کچھ نہیں..... بات یہ ہے کہ آج وسکی میرے دماغ کے جوتڑوں پر جما کے لات نہیں ماررہی۔" اس کا قہقہہ کھوکھلا تھا۔

وَن کترے نے تھیلما کو اُٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گُنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ دم بخود ہو جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چُن کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائرکٹر سین کی بات نکلی تو اُس نے کہا "مسٹر منٹو — وہ ایک دم ہلکٹ آدمی تھا..... کہتا تھا میں خاں صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں..... جھوٹ بالکل جھوٹ...... وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا......"

گھڑی نے دو بجائے۔ چڈے نے جسٹرنگ بند کیا۔ کٹی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور بڑھ کر وَن کترے کے کدو ایسے سر پر دھپا مار کر "بکواس بند کر بے..... اُٹھ لُم..... اور کچھ گا..... لیکن خبردار اگر تو نے کوئی پکا راگ گایا۔"

وَن کترے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز اچھی نہیں تھی۔ مرکیوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے گلے سے نہیں نکلتی تھی لیکن جو کچھ گاتا تھا، پُورے خلوص سے گاتا تھا۔ مالکوس میں اُس نے اُوپر تلے دو تین گانے سنائے جن سے فضا بہت اُداس ہو گئی۔ ممی اور چڈہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت ہٹا لیتے تھے..... غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چڈے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا "حیدر آباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے..... موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے۔"

غریب نواز نے اپنے آنسو پونچھے اور ایلما کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ وَن کترے نے گراموفون کے توے پر ریکارڈ رکھ کر سوئی لگا دی۔ گھِسی ہوئی ٹیون بجنے لگی۔ چڈے نے ممی کو پھر گود میں اُٹھا لیا اور کُود کُود کر شور مچانے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ ان میراثنوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اُونچے سروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ناس مار لیتی ہیں۔

اس اُچھل کود اور چیخم دھاڑ میں چار بج گئے ممی ایک دم خاموش ہوگئی، پھر اُس نے چڈے سے مخاطب ہو کر کہا "بس اب ختم!"
چڈے نے بوتل سے منہ لگایا، اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا "چلو منٹو چلیں!"
میں نے اُٹھ کر ممی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ "آج کوئی الوداع نہیں کہے گا!"
ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے ون کترے کے رونے کی آواز سُنی۔ میں نے چڈے سے کہا "ٹھہرو، دیکھیں کیا بات ہے۔"
مگر وہ مجھے دھکیل کر آگے لے گیا۔ "اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ بھی خراب ہے۔"
ممی کے گھر سے سعیدہ کاٹیج بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڈے نے کوئی بات نہ کی۔ سونے سے پہلے میں نے اُسے اس عجیب و غریب پارٹی کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اُس نے کہا "مجھے سخت نیند آرہی ہے" اور بستر پر لیٹ گیا۔
صبح اُٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا غریب نواز گراج کے ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے، اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اُس نے کہا "ممی چلی گئی!"
"کہاں؟"
"معلوم نہیں" یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رُخ کیا۔
چڈہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔ میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اُس نے مسکرا کر کہا "چلی گئی — صبح کی گاڑی سے اُسے پُونہ چھوڑنا تھا۔"
میں نے پوچھا "مگر کیوں؟"
چڈے کے لہجے میں تلخی آگئی "حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں — اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی۔ اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابلِ اعتراض تھیں۔ اس لیے کہ پولیس اس کی شفقت اور محبت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی ...... وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے ...... ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیرِ تفتیش تھا۔ آخر حکومت پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہوگئی اور اس کو تڑی کر دیا ...... شہر بدر کر دیا ...... وہ اگر قحبہ تھی، دلالہ تھی — اس کا وجود سوسائٹی کے لیے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے تھا — پُونے کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو" چڈے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اُس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا "مجھے افسوس ہے منٹو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا — لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہیے — وہ پُونے سے چلی گئی ...... مجھ ایسے جوانوں میں ایسی ہی اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی ...... میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں — زندہ باد ممی ...... زندہ باد! — چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کر لی ہوگی — ان حیدرآبادیوں کی آنکھوں کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے — وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے۔"
میں نے دیکھا، چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں۔ ("یزید" میں سے)

بابو گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈیٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اُس وقت لیڈر لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآوازِ بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔ "منٹو صاحب۔ بابو گوپی ناتھ سے ملیے۔"

میں نے اُٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسبِ عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیے۔ "بابو گوپی ناتھ۔ تم ہندوستان کے نمبر وَن رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے، لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلہ لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب۔ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ۔ ہے نہ اینٹی پینٹی پو؟"

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی۔ دھڑن تختہ اور اینٹی پینٹی پو ایسے الفاظ اُس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلّف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا۔ جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ "آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔"

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا "نمبر وَن بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مُسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں بس منٹو صاحب۔ یہ سمجھ لیجیے کہ بڑے انٹی فلو جسٹیکین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے۔"

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا "ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب۔" پھر سینڈو سے پوچھا "کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اُس کا شغل کرتے ہیں۔"

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آئیے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے۔ اس لیے کہ مُفت ملتی ہے۔"

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ لکھا دیا۔ جہاں میں حسبِ وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں، جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں۔ تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا: "آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے۔ آپ ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ سے لعاب نکلتا ہو۔ پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں کیونکہ انھیں وہاں کوئی اور بیوقوف ملنے کی اُمید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگرٹ اور سکاچ وسکی کے پگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو۔"

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان۔ کسرتی بدن۔ منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا: "یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہوگئی۔ بڑی بڑی کنٹی نیوٹلیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لیے، مگر اُس نے کہا ٹرو اور سڈاق۔ میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ ایک تکیے میں بات چیت پیتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہوگئی۔ بس اُس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ڈبّہ اور کھانا پینا مقرر ہے۔"

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سُرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کشمیر کی کبوتری ہے، جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں، مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الھڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا: "زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اُڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولس عیش کرتی رہی آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے —— دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگرٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سُرخ تھیں جن سے کافی بےحیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور سینڈو سے کہا: "اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔"

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا: "جناب یہ ہے، ٹین پٹر ٹی۔ فل فل فوٹی مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم —— آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے۔"

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا: "بکو اس نہ کرو۔" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیے۔ میں نے کہا "چھوڑو یار۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔"

سینڈو چلایا "بوائے۔ وسکی اینڈ سوڈا ——— بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سینہ کور"

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سوسو کے نوٹوں کا ایک پلندا نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا۔ "او گوڈ ——— او میرے رب العالمین ——— وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا ——— جاؤ بھئی غلام علی، دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔"

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کیں۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا۔ "دھڑن تختہ منٹو صاحب وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اُتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے ——— جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔"

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے چنانچہ اُس سے ایک بار کہا۔ "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ۔"

وہ چونک پڑا "جی میں ——— میں ——— کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔

"ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں ——— اور ہمیں کیا سوچ ہو گی۔"

سینڈو نے کہا۔ "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں ——— لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں، جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نیوٹل نہ رہ چکی ہو۔"

بابو گوپی ناتھ نے یہ سُن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا۔ "اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب۔"

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی؟ کون نٹنی تھی؟ کون کس کی نوچی تھی؟ نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی۔ ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا۔ مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اُسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی پیا بغیر کسی دلچسپی کے۔ سگرٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا، اُسے تمباکو اور اُس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگرٹ اسی نے پیے۔ بابو گوپی ناتھ سے اُسے محبت تھی؟ اس کا پتہ مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لیے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اُسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اُٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لیے بھیج رہا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لیے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جواب نشے میں تھا، زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا۔ "منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ "بڑا نیک خیال ہے۔"

بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا۔ "منٹو صاحب ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا۔ جانِ من مکان بنوا دوں ؟ جواب کیا دیا۔ معلوم ہے آپ کو ؟ —— کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے —— منٹو صاحب موٹر کتنے میں آجائے گی ؟"

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا۔ "کیا بات کرتے ہیں منٹو صاحب —— آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو کل چلیے میرے ساتھ۔ زینو کے لیے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئے میں موٹر ہونی ہی چاہیے۔"

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اُس نے مجھ سے کہا۔ "منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں —— لیکن آپ مجھے بتائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا۔ مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو تو معاف کر دیجیے گا —— بہت گنہگار آدمی ہوں —— وسکی منگاؤں گا آپ کے لیے اور"

میں نے کہا "نہیں نہیں —— بہت پی چکے ہیں۔"

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا "آور پیجیے منٹو صاحب" یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندا نکالا اور ایک نوٹ جُدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اُس کے ہاتھ سے لیے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیے۔ "سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا ؟"

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اُس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ "منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑا یا —— "

بابو گوپی ناتھ نے پُورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دُکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرامزادے نے اس کی جیب میں سے سارے روپے نکال لیے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا۔ "جلدی کھانا لے آؤ۔"

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چُغد ہے غلط ثابت ہوا۔ اُس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوتے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصّے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی مجھے کوئی رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انھیں عقلمند سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جس سے ان کا اُلّو سیدھا ہو سکتا ہے، بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لیے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔"

میں نے اس سے پوچھا "رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں؟"

کچھ دیر سوچ کر اُس نے جواب دیا "اس لیے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اُس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے ایک اور سوال کیا "آپ کو طوائفوں کا گانا سُننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سُری سے کن سُری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں ——— منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اُسے لینے کے لیے ایک ادا سے اُٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اُڑس لیا۔ اس نے جھک کر اُسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔"

بابو گوپی ناتھ کا شجرہ نسب تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنیے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اُسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی جو اُس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بمبے آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اُس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لیے اُس نے فلیٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی لیکن اُسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے کچھ اپنی جاذب طراز گائگی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اُس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مرگئی تھی اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی، جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا، عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا، نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لیے، خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں۔ اس کی بذلہ سنج طبیعت میں جس میں میراثنوں کے مزاج کی جھلک تھی بہت ہی جاذبِ نظر تھی۔ وہ کوشش کیے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا۔ مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اُسے لایا تھا۔ اُن دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا۔ وہ سگرٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا۔ "او بسم اللہ، بسم اللہ۔ کیا آپ کا گذر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟"

سینڈو نے کہا۔ "تشریف لے آیئے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ!"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی منکسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو، سادہ لوح، صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا، اس کے علاوہ ——— کچھ یوں کہئے کہ

اس بات کا بھی اُس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اُٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اُٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے کہا لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "آئیے منٹو صاحب" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا "منٹو صاحب مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوثِ اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں۔ دونوں ہاتھوں سے مجھے لُوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گرو رکھ کر گزارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو۔ جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی۔ تو کام نہیں چلے گا لیکن منٹو صاحب اس نے میری نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اُس نے کہا بمبئی لے جاؤ۔ اسے معلوم تھا کہ اُس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹرسیں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بُلا لیا ہے کہ اُس کو سب گُر سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کرو ——— منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بنک میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی ——— آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، اُس کے متعلق؟"

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا۔ "اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے ——— کیوں زینو جانی ——— پسند ہے تجھے؟"

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو

سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دُور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے۔ جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لیے اُس نے زینت کے مستقبل کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اُس کو ایکٹرس بنانے کے لیے اُس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا۔ لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا۔ "شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھیے، لیکن بے چاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سُنا ہے آجکل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔"

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی، اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لیے تھے۔ مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوتے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا اُسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اُسے تلاش کیا لیکن کسی کو اس کا پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمھیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا۔ "مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے آجکل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے ——— ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات اُمید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہارنبی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر یٰسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یٰسین مُسکرایا۔ "تم جانتے ہو موٹر والی کو۔"

میں نے کہا۔ "جانتا ہوں۔"

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ——— اچھی لڑکی ہے یار۔" یٰسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مُسکرا دیا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے لیبین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی کسی بات پر جھگڑ کر چلا گیا۔ لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں لیبین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن اور گذر جائیں زینت اور لیبین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے ——— مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میوریل سے لیبین کی آنکھ لڑ گئی چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور لیبین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت دُکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر مُنہ سے اتنا بھی نہیں کہتی۔ میاں اگر تم نے اس کرستان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو ——— میں کیا کروں منٹو صاحب۔ بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے۔"

لیبین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے۔ روپے کا بندوبست کرنے۔ کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اُسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن مکھن کی، چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا اس لیے اُسے اپنی فکر کرنی چاہیے۔ سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا "یہ تم کیا کر رہی ہو۔"

اُس نے بڑے الھڑپن سے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔"

جی چاہا تھا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں۔ سینڈو اور سردار اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے تمھیں بیچ بھی ڈال لیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اُکتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے اُمنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر سگرٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلیفون سے، حتیٰ کہ اُس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ تاہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے پورا پتہ بتا دیا۔ اُس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔

قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا "سینڈو۔"

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اُس کے مُنہ سے صرف اس قدر نکلا۔ "دھڑن تختہ!"

بابو گوپی ناتھ نے اُس سے کہا "آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو" لیکن سینڈو نے کہا "ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیے، مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔"

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دُور لے گیا۔ دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا۔ "واپس لے چلو۔"

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا۔ "حیدر آباد سندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خدا کرے دونوں خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں عین وقت پر آ پہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائے گا —— کیوں کیا خیال آپ کا۔"

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدر آباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے، سینڈو اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً حیدر آباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سُود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدر آباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی غلام حسین کی پُر زور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل سے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دوگنی ہو گئی مجھ سے اُس نے کہا "منٹو صاحب خوبصورت، جوان اور بڑا لائق آدمی ہے —— میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی —— بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیے اور پانچ ہزار نقد دیے۔

محمد شفیق طوسی۔ محمد یٰسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل۔ سینڈو میوزک ٹیچر میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دولہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا۔ "دھڑن تختہ!"

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارکباد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لیے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں کہا "منٹو صاحب ذرا اندر جائیے اور دیکھیے زینو دولھن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔"

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سُرخ زربفت کا شلوار کُرتہ پہنے تھی —— دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سُرخی بہت بُری معلوم ہوتی ہے۔ مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا "یہ کیا مسخرہ پن ہے۔"

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔ "آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان۔" اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے اس غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اُس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دُکھ کے ساتھ مجھ سے کہا "منٹو صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں —— زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔"

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اُسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن بیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔ "خدا تمھیں خوش رکھے۔"

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی —— بہت ہی دُکھ بھری ملامت —— اور چلا گیا۔

("چغد" میں سے)

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی، جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اُس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ "دِس لیف ـــــ ویری بیڈ"۔ یعنی یہ زندگی بہت بُری ہے جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔"

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اُس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے۔ تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی "صاحب ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا"۔ اور وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی "صاحب تم ایک دم اُلّو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ـــــ سمجھا"۔ یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی ـــــ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اُلّو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی۔ ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے۔ جہاں اس نے سُنا تھا کہ بڑے صاحب رہتے ہیں۔ جو گرمیوں میں شملے جاتے ہیں۔ صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خُدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا۔ "بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے"۔ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا۔ "دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو نہ ہو گا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ"۔ چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب وہ دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اُتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ "لائیے ایک روپیہ دودھ کا"۔ اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ

نے بھی چپکے سے لے لی کہ جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں ہیں —— بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اُٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ زنجیر اسی لیے لگائی گئی ہے کہ اُٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اُس نے زنجیر کو پکڑ کر اُٹھنا چاہا اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سُنی۔ دوڑ کر باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا "کیا ہوا؟ —— یہ چیخ تمہاری تھی؟"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا "یہ مُوا پیخانہ ہے یا کیا ہے؟ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھما کا ہُوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہُوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھی۔ چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لیے اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہُوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں آیا۔ جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اُس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اُٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعے سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بُندے خریدے۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں، اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سُن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اُسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دوکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں۔ اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تیار کرنے میں بہت دقّت محسوس ہوئی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکّی نشانی مل گئی۔ "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے"۔ یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں۔ مثلاً بڑے بڑے حروف میں "جہاں کوئلوں کی دکان" لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے لیے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے"۔ لکھا تھا وہاں اُس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانے کے اُوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی آدمی اُس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اُسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا۔ "کیا بات ہے خدا بخش۔ پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا ـــــ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے"۔ خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصے سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا۔ پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا "میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ بھاگ کر دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں ـــــ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ....." وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اُس کی آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک

تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے۔ یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جُدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ۔ کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اُسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں، آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے —— یہاں کیا دھرا ہے؟ —— بھئی ہو گا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے:

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "نہیں جانِ من! انبالے نہیں جائیں گے۔ یہیں دلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اُتر گئی۔ بُچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دُکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی۔ پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا

جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دُکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں، جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت بُرا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جُلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی۔ کبھی اپنے پُرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آ کر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اُس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال واسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں یہ لوہے کی پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح اُبھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اُٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے مُنہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اُٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھُل مِل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی

جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اُسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے ——— نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہوگا اور وہ کہیں رُک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی۔ پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دُھواں اُٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں۔ جن کو چند موٹے موٹے انجن اِدھر اُدھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے۔ جو کبھی کبھی انبالے میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اُوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا، دماغ کی خرابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا۔ "دیکھو میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔" مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی۔ "جانِ من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا۔"

پُورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آرہا تھا" مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی۔ جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی۔ کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دُکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت اُداس تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اُس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا ——— چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لیے

گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اُونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مُسکرا دی اور اُس کو بھول گئی۔ کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا۔ کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اُسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ مگر پھر بڑی پھرتی سے اُوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اُسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اُس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا۔ "آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے۔" وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا ——— ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اس پر سلطانہ نے کہا "میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر اِدھر آئے۔" وہ یہ سن کر پھر مسکرایا۔ "تمھیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمھارے اُوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا۔ "آپ جا رہے ہیں؟" اس آدمی نے جواب دیا۔ "نہیں میں تمھارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں ——— چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اُس آدمی نے کہا۔ "میرا نام شنکر ہے۔"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف سے دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اُوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اُس نے شنکر سے کہا۔ "فرمایئے ......"

شنکر بیٹھا تھا یہ سن کر لیٹ گیا۔ "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمھیں نے ہے مجھے۔" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ "میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے، مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔"

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں..... میں..... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں کچھ بھی نہیں کرتا۔"

سلطانہ نے بھنّا کر کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی۔"

"جھک مارتی ہوں۔"

"میں بھی جھک مارتا ہوں۔"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں۔"

"حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔"

"ہوش کی دوا کرو —— یہ لنگر خانہ نہیں۔"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں۔"

سلطانہ یہاں رُک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "اُلّو کے پٹھے۔"

"میں اُلّو کی پٹھی نہیں۔"

"مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمھارے ساتھ رہتا ہے، ضرور اُلّو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدارسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا۔ "تم ہندو ہو۔ اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔"

شنکر مسکرایا۔ "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہُوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔"

"جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو —— بولو رہو گے؟"

"اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں۔"

سلطانہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "تو جاؤ رستہ پکڑو۔"

شنکر آرام سے اُٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا۔ "میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا

کرتا ہوں۔ جب بھی تمھیں میری ضرورت ہو بلا لینا ——— بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دُکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت اُداس رہتی تھی اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند ہیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا۔ "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "پُرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں ———"

"کچھ انھوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے ——— پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی۔ "سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو ——— میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں، کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا؟ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا۔ "پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے ——— خدا کے لیے اب ایسی دُکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے۔ اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم ......"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا: "تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو، پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیص پڑی ہے۔ اس کو میں رنگوا لوں گی۔ سفید نینوں کا ایک دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیص کے ساتھ رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو ...... دیکھو تمھیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو ——— میری بھتّی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔"

خدا بخش اُٹھ بیٹھا۔ "اب تم خواہ مخواہ زور دیے چلی جا رہی ہو ——— میں کہاں سے لاؤں گا ——— افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔"

"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔"

لیکن تم کچھ نہیں کرو گے —— تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ "لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی۔ کچھ دیر سوئی رہی۔ اِدھر اُدھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں۔ جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اُٹھی تو چار بج چکے تھے۔ کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آکھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہو گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی —— مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اُسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اُسے اُوپر بلا لیا۔

جب شنکر اُوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اُس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے ان کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا۔ "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ —— میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی۔ "نہیں بیٹھو، تمھیں جانے کو کون کہتا ہے۔"

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ "تو میری شرطیں تمھیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ —— نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں —— چھوڑو ان فضولیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔"

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو —— کوئی ایسی بات کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی کہنے لگی۔ "صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"جو دوسرے چاہتے ہیں۔" شنکر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں فرق ہی کیا رہا۔"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا۔ "میں سمجھ گئی۔"

"تو کہو، کیا ارادہ ہے۔"

"تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔"

"تم غلط کہتی ہو —— اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

"سلطانہ ہی ہے۔"

شنکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا۔ "میرا نام شنکر ہے —— یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ اندر چلیں۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ "شنکر میری بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا۔ "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر......"

"کہو کہو —— رُک کیوں گئی ہو۔"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا۔ "بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں —— یہاں کے سارے دُکھڑے تو تم مجھ سے سُن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔"

شنکر نے یہ سُن کر کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا۔ "نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔"

شنکر مسکرایا۔ "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو گئیں۔" سلطانہ کے بُندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا۔ "کیا یہ بُندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "تم انھیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بُندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"

اس پر شنکر نے کہا۔ "میں نے تم سے بُندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو۔"

"لے لو۔" یہ کہہ کر سلطانہ نے بُندے اُتار کر شنکر کو دے دیے۔ اس کے بعد اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا "ساٹن کی کالی شلوار ہے ——— دیکھ لینا شاید لمبی ہو ——— اب میں چلتا ہوں۔"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اُٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔"

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بُندوں اور اس سودے کا جو افسوس اُسے ہوا تھا۔ اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دُور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا: "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے ——— کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا "آج ہی درزی لایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں۔ "یہ بُندے تم نے کہاں سے لیے؟"

مختار نے جواب دیا "آج ہی منگوائے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

("دھواں" میں سے)

ٹوبہ ٹیک سِنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے، یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیے گئے تھے۔ جو باقی تھے اُن کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پہنچا دیے گئے۔

اُدھر کا معلوم نہیں۔ لیکن اِدھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ "زمیندار" پڑھتا تھا اس سے جب اُس کے ایک دوست نے پوچھا "مولبی ساب، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے"۔ تو اُس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ "ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں اُسترے بنتے ہیں۔"

یہ جواب سُن کر اُس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پُوچھا۔ "سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے —— ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔

دوسرا مُسکرایا۔ "مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے —— ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں ——"

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی اَن پڑھ اور جاہل تھے۔

ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائداعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے —— یہ کہاں ہے۔ اس کا محلِ وقوع کیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا۔ اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا —— "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں —— میں اس درخت ہی پر رہوں گا۔"

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی پاس ریڈیو انجنیئر میں جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم رکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے —— اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو

بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یوریپین وارڈ رہے گا یا اُڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے، پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب وغریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین" دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لیے بھی نہیں سویا۔ لیٹتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔"

لیکن بعد میں، "آف دی پاکستان گورنمنٹ"، کی جگہ "اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ"، نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے، لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا، پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے، چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لیے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتے دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کونسا ہے، مہینہ کونسا ہے، یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا

چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑدی گڑ گڑدی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور کہا "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔"

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو مگر وہ بہت مصروف تھا اس لیے کہ اُسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن وہ تنگ آکر اس پر برس پڑا۔ "اوپڑدی گڑ گڑدی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف واہے گوروجی دا خالصہ اینڈ واہے گوروجی کی فتح ——— جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو ——— سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لیے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اُسے روکا۔ "یہ تم سے ملنے آیا ہے ——— تمہارا دوست فضل دین ہے۔"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ——— تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ——— مجھ سے جتنی مدد ہو سکی، میں نے کی ——— تمہاری بیٹی روپ کور ......"

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا ——— بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا "بیٹی روپ کور۔"

فضل دین نے رُک رُک کر کہا "ہاں ...... وہ ...... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے ——— ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔"

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا۔ "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری خیر خیریت پوچھتا رہوں ——— اب میں نے سُنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ——— بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا ——— اور بہن امرت کو سے بھی ...... بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے ——— دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ——— دوسری کے کٹی ہوئی تھی، پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی ...... اور ...... میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں ...... اور یہ تمھارے لیے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟"

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا "کہاں ہے ——— وہیں ہے جہاں تھا۔"

بشن سنگھ نے پھر پوچھا "پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

"ہندوستان میں ——— نہیں نہیں پاکستان میں۔" فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے منہ!"

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا بھی دن مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں، متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا، کیونکہ اِدھر اُدھر بھاگ اُٹھتے تھے، جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کے اپنے تن سے جدا کر دیتے ——— کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ——— پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لیے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے "پاکستان زندہ باد" اور "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سُن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اُس پار متعلقہ افسر اُس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اُس نے پوچھا۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے ——— پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

متعلقہ افسر ہنسا "پاکستان میں"

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اُس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے" —— اور زور زور سے چلّانے لگا۔ "اوپڑ دی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان"

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے —— اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سُوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی، اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سُورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی —— اِدھر اُدھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے مُنہ لیٹا ہے۔ اِدھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا —— اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

("پھندنے" میں سے)

(میلو ڈراما)

اس منجدھار میں

کردار

بیگم .... ماں

امجد .... } بیگم کے بیٹے — شکستہ

مجید .... } — ثابت وسالم

سعیدہ .... امجد کی نئی نویلی حسین بیوی

اصغری .... خادمہ

کریم اور غلام محمد..... نوکر

پہلا منظر

(زنگارہ ولا کا ایک کمرہ —— اس کی خوبصورت شیشہ لگی کھڑکیاں پہاڑی کی ڈھلوانوں کی طرف کھلتی ہیں۔ حدِ نظر تک پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے ہیں جو آسمان کی خاکستری مائل نیلاہٹوں میں گھل مل گئے ہیں۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردے صبح کی ہلکی پھلکی ہوا سے ہولے ہولے سرسرا رہے ہیں۔ یہ کمرہ جیسا کہ ساز وسامان سے معلوم ہوتا ہے حجلۂ عروسی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کو کھڑکیوں کے پاس ساگوان کی مسہری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کونے میں شیشے کی تپائی جس پر بلور کی صراحی اور گلاس کے علاوہ ایک ٹائم پیس رکھی ہے پیچھے ہٹ کر پیازی ٹفیٹے میں ملبوس صوفہ سیٹ ہے۔ اس پر دو ملازم گدیاں سجا رہے ہیں —— اس سے دور ہٹ کر ایک نوجوان خادمہ جو معمولی شکل وصورت کی ہے آتشدان پر سجائی ہوئی مختصر چیزوں کو اور زیادہ سجانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کمرے کی فضا میں ایسی دوشیزگی ہے جو ذرا سی جنبش سے منکوحیت میں تبدیل ہو سکتی ہے —— باہر سے ٹائلوں پر لکڑی کی ننھی ننھی ضربوں کی آواز آتی ہے۔ تینوں خادم ہلکے سے ردِ عمل کے بعد اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں —— دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی وجیہہ عورت بیساکھیوں کی مدد سے اندر آتی ہے اور کمرے کا جائزہ لے کر اپنے اطمینان کا اظہار کرتی ہے)۔

بیگم صاحب۔ (بیساکھیوں کی مدد سے کمرے میں اِدھر اُدھر پھر کر تمام چیزوں کو صحیح مقام پر دیکھ کر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے) ٹھیک ہے! (ایک بیساکھی کو اپنی بغل سے الگ کر کے صوفے کے ساتھ رکھ کر بیٹھنا چاہتی ہے، مگر فوراً ہی اپنا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ سہارے کے لیے صوفے کے بازو کی چکیلی سطح کے ساتھ چھوا تھا اور اس پر نشان پڑ گیا تھا۔ اپنے دوپٹے کا ایک کونہ پکڑ کر وہ یہ خود بخود مٹ جانے والا نشان بجھا دیتی ہے اور پھر بیساکھی اپنی بغل میں جما کر نوجوان خادمہ سے مخاطب ہوتی ہے) اصغری!

اصغری۔ (فوراً متوجہ ہو کر) جی!

بیگم صاحب۔ (ایک دم یہ محسوس کر کے کہ وہ بھول گئی ہے کہ اس نے اصغری سے تخاطب کیوں کیا تھا) میں کیا کہنے والی تھی؟

اصغری۔ (مسکراتی ہے) آپ یہ کہنے والی تھیں کہ آپ کا اطمینان نہیں ہوا ...... میں بھی یہی سمجھتی ہوں بیگم صاحب ——— دولہن بہت خوبصورت ہے ——— اس کمرے کی تمام سجاوٹیں اس کے سامنے ماند پڑ جائیں گی۔ (وہ آتشدان کے عین درمیان میں ریشمی ڈوریوں سے آویزاں، دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے)۔

بیگم صاحب۔ (مسکراتی ہوئی ——— آتشدان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور اپنی بہو کی تصویر کو غور سے دیکھتی ہے ——— خوش ہوتی ہے۔ لیکن ایک دم گھبرا سی جاتی ہے) اصغری!

اصغری۔ جی!

بیگم صاحب۔ صبح سے میری طبیعت ——— کچھ گھبرا سی رہی ہے۔

اصغری۔ امجد میاں جو آ رہے ہیں اپنی دولہن کے ساتھ۔

بیگم صاحب۔ (اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی) ہاں ..... بس آنے والا ہے ..... کمال موٹر لے گیا ہے اسٹیشن پر۔

اصغری۔ اگلے سال مجید میاں کی شادی کر لیجیے ——— گھر میں رونق ہی رونق ہو جائے گی۔

بیگم صاحب۔ انشاء اللہ ——— وہ بھی انشاء اللہ اسی طرح بخیر و خوبی انجام پائے گی ..... (زیرِ لب) انشاء اللہ۔

اصغری۔ (دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے حُسن سے بہت متاثر ہوتی ہے) اللہ نظرِ بد سے بچائے۔

بیگم صاحب۔ (غیر ارادی طور پر تقریباً چیخ کر) اصغری!

اصغری۔ (سہم کر) جی!

بیگم صاحب۔ کچھ نہیں ..... گاڑی کب آتی ہے کراچی سے!

اصغری۔ معلوم نہیں بیگم صاحب۔

بیگم صاحب۔ (ایک خادم سے) دیکھو کریم۔ تم ٹیلیفون کرو اور پوچھو .... لیکن گاڑی تو کل ہی کی راولپنڈی پہنچ چکی ہے ——— مجید کا تار جو آیا تھا۔

کریم۔ جی ہاں!

بیگم صاحب۔ اور میں نے کمال کو کس اسٹیشن پر بھیجا ہے ...... (گھبراکر) خدا معلوم میرے دماغ کو کیا ہوگیا ہے ......
امجد میاں کو رات راولپنڈی ٹھیرنا تھا ...... اپنے دوست سعید کے پاس ...... اور وہ تو میرا خیال ہے اب
وہاں سے چل بھی چکے ہوں گے (دوسرے خادم سے) غلام محمد؟

غلام محمد۔ جی ؟

بیگم صاحب۔ تم دیکھو کمال کہاں ہے ...... موٹر کہاں لے گیا ہے ؟

غلام محمد۔ بہت اچھا! (چلا جاتا ہے)

بیگم صاحب۔ (اصغری کے کاندھے کا سہارا لے کر) آج صبح سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ۔ چلنے پھرنے سے معذور نہ ہوتی ——اس کم بخت ڈاکٹر ہدایت اللہ نے مجھے منع کر دیا ہوتا تو میں دلہن کو ساتھ لاتی ۔ دور سے ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے ، میرا خیال ہے ، شاید امجد میاں کے دوست سعید کا ٹیلیفون ہے کہ وہ چل پڑے ہیں ، جاؤ اصغری ...... بھاگ کے جاؤ۔ (اصغری دوڑی باہر جاتی ہے)

بیگم صاحب۔ (کریم سے) —— اپنی افسردگی دور کرنے کی خاطر) بس اب آتے ہی ہوں گے ، امجد میاں ۔

کریم۔ اللہ خیریت سے لائے ۔

بیگم صاحب۔ (قریب قریب چیخ کر) کیا مطلب تمہارا ۔

کریم۔ (ڈر کر) جی یہی کہ ...... جی یہی ......

(اصغری کی چیخیں سنائی دیتی ہیں "بیگم صاحب ، بیگم صاحب"!)

بیگم صاحب۔ (سراسیمہ ہو کر) کیوں کیا ہوا؟

(اصغری سخت اضطراب کی حالت میں اندر داخل ہوتی ہے)

اصغری۔ بیگم صاحب —— بیگم صاحب ۔

بیگم صاحب۔ (بیساکھیوں کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر) کیا ہے ؟

اصغری۔ جی ...... مجید میاں کا ٹیلیفون آیا ہے کہ گاڑی ...... گاڑی ٹکرا گئی ہے ۔

بیگم صاحب۔ (بیساکھیوں پر ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے ، پھر؟

اصغری۔ امجد میاں اور ان کی دلہن دونوں زخمی ہوئے ہیں اور ہسپتال میں پڑے ہیں۔

بیگم صاحب۔ (ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے —— بیساکھیاں بغل سے گر پڑتی ہیں - ایک لمحے کے لیے وہ یوں کھڑی رہتی ہے ، جیسے پتھر کا بت —— (پھر اس میں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے - اور وہ دروازے کی جانب بڑھتی ہے) کمال سے کہو موٹر نکالے —— ہم راولپنڈی جا رہے ہیں ۔

(بیگم دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے —— غلام محمد اور اصغری دونوں حیرت زدہ ہیں ۔)

اصغری زور سے چیختی ہے ——— بیگم پلٹ کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

بیگم صاحب۔ کیا ہے ؟
اصغری۔ آپ ——— آپ چل رہی ہیں ——— چل سکتی ہیں۔
بیگم صاحب۔ میں ؟ (اپنی بغلوں میں بیساکھیوں کی عدم موجودگی کا احساس کرتے ہوئے) میں ؟ ...... میں کیسے چل سکتی ہوں ؟
(ایک دم چکراتی ہے اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے)
اصغری۔ (بیگم کے پاس جاتے ہوئے، غلام محمد سے) غلام محمد جاؤ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو۔
(غلام محمد چلا جاتا ہے ——— اصغری بیگم کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی ہے)

پردہ

دوسرا منظر

وہی کمرہ جو پہلے منظر میں ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو ساز و سامان پہلے پڑا تھا۔ اب اپنا نیا نویلا پن کھو چکا ہے۔ اب ہر چیز دیر کی استعمال شدہ معلوم ہوتی ہے ——— صبح کا وقت ہے۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردے صبح کی ہلکی پھلکی ہوا سے سرسرا رہے ہیں ——— دائیں ہاتھ کی ساگوان کی مسہری پر دولہن سعیدہ کمبل اوڑھے لیٹی ہے ——— شیشے کی تپائی پر پڑا ہوا ننھی ٹائم پیس جس میں نو بجے ہیں، لرزنا شروع کر دیتی ہے ——— ہلکی سی گھنٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے ——— کمبل میں جنبش پیدا ہوتی ہے ——— سعیدہ کروٹ بدلتی ہے اور آنکھیں کھولتی ہے جھک کر ننھی ٹائم پیس کی طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے پر چھائی ہوئی گھنی پلکیں پھڑپھڑاتی ہیں ——— کروٹ بدل کر وہ بستر میں تکیوں کا سہارا لے کر ذرا اوپر اٹھ آتی ہے اور باہر حدِ نظر تک پھیلی ہوئی پہاڑیوں کا دلکش منظر دیکھ کر بچوں کی سی مسرت محسوس کرتی ہے ——— پھر ایک دم ٹانگیں چلا کر کمبل اوپر سے ہٹاتی ہے اور اچک کر مسہری سے اتر آتی ہے اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنا شروع کر دیتی ہے ——— کسی خوش الحان پرندے کی آواز سنائی دے رہی ہے ——— سعیدہ اپنے خیالوں میں محو ہے۔ وہ جوان ہے۔ شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا ریشمی لباس بھی جو اس کے بدن سے دور دور اپنی حریری دنیا الگ بسائے ہے، اس کے خوبصورت خطوط سے غافل نہیں ...... اور خود سعیدہ کا ادراک بھی ...... اس کا سراپا حسین و جمیل ہے اور اپنے حسن و جمال سے آگاہ ...... اصغری کی کرخت آواز، پرندے کی خوش الحانی کا تقابل پیش کرتی ہے۔ سعیدہ چونکتی ہے)۔

سعیدہ۔ (نگاہوں ہی نگاہوں میں "کیا ہے" پوچھتی ہے)
اصغری۔ مجید میاں ابھی ابھی ہسپتال سے آئے ہیں۔ کہتے تھے، جا کے دیکھو، اب جگ گئیں یا نہیں ؟

سعیدہ۔ کیا خبر لائے ہیں ؟

اصغری۔ میں انھیں بھیجتی ہوں۔

(اصغری چلی جاتی ہے۔ سعیدہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر سنگھار میز کے پاس آتی ہے۔ آئینے میں ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کا جائزہ لیتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے بال سرسری طور پر ٹھیک کر کے مسہری کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ مسہری کے سرہانے اس کا جارجٹ کا سفید دوپٹہ لٹک رہا ہے۔ اسے اتارتی ہے اور بڑی بے توجہی سے اپنے کاندھوں پر ڈال لیتی ہے ——— باہر سے بوٹوں کی چرمی آواز آتی ہے۔ خفیف سے ردِ عمل کے ساتھ سعیدہ دروازے کی جانب دیکھتی ہے ——— مجید ——— سانولے رنگ کا، متوسط قد نوجوان، جو مضبوط ہاتھ پاؤں رکھتا ہے اور جس کے چہرے کے خطوط عمر کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور منجھے ہوئے ہیں، اندر داخل ہوتا ہے)۔

مجید۔ سلام بھابی جان!

سعیدہ۔ سلام۔

مجید۔ (صوفے کے پاس آکر رکتے ہوئے) طبیعت کیسی ہے آپ کی ؟

سعیدہ۔ (بے دلی سے) ٹھیک ہے (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) سنائیے کیا خبر لائے راولپنڈی سے ؟

مجید۔ (سعیدہ کے سامنے آکر) کوئی خاص بات نہیں (آدھی سی آہ بھر کر) بس اب انھیں لے آئیں گے یہاں۔

سعیدہ۔ کیوں ؟

مجید۔ وہ تنگ آگئے ہیں (ایک مونڈھا گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے) ان کی جگہ میں ہوتا تو..... بہت ممکن ہے میں نے خودکشی کر لی ہوتی۔

سعیدہ۔ (اُٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) کیا معلوم تھا کہ میری قسمت میں یہ لکھا ہے..... اتنے آدمی مرے..... میں بھی ساتھ ہی مر گئی ہوتی۔

مجید۔ مگر یہ اللہ کو منظور نہیں تھا۔

سعیدہ۔ (کھڑکی سے باہر پہاڑیوں کا منظر دیکھتی ہے) ہاں، یہ اللہ کو منظور نہیں تھا ——— اللہ کو یہ منظور تھا کہ میری ٹانگ پر ہلکی سی خراش آئے پر میری ساری زندگی زخموں سے چور چور ہو جائے (آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں ——— سفید دوپٹے سے وہ انھیں ہر نزاکت طریقے سے ہولے ہولے خشک کرتی ہے) اللہ کو یہ منظور تھا کہ میرے سہاگ کی کمر ٹوٹ جائے اور میں ساری عمر ہوا میں کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ڈولتی رہوں۔

(سسکیاں لیتی ہے)

مجید۔ (اُٹھتا ہے) بھابی جان حوصلے سے کام لینا چاہیے..... کیا پتا ہے وہ ٹھیک ہو جائیں۔

سعیدہ۔ (سرزنش کے طور پر) مجید، کم از کم تم تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو ——— چھ مہینے ہو گئے ہیں انھیں ہسپتال

کی چارپائی کے ساتھ لگے ہوئے ...... ڈاکٹروں کا جو فیصلہ ہے، میں اُسے اچھی طرح جانتی ہوں ...... وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے ...... ان کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو چکی ہیں ...... لیکن ...... لیکن، میں ایک بات مانتی ہوں کہ ان میں بہت حوصلہ ہے ...... میں جب بھی ان کے پاس گئی، انھوں نے مجھے پاس بٹھا کر کہا، سعیدہ! کچھ فکر نہ کرو، میں بہت جلد تندرست ہو جاؤں گا ...... اور پھر میں تمھیں ان پہاڑیوں کی سیر کراؤں گا جن کا ذکر تم کراچی میں اتنی بار میرے مُنہ سے سُن چکی ہو ...... مجھے ان پہاڑیوں سے پیار ہے ...... اتنا پیار ہے کہ تم ان کے متعلق اور سنو گی تو رشک کرو گی ...... اور وہ مجھے حوصلہ دینے لگتے کہ سعیدہ دنیا حادثوں کا دوسرا نام ہے ...... میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری جان نہیں گئی ...... ورنہ ...... پھر وہ ایسی بات کہتے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

مجید۔ کیا؟

سعیدہ۔ (نمناک آنکھوں سے خلا میں دیکھتے ہوئے) کہ تم ...... کہ تم میرے بعد کسی اور کی ہو جاؤ گی —— (کانپ جاتی ہے ...... وہ ...... ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں مجید؟

مجید۔ معلوم نہیں۔

سعیدہ۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے (آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے —— دوپٹہ ڈھلک آتا ہے —— حریری لباس میں اس کا متلاطم سینہ ریشمی اُتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے)، تم مرد ہو ...... تم اس کے بھائی ہو ...... اگر اس حادثے کے تم شکار ہوتے ...... تو؟

مجید۔ میں کبھی ایسی باتیں نہ سوچتا جو امجد بھائی سوچتے ہیں؟

سعیدہ۔ کیوں؟

مجید۔ ہم دونوں مرد ہیں —— دونوں بھائی ہیں —— مگر دل اور دماغ کے اعتبار سے ہم دونوں بہت مختلف ہیں۔

سعیدہ۔ (بڑبڑاتی ہے) دل ...... اور دماغ۔

(اصغری داخل ہوتی ہے)

اصغری۔ مجید میاں، آپ کو بیگم صاحب بلاتی ہیں۔

مجید۔ چلو، میں آتا ہوں۔

اصغری۔ انھوں نے کہا ہے جلدی آیئے۔

مجید۔ اچھا ...... (سعیدہ کی طرف دیکھ کر) میں ابھی آتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

اصغری۔ (فرش پر بچھے ہوئے رَگ پر سعیدہ کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے اور اُس کے پاؤں کی اُنگلیاں چٹخانا چاہتی ہے)

سعیدہ۔ (پاؤں ایک طرف کھینچ کر) جانے دو اصغری۔

اصغری۔ (پاؤں سے قریب قریب لپٹ کر) نہیں دولہن بیگم۔ (انگلیاں چٹخانا شروع کر دیتی ہے)..... کیا خبر لائے ہیں مجید میاں۔

سعیدہ۔ کہتے تھے، وہ یہاں آنا چاہیے ہیں۔

اصغری۔ یہ تو بڑی خوش خبری کی بات ہے۔

سعیدہ۔ (دُکھ کے ساتھ) ہاں!

اصغری۔ پر بیگم صاحب تو بہت ناراض ہو رہی تھیں کہ اتنی دیر کیوں لگا دی مجید میاں نے۔

سعیدہ۔ کہاں؟

اصغری۔ یہاں —— آپ کے پاس۔

سعیدہ۔ میرے پاس؟ —— کیا کہتی تھیں بیگم صاحب۔

اصغری۔ کچھ نہیں —— ان کا مزاج آج کل بہت چڑچڑا سا رہتا ہے —— انھیں کوئی بات اچھی نہیں لگتی —— انھیں ...... امجد میاں کا اتنا دُکھ نہیں جتنا آپ کا ہے ...... ہر وقت آپ ہی کے متعلق سوچتی رہتی ہیں تو...؟ ..... امجد میاں ٹھیک ہو گئے ہیں نا؟

سعیدہ۔ (چڑ کر، اپنا پاؤں ہٹا کر اُٹھتے ہوئے) ہاں ٹھیک ہو گئے ہیں۔

(بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اصغری اُٹھ کھڑی ہوتی ہے)

سعیدہ۔ سلام خالہ جان!

بیگم صاحب۔ سلام بٹیا —— جیتی رہو (پاس آکر سعیدہ کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیرتی ہے) تمھیں معلوم ہو گیا مجید سے کہ....

سعیدہ۔ جی ہاں!

بیگم صاحب۔ غریب تنگ آ گیا ہے وہاں ہسپتال میں...... (اصغری کی طرف دیکھ کر) اصغری تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے)

بیگم صاحب۔ اس کی..... اس کی خواہش ہے کہ وہ تمھارے پاس رہے..... اس نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میری سعیدہ میری نظروں کے سامنے ہونی چاہیے......

سعیدہ۔ (آنکھوں میں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ بیگم کے گلے سے لگ جاتی ہے)

بیگم صاحب۔ (آنکھوں میں آنسو رواں ہیں) وہ..... وہ تم سے بے انداز محبت کرتا ہے..... لیکن..... لیکن اس نے کہا تھا، تم سے پوچھ لیا جائے کہ تمھیں اس کے یہاں آ کر رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔

سعیدہ۔ اعتراض......

بیگم صاحب۔ ہاں بٹیا —— ہو سکتا ہے، یُوں تمھارے دُکھ میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

سعیدہ - وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں — خالہ جان وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔

بیگم صاحب۔ بیٹا، وہ کچھ ایسے ہی دل و دماغ کا آدمی ہے — اس کو دوسروں کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔

سعیدہ۔ آئیں ...... کیوں نہ آئیں (لہجے میں چیخ سی پیدا ہو جاتی ہے) وہ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔

بیگم صاحب۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے، اگر وہ خوش رہے تو انشاء اللہ ایک دو مہینے میں بیساکھیوں کی مدد سے چل پھر سکے گا...... (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) بیساکھیاں...... جو اس کے گاڑی کے حادثے کی خبر سن کر میری زندگی سے الگ ہو گئی تھیں...... مجھے معلوم ہوتا کہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والی ہیں تو میں ان کو مضبوطی سے پکڑ کے رکھتی...... مگر بیٹا اس منجدھار میں جسے زندگی کہتے ہیں مضبوط سے مضبوط کشتی لے ڈوبتی ہے اور ایک معمولی تنکا ہی کنارے لگا دیتا ہے...... (توقف کے بعد) سعیدہ بیٹیا، امجد نے مجھ سے ایک اور بات تم سے پوچھنے کو کہا تھا؟

سعیدہ۔ کیا خالہ جان؟

بیگم صاحب۔ کیا تم اس سے محبت کرو گی؟

سعیدہ۔ (بوکھلا کر) محبت......

بیگم صاحب۔ (سعیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) میں تمھیں زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی......

(چلی جاتی ہے)

سعیدہ۔ (دوپٹے سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) محبت — محبت؟ — دل و دماغ (آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، آتشدان کے عین وسط میں ریشمی ڈوریوں سے لٹکی ہوئی اپنی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے) بتا — کیا تو اس سے محبت کرے گی؟

(ٹرے میں رکھی ہوئی پیالیوں کی آواز آتی ہے — اصغری ناشتہ لیے اندر داخل ہوتی ہے اور پہیوں والی تپائی صوفے کے آگے لے جاتی ہے اور اس پر ناشتہ چن دیتی ہے)

اصغری۔ دولہن بیگم، امجد میاں سے محبت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی؟

سعیدہ۔ (ایک دم چونکتی ہے) کیا کہا؟

اصغری۔ جی کچھ نہیں...... ایسے ہی آپ سے باتیں کر رہی تھی — ناشتہ کر لیجیے۔

سعیدہ۔ تم جاؤ۔

اصغری۔ جی اچھا۔

(اصغری ایک نظر سعیدہ کو اور ایک نظر اس کی تصویر کو دیکھتی باہر چلی جاتی ہے۔ سعیدہ آہستہ آہستہ سوچ میں مستغرق صوفے کی طرف بڑھتی ہے اور مسہری پر لیٹ جاتی ہے۔)

سعیدہ۔ (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) دولہن بیگم، امجد میاں سے محبت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی ——
(اونچی آواز میں) اور کون کرے گی؟ —— اور کون کرسکتی ہے؟

(پردہ)

تیسرا منظر

(نگار ولا سے ملحقہ باغیچہ —— وسط میں پست قد ترشی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان فوارہ ہے جس میں سے پانی کی پھوار دھڑک دھڑک کر باہر نکل رہی ہے۔ دھوپ کھلی ہے آسمان نکھرا ہوا ہے۔ فضا میں عجیب سا کنوارپن ہے —— بے حجاب۔ ہر ذرہ نظارے کی دعوت لیے گویا قبولیت کا منتظر ہے —— ایسا معلوم ہوتا ہے ہوا چلتے چلتے ٹھہر سی گئی ہے کہ باغ کی بیلیں پھر سے اپنی زلفیں سنوار لیں، پھول اپنے گالوں کی سرخی درست کرلیں اور بھونروں کو جن کلیوں کا منہ چومنا ہے، بے خوف و خطر چوم لیں —— اس فضا میں گھاس کے ہموار قالین پر کرسیاں بچھی ہیں۔ ایک میں سعیدہ گلابی لباس میں ملبوس خود اپنا ہی عکس بنی بیٹھی ہے۔ دھوپ کی حدت سے اس کے غازے کے ہلکے سے غبار سے اس کی اپنی گلابیاں، سرخیاں بن بن کر باہر نکل رہی ہیں۔ دوسری کرسی میں مجید ہے جو ہولے ہولے سگرٹ کے کش لگا کر دھوئیں کے نیلے نیلے چھلے منہ سے نکال رہا ہے۔ اس کا چہرہ مطمئن ہے۔ سامنے امجد ہے —— اپاہجوں کی کرسی میں اس کے چہرے پر اپاہجوں کی کرسی والی کیفیت ہے جو کسی اور کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی —— اس کا رنگ بہت زرد ہے مگر اس کی آنکھوں میں چمک ہے جو سعیدہ کے حسن و جمال کی بازگشت ہے)۔

امجد۔ (اپنے دائیں بائیں دیکھ کر) آج موسم کتنا دلفریب ہے۔

سعیدہ۔ (فوراً متوجہ ہو کر) جی ہاں۔

امجد۔ مجید، جاؤ سعیدہ کو گھما لاؤ —— ان پہاڑیوں کی سیر کرا لاؤ —— (پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا ہے) افسوس ہے مجھ سے مڑا نہیں جاتا —— مجید اٹھو —— میری کرسی گھما کر ادھر کردو —— یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہونا چاہیے۔

(مجید اٹھتا ہے لیکن سعیدہ اس سے پہلے اٹھ کر امجد کی کرسی کا رخ پھیر دیتی ہے۔ اب تینوں کا منہ پہاڑیوں کی طرف ہے جو دھوپ میں حدِ نگاہ تک اپنے منہ دھو رہی ہیں)

امجد۔ پہاڑیوں کے منظر کو اپنی نگاہوں سے پیتے ہوئے) سعیدہ، یہی ہیں وہ پہاڑیاں جن سے مجھے پیار ہے —— اتنا پیار کہ میں بیان نہیں کرسکتا —— (مجید سے) جاؤ، مجید، سعیدہ کو ساتھ لے جاؤ اور ان کی سیر کراؤ (سعیدہ سے) سعیدہ، جب تم ان پر چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگو گی اور تمہاری سانس رکنے لگے گی تو تمہیں ایسا محسوس

ہوگا کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لذت نہیں..... میں مجید کو زبردستی ساتھ لے جاتا تھا مگر یہ ایک چڑھائی کے بعد ہی ہمت ہار دیتا تھا ——— مجھ سے کہتا تھا، بھائی جان مجھے آپ کا یہ شغل پسند نہیں ——— یہ کیا کہ آدمی بیکار میں ہانپ ہانپ کر بے ہوش ہو جائے (ہنستا ہے) پہاڑیوں اور ان کو سر کرنے کا حسن اُس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے گا۔ کیوں سعیدہ ؟

سعیدہ۔ (مسکرا کر) ہاں جی ہاں۔

امجد۔ (مجید سے) جاؤ یار ——— سعیدہ کو لے جاؤ ——— کبھی کام بھی کیا کرو۔

مجید۔ (سعیدہ سے) چلیے بھابی جان ——— مگر میں شرط لگاتا ہوں، آج تو یہ چلی جائیں گی۔ لیکن پھر کبھی ادھر کا رُخ نہیں کریں گی۔

سعیدہ۔ نہیں نہیں ——— یہ آپ کیونکر کہتے ہیں ؟

امجد۔ اس لیے کہ یہ اور دل و دماغ کا آدمی ہے۔

سعیدہ۔ دل و دماغ ؟ ——— یہ کیا بلا ہے دل و دماغ ؟

مجید۔ آپ کو ایک ہی پہاڑی چڑھنے سے معلوم ہو جائے گا۔

امجد۔ (ہنستا ہے) تم بکتے ہو مجید ——— سعیدہ کی زندگی کے سامنے تو ایک پہاڑ ہے ——— اگر یہ ایک معمولی سی پہاڑی کی چڑھائی سے اُکتا گئی تو......

سعیدہ۔ چلیے مجید میاں۔

مجید۔ چلیے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں ——— امجد مسکراتا ہے ——— اصغری داخل ہوتی ہے ——— اس کے ہاتھ میں پلیٹ ہے جس میں چھلے اور کٹے ہوئے سیب ہیں۔ وہ معنی خیز نظروں سے مجید اور سعیدہ کو دیکھتی امجد کی جانب آتی ہے اور اس سے مخاطب ہوتی ہے)

اصغری۔ تھوڑے سیب کھائیے۔

امجد۔ (جو سعیدہ اور مجید کو ڈھلوانوں میں اُترتے دیکھ رہا ہے) کھا لوں گا۔

اصغری۔ (انہی کی طرف دیکھ کر) آج دولہن بیگم کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں۔

امجد۔ (ایک دم پلٹ کر اصغری کو دیکھتے ہوئے) دکھائی دے رہی ہیں ؟

اصغری۔ (خفیف سی بوکھلاہٹ کے ساتھ) جی ——— جی ہاں !

امجد۔ (پھر سعیدہ اور مجید کو دیکھتے ہوئے) خوبصورت ہے۔ خوبصورت دکھائی نہیں دیتی ——— ہونے اور دکھائی دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے اصغری۔

اصغری۔ جی ہاں ——— یہ تو ہے۔

امجد۔ لاؤ سیب۔

اصغری۔ (پلیٹ بڑھاتے ہوئے) حاضر ہیں — پر چھلے ہوئے ہیں۔

امجد۔ تمہارا مطلب ؟

اصغری۔ چھلی ہوئی چیز سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا ہے (ہنس کر) ...... اس کے سُرخ سُرخ گال تو چھری سے اُتر چکے ہیں۔

امجد۔ (ہنستا ہے) اصغری! — تم اب بہت شیطان ہو گئی ہو۔

اصغری۔ (سنجیدگی سے) شیطان ؟ — امجد میاں — آپ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ شیطان خدا کا سب سے بڑا فرشتہ تھا جس نے آدم — یعنی مٹی کے پتلے کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

امجد۔ ہاں ہاں ......

اصغری۔ اور فرشتوں کے اس ہیڈ ماسٹر کو اس کی سزا دی گئی تھی .....

امجد۔ درست ہے ......

اصغری۔ تو یہ بھی درست ہے۔

امجد۔ کیا؟

اصغری۔ کچھ بھی نہیں — درست آخر ہوتا کیا ہے؟ — وہی جسے آپ درست سمجھ لیں، یا درست سمجھنے کی کوشش کریں، یا وہ غلطی جو آپ ایک دفعہ اس لیے کر لیں کہ آئندہ درست ہوتی رہے گی۔ یا وہ درستی جسے آپ غلطی میں تبدیل کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ آپ پھر درست کر سکتے ہیں — لیکن یہ سب بکواس ہے — میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں امجد میاں۔

امجد۔ تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟

اصغری۔ میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں — لیکن ایک عورت ہوں امجد میاں۔

امجد۔ میں پھر نہیں سمجھا

اصغری۔ (سیب کی ایک قاش اُٹھاتی ہے اور امجد میاں کے مُنہ کے پاس لے جاتی ہے) آپ سیب کھائیے۔

امجد۔ (سیب کی قاش دانتوں میں لیتے ہوئے) تم پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کیا کرتی تھیں۔

اصغری۔ آج موسم ہی کچھ ایسا دلفریب ہے۔

امجد۔ کیا نہیں ہے؟

اصغری۔ (سیب کی دوسری قاش اُٹھا کر) کیوں نہیں ...... یہ لیجیے ایک اور قاش ......

(دوسری قاش امجد کے کھلے ہوئے مُنہ میں ڈالتی ہے)

امجد۔ (سیب کھاتے ہوئے کچھ توقف کے بعد) اصغری!

اصغری۔ (جو پہاڑیوں کا منظر دیکھنے میں محو تھی۔ چونک کر) جی ؟

امجد۔ تمھاری شادی کر دیں ؟

اصغری۔ شادی ؟

امجد۔ ہاں ــــ اب تمھاری شادی ہو جانی چاہیے۔

اصغری۔ کیوں امجد میاں ؟

امجد۔ شادی بڑی اچھی چیز ہے ــــ دُنیا میں ہر شے کی شادی ہو جانی چاہیے ــــ زندگی میں شادی سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں ــــ میں امّی جان سے کہوں گا کہ اصغری کی جلدی شادی کر دیجیے۔

اصغری۔ نہ امجد میاں !

امجد۔ کیوں ؟

اصغری۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔

امجد۔ کس لیے ؟

اصغری۔ (سبزے پر بیٹھ جاتی ہے۔ لہجہ فکر مند ہوتا ہے) شادی سے۔

امجد۔ (ہنستا ہے) پگلی !

اصغری۔ سچ کہتی ہوں امجد میاں ــــ مجھے واقعی ڈر لگتا ہے ــــ اوّل تو ایک نوکرانی کی شادی ہی کیا ہے۔ ہوئی ہوئی، نہ ہوئی ــــ کیا فرق پڑتا ہے...... لیکن ہو گئی تو کہیں ایسا نہ ہو گاڑی پٹڑی سے اُتر جائے اور......

امجد۔ (دُکھ کے ساتھ) اصغری !

اصغری۔ (رکے جاتی ہے) گاڑی پٹڑی سے اُتر جائے اور اصغری قیمہ قیمہ ہونے سے بچ جائے ــــ ایک ٹانگ سے لنگڑی ایک بازو سے ٹوٹی اور ایک آنکھ سے اندھی ہو جائے ــــ آدھی اصغری غائب ہو جائے ــــ آدھی بچ جائے ــــ نا امجد میاں ــــ میری شادی کا نام نہ لیجیے ــــ شادی تو ایک سالم چیز ہے ــــ آدھی یا چوتھائی چیز کو شادی نہیں کہتے۔

امجد۔ (سوچتے ہوئے) اصغری !

اصغری۔ گھٹی گھٹی آواز میں) جی !

امجد۔ تم ٹھیک کہتی ہو (آواز میں انتہا درجے کا درد پیدا ہو جاتا ہے) لیکن دیکھو مجھے رنجیدہ نہ کرو...... میں خوش رہنا چاہتا ہوں ــــ اپنی ان دو شکستہ ٹانگوں پر بھی خوش رہنا چاہتا ہوں ــــ مجھے نہ چھیڑو ــــ میرے دل میں درد ہوتا ہے ــــ

اصغری۔ (امجد کے پاؤں پکڑ لیتی ہے) مجھے معاف کر دیجیے امجد میاں (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) جانے میں کیا بک گئی۔ آپ خوش رہیں ــــ خدا آپ کو خوش رکھے۔

امجد۔ (بہادری کے ساتھ) خدا کا نام نہ لو —— اگر اس کو مجھے خوش رکھنا ہوتا تو مجھے اس حادثے کا شکار ہی کیوں کرتا —— کیا تھا تو مار کر اپنے شکاری تھیلے میں کیوں نہ ڈال لیتا —— اس کا نام نہ لو —— میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے۔ مجھے اگر خوش رہنا ہے تو اپنے رہے سہے وجود ہی کے سہارے خوش رہنا ہے —— انہی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں پر چند تنکے چن کر مجھے اپنی خوشی کے آشیانے بنانا ہیں۔

اصغری۔ صرف اپنی خوشی کے ؟

امجد۔ (بہت زیادہ دُکھ کے ساتھ) اصغری خدا کے لیے —— تم اتنی ظالم کیوں ہو گئی ہو —— تمہارے منہ میں اگر زبان پیدا ہوئی ہے تو کیا اسی لیے کہ تم میرے دُکھ میں اضافہ کرو...... میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میری مدد کرو —— ایک اپاہج کی مدد کرو کہ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی زندگی جوڑ جاڑ کے چند دن —— صرف چند دن گزار لے۔

اصغری۔ آپ درخواست نہ کیجیے امجد میاں —— میرا کلیجہ پھٹتا ہے —— آپ مالک ہیں، حکم دے سکتے ہیں —— میری زندگی حاضر ہے۔

(اس کے موٹے موٹے آنسو امجد کے سلیپروں پر گرتے ہیں —— اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ایک طرف چلی جاتی ہے)

امجد۔ (گردن جھکا کر اپنے سلیپروں کی طرف دیکھتا ہے جن پر سے اصغری کے آنسو ڈھلک جاتے ہیں —— گردن اُٹھا کر اصغری کو دیکھتا ہے جو کہ جا رہی ہے)

(کوٹھی کی جانب سے بیگم نمودار ہوتی ہے۔ شال اوڑھے ہاتھ میں زیورات کے ڈبے لیے وہ امجد کے پاس آتی ہے)

بیگم صاحب۔ امجد بیٹا۔

امجد۔ (جلدی سے اپنے پاؤں کمبل میں چھپا کر) جی!

بیگم صاحب۔ سعیدہ کے یہ جو زیورات تم نے پسند کیے ہیں تیار ہو کر آ گئے ہیں۔ لو......

(ڈبے امجد کی گود میں رکھ دیتی ہے)

امجد۔ (بچوں کے سے اشتیاق سے ہر ڈبہ کھول کر سارے زیورات دیکھتا ہے اور اُبلتی ہوئی خوشی کا اظہار کرتا ہے) بہت اچھے ہیں —— بہت عمدہ ہیں —— بہت حسین ہیں —— لیکن اتنے نہیں جتنی سعیدہ ہے...... اصغری —— اصغری! —— ادھر آؤ۔

(اصغری جو ایک سرو کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ امجد کے پاس آتی ہے۔ امجد اسے تمام زیورات دکھاتا ہے)

امجد۔ کہو، کیسے ہیں ؟

اصغری۔ آپ خود کہہ چکے ہیں —— حسین ہیں لیکن اتنے نہیں جتنی دولہن بیگم۔

امجد۔ (اماں سے) امی جان۔ کپڑے کب آئیں گے۔

اصغری۔ کل تک آ جائیں گے۔

امجد۔ اور وہ بائیسکوپ مشین — کیوں نہیں آئی ابھی تک۔

بیگم صاحب۔ بیٹا — مجید آرڈر دے آیا تھا۔ ایک دو روز میں آجائے گی۔

امجد۔ اچھا (رک کر) امّی جان!

بیگم صاحب۔ جی بیٹا۔

امجد۔ کچھ اور بھی منگوانا چاہیے سعیدہ کے لیے — میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی اداس نہیں دیکھنا چاہتا — ہر روز اس کے لیے کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور ہونی چاہیے۔

بیگم صاحب۔ سب کچھ تمھارے اختیار میں ہے، جو چاہو کرو۔

امجد۔ اختیار؟ (رک کر) ہاں ...... تو ...... امی جان۔

بیگم صاحب۔ جی!

امجد۔ کمال کو بھیجیے — اسپورٹس کی دکان میں جائے — جتنے کھیل اسے مل سکیں لے آئے ..... سعیدہ اور مجید کھیلا کریں گے اور میں دیکھا کروں گا ..... اور دیکھیے ...... اس سے کہیے کچھ ایسے کھیل بھی لے آئے، جو میں ..... میں بھی سعیدہ کے ساتھ کھیل سکوں۔

بیگم صاحب۔ (بے حد متاثر ہو کر، امجد کا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر) میرے بچے!

(امجد بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا ہے — اصغری ضبط نہیں کر سکتی اور چیختی ہوئی ایک طرف دوڑ جاتی ہے بیگم کی آنکھوں سے خاموش آنسو رواں ہیں)

پردہ

چوتھا منظر

وہی کمرہ جو پہلے اور دوسرے منظر میں ہے — رات کا وقت۔ فضا بالکل خاموش ہے۔ بڑے بے ڈھنگے طریق پر مسہری پر سعیدہ تین چار گدگدے تکیوں میں اپنا نیم سنہرے بالوں والا سر دبائے کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول ہے ..... نظریں کتاب کے حروف کے بجائے اس کے اپنے دل کی جانب معلوم ہوتی ہیں۔ سینے کے مقام پر کمبل کی سلوٹیں چٹکیاں کھا رہی ہیں اور ننھے سے تالاب میں جزر کا نقشہ پیدا ہو رہا ہے — بائیں طرف لوہے کی ہسپتالوں جیسی چارپائی بچھی ہے — اس کے ساتھ اپاہجوں والی کرسی میں امجد بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتاب ہے اور اسے یوں پکڑے ہے جیسے کوئی شیشے کی چیز ہے۔ اس کی نظریں پریشان ہیں۔ کتاب کے حروف سے اُٹھ کر کبھی وہ سعیدہ کے ہاتھوں پر جا بیٹھتی ہیں۔ کبھی اس کے سنہرے بالوں والے سر پر جو تکیوں میں دھنسا ہے — آخر اس سے نہیں رہا جاتا — کتاب بند کر کے اپنی گود میں رکھتا ہے اور جھری

آہستگی کے ساتھ سعیدہ سے مخاطب ہوتا ہے)

امجد - سعیدہ!

سعیدہ - (چونک کر) جی؟

امجدہ - میرا خیال ہے، اب سو جاؤ۔

سعیدہ - (کروٹ بدل کر امجد کو دیکھتے ہوئے) آپ سونا چاہتے ہیں تو میں غلام محمد اور کریم کو بلاؤں کہ وہ آپ کو لٹا دیں۔

امجد - (کھوکھلی آواز میں) لٹا دیں...... نہیں سعیدہ — میں لیٹ لیٹ کے تھک گیا ہوں — آج یہیں کرسی پر سوجاؤں گا — تمھیں تکلیف نہ ہو تو اُٹھ کے یہ بتی بجھا دو اور سبز بتی روشن کر دو۔

سعیدہ - (اُٹھتی ہے) آپ بار بار میری تکلیف کا ذکر کیوں کرتے ہیں۔

امجد - میں خود جو تکلیف میں ہوں۔

سعیدہ - (چڑ کر) مجھے اس کا احساس ہے امجد صاحب — مگر بتائیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں...... مجھ سے جو ہو سکتا ہے، میں کرنے کے لیے تیار ہوں — مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ کو ہر وقت میری تکلیف کی پڑی رہتی ہے — مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

امجد - سعیدہ، تم بہت اچھی ہو۔

(سعیدہ بتی اوف کرتی ہے — چند لمحات کے لیے اندھیرا چھا جاتا ہے — پھر کمرے کی ہر چیز ہلکی ہلکی سبز روشنی میں نہانا شروع کر دیتی ہے)

سعیدہ - کاش میں اچھی ہوتی — اچھی ہو سکتی (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے — سینے سے اس کا اضطراب ظاہر ہے)

امجد - اس سے زیادہ تم اور کیا اچھی ہو سکتی ہو سعیدہ۔

سعیدہ - (تیزی سے) جی نہیں — آپ نہیں جانتے۔

امجد - (بہت ہی ملائم آواز میں) اگر کسی وجہ سے میں نے تمھیں ناراض کر دیا ہے تو مجھے معاف کر دو۔

سعیدہ - (امجد کی طرف دیکھتی ہے — اُٹھتی ہے اور مسکراتی ہوئی اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے امجد کے بالوں میں کنگھی کرتی ہے) سچ تو یہ ہے امجد صاحب کہ میں آپ کے لائق نہیں ہوں۔

امجد - (سعیدہ کا ہاتھ پکڑ کر)...... یہ تمھارے دل کی اچھائی ہے اگر تم ایسا سمجھتی ہو، ورنہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

(**سعیدہ** - (بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے) سو جائیے...... کئی راتوں سے آپ جاگ رہے ہیں — بلکہ جب سے یہاں آئے ہیں، ایک لحظے کے لیے بھی آپ کی آنکھ نہیں لگی۔

امجد - مجھے نیند نہیں آتی سعیدہ

سعیدہ - کیوں؟

امجد۔ معلوم نہیں کیوں ـــ بس ایسا لگتا ہے کہ نیند کبھی آئی تھی نہ آئے گی ..... میں تو وہ راتیں بھی یاد کرنا بھول گیا ہوں جب سویا کرتا تھا۔

سعیدہ۔ کاش، میں آپ کو اپنی نیند دے سکتی۔

امجد۔ نہیں سعیدہ ـــ میں اپنی عزیز چیز تم سے نہیں چھیننا چاہتا ـــ یہ تمھاری آنکھوں ہی کے لیے سلامت رہے جو نیند میں اور بھی زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہیں ـــ جاؤ، اب سو جاؤ۔

سعیدہ۔ میں کم بخت تو سو ہی جاؤں گی۔

امجد۔ ایسا نہ کہو ـــ خدا تمھارے بخت بلند کرے ..... جاؤ سو جاؤ۔

سعیدہ۔ (چڑ کر) آپ کیوں میرے ساتھ اتنی نرمی سے پیش آتے ہیں ..... امجد صاحب، مجھے اس سے بڑی وحشت ہوتی ہے ـــ خدا کی قسم آپ کی یہ نرمی، یہ حلیمی، یہ انکسار، ایک دن مجھے پاگل بنا دے گا۔

(جھنجھلا کر تیزی سے مسہری کی طرف بڑھتی ہے اور خود کو بستر میں گرا دیتی ہے)

امجد۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے منہ سے جو باتیں نکلتی ہیں، وہ بھی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے۔ کروٹ بدل کر وہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیتی ہے ـــ امجد اپنی گود میں سے کتاب اٹھاتا ہے اور اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے ـــ سکوت کا عالم ہے۔ ہلکی ہلکی سبز روشنی میں یہ سکوت اور بھی زیادہ نحیف ہو گیا ہے ـــ کافی لمبا عرصہ خاموشی میں گزرتا ہے، بڑی بیزار سی خاموشی میں۔ ـــ امجد کے چہرے پر روشنی قبروں کے سبز غلاف کی طرح چڑھی ہے ـــ اس کی نگاہیں کتاب سے ہٹ کر بار بار سعیدہ کی جانب اٹھتی ہیں، اور شرمسار ہو کر دبے پاؤں لوٹ آتی ہیں ـــ تھوڑی دیر کے بعد امجد بہت زیادہ مضطرب ہو جاتا ہے)۔

امجد۔ سعیدہ!

سعیدہ۔ جی!

امجد۔ میں ـــ میں تم سے ایک درخواست کرنی چاہتا ہوں۔

سعیدہ۔ (کروٹ نہ بدلتے ہوئے) کیا؟

امجد۔ کیا ..... کیا آج ہماری پہلی رات ہو سکتی ہے .....

سعیدہ۔ (بستر میں لرز سی جاتی ہے)

امجد۔ وہ رات ـــ جو ابھی تک نہیں آئی۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے)

وقفہ

امجد۔ سعیدہ۔

سعیدہ۔ جی!

امجد۔ کیا تم میری یہ درخواست قبول کر سکتی ہو؟

سعیدہ۔ (کروٹ بدل کر امجد کو دیکھتی ہے) ـــــ اس کی آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش تیر رہی ہے) کیسے امجد صاحب!

امجد۔ جھوٹ موٹ...... محض میرے بہلاوے کے لیے...... تم یہ فرض کر لو کہ میں تمہارے پہلو میں لیٹا ہوں...... میں یہاں فرض کر لوں گا کہ تم میرے پہلو میں لیٹی ہو... میں تم سے وہی باتیں شروع کروں گا جو پہلی رات کو مجھے تم سے کہنا تھیں.... تم اسی طرح جواب دینا، جس طرح کہ تمہیں دینا تھا.... میرے لیے..... کیا میرے لیے تم یہ جھوٹ موٹ کا کھیل کھیل سکتی ہو سعیدہ۔

سعیدہ۔ (آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش کی بجائے رحم کے آنسو تیر رہے ہیں) میں حاضر ہوں امجد صاحب۔

امجد۔ شکریہ۔

(طویل وقفہ)

امجد۔ آج ہماری پہلی رات ہے سعیدہ ــــ وہ رات جس میں جوانیاں اراضیِ جنت کی طرف پہلا قدم اُٹھاتی ہیں ــــ وہ رات جس کی تمام پہنائیوں میں دو جی غوطہ لگاتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں..... شرماؤ نہیں...... یہ رات تو وہ ہے جب تمام پوشیدہ حقیقتوں کے گھونگھٹ اُٹھنے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں، ہلکی سی سرگوشی، نرم سی آہ، ایک چھوٹا سا لمس، بے پردہ سانس کا ننھا سا جھکورا بھی ان گھونگھٹوں کے پٹ کھول دیتا ہے ــــ اس قدر آہستہ کہ بے معلوم سرسراہٹ تک بھی نہیں ہوتی اور آدمی، دیدار ــــ پورے دیدار کے تمام مراحل طے کر جاتا ہے ــــ یہ وہ رات ہے جب نگاہیں ٹکرا ٹکرا کر تارے جھڑتی ہیں اور یہ افشاں دونوں زندگیوں کے ایک ماتھے پر چُنی جاتی ہے..... یہ وہ رات ہے ــــ پہلی رات، سب سے پہلی، جب آدم کی پسلیاں چیر کر حوا نکالی گئی تھی ــــ یہ وہ رات ہے جس کی درازیِ عمر کے لیے، شاعر دعائیں مانگ مانگ کر ابھی تک نہیں تھکا ــــ یہ وہ رات ہے جس کے حصول کے لیے جوانی کی جانماز بچھا کر زندگی اکثر سجدہ ریز رہی ہے..... یہ وہ رات ہے جس میں حجاب کی تمام گرہیں فطرت کے ناخن خود کھولتے ہیں ــــ یہ وہ رات ہے جب قدرت کے تمام کارخانے صرف ایک ہی پُرزہ ڈھال رہے ہوتے ہیں ــــ وہ پُرزہ جس نے کائنات کے ان تمام کارخانوں کو حرکت بخشی تھی ــــ یہ وہ رات ہے جب تمام آوازیں واپس اپنے مخرجوں میں چلی جاتی ہیں کہ اس آواز کا جلوس اتنا آرام و سکون سے گذر جائے جس میں کُن کی گونج ہے...... یہ وہ رات ہے جس کا ہر پہر اجالے سے بنا ہے ــــ یہ وہ رات ہے، ہر آنے والی رات جس کے حضور جھولی پھیلائے بھیک کی منتظر کھڑی ہے ــــ یہ وہ رات ہے جب بدن کا رُواں رُواں منہ کھول کے بولتا ہے اور کان کھول کے سنتا ہے..... بڑے بڑے اَن کہے راز ــــ بڑے بڑے اَن گائے راگ...... (ایک دم چیخ کر) ڈھانپ لو ــــ ڈھانپ لو..... سعیدہ اپنا بدن ڈھانپ لو

..... یہ مجھے ڈس رہا ہے ——— اس کا ایک ایک خط تلوار کی دھار کے مانند میری ٹوٹی خواہشوں پر پھر رہا ہے .....
ڈھانپ لو ——— خدا کے لیے اپنا جسم ڈھانپ لو۔

سعیدہ۔ (ہلکی ہلکی سبز روشنی میں گھاس کی نرم نرم پتیوں سے بنی ہوئی لاش کے مانند لیٹی ہے۔ اس کا بدن لرز رہا ہے ——— ایک ایک انگ کانپ رہا ہے) جی ؟

امجد۔ (بلک بلک کر رونے لگتا ہے) اپنا بدن ڈھانپ لو۔

(سعیدہ اپنا لرزتا ہوا بدن کمبل سے ڈھانپ لیتی ہے۔ امجد آنکھوں کے سامنے ہاتھ رکھے روتا رہتا ہے)

پردہ

پانچواں منظر

(نگار ولا سے ملحقہ باغیچہ ——— شام کا وقت۔ فوارے کا پانی کھل کھیل رہا ہے۔ سایے گہرے ہو چکے ہیں۔ پس منظر میں خاکستری پہاڑیاں شام کے دھندلکوں میں سنگینی اختیار کر گئی ہیں۔ آسمان نے ایسا لگتا ہے اپنے بدن پر بھبوت مل لی ہے۔ تختوں کے سینے پر سبزہ خاموش لیٹا ہے۔ کرسیاں خالی ہیں ——— ساری فضا خالی ہے اس فریم کی طرح جس میں تصویر جڑی جانے والی ہے ——— مجید اور سعیدہ کی ہنسی کی آواز آتی ہے ——— چند لمحات کے بعد دونوں ہنستے، بڑی مشکل سے اپنی تھکاوٹ کا بوجھ اٹھاتے داخل ہوتے ہیں ——— سعیدہ نڈھال ہو کر خود کو کرسی میں گرا دیتی ہے مجید اس کے پاس کھڑا رہتا ہے)

سعیدہ۔ (رانوں پر مکیاں مارتے ہوئے) اُف ——— ف !

مجید۔ (ہنستا ہے) آپ تھک گئیں ——— دبا دوں آپ کو ؟

سعیدہ۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں ——— اصغری کو بھیج دیجیے ——— مجھ سے تو اب دو قدم بھی چلنا دشوار ہے۔

مجید۔ (مسکراتا ہے) بہتر..... (آگے بڑھ کر سعیدہ کے چہرے پر ریشم سنہرے بالوں کی آوارہ لٹ انگلیوں سے اٹھا کر ایک طرف کر دیتا ہے۔

سعیدہ۔ (بہت زیادہ گھبراہٹ سے) میں جاتی ہوں اندر۔ (اٹھنے لگتی ہے)

مجید۔ (ایک طرف دیکھ کر) لو، وہ اصغری خود ہی آ گئی ——— آؤ، اصغری ——— بھابی جان کے پاؤں دبا دو۔

(اصغری داخل ہوتی ہے ——— اس کے ہونٹوں کے اختتامی کونے کپکپا رہے ہیں جیسے کچھ کہنے کے لیے تڑپ رہے ہیں پاس آ جاتی ہے)

اصغری۔ (سعیدہ سے) دولہن بیگم تھک گئیں آج ؟

سعیدہ۔ (رانوں پر مکیاں مارتے ہوئے) ہاں !

اصغری۔ (گھاس پر بیٹھ کر، سعیدہ کی ایک پنڈلی دبانا شروع کرتی ہے۔ خطاب مجید سے ہے) یہ سب مجید میاں کا قصور ہے ..... اتنی بڑی سیر اور اتنی جلدی ..... (لہجے میں تیکھا پن ہے) ہر چیز دھیرے دھیرے ہونی چاہیے (ہولے ہولے دباتی ہے) اس طرح —— ہولے ہولے (سعیدہ سے) کیوں دولہن بیگم —— کچھ آرام محسوس ہوا آپ کو؟

سعیدہ۔ (دوسری ٹانگ جو اصغری کی گرفت سے آزاد ہے، اضطراب کا شدید مظاہرہ کرتی ہے) ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!

اصغری۔ (مجید سے) مجید میاں، آپ جائیں —— منہ ہاتھ دھوائیں —— گرد و غبار سے آپ کا چہرہ بالکل اَن دھویا آلو بنا ہوا ہے۔

مجید۔ (تیزی سے) تم بہت گستاخ ہوگئی ہو —— یہ سب .....

اصغری۔ (مجید کی بات کاٹ کر) دولہن بیگم کا قصور جنھوں نے —— مُنہ لگالیا ہے (سعیدہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر) ایسا خوبصورت منہ!

(مجید نگاہوں ہی نگاہوں میں غصہ برساتا چلا جاتا ہے)

اصغری۔ (ہنستی ہے) مجید میاں کی شکل و صورت یوں تو ماشاء اللہ بڑی اچھی ہے —— مگر غصے میں ہمیشہ بگڑ جاتی ہے —— آپ کا کیا خیال ہے۔

سعیدہ۔ تم مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو (اُٹھنا چاہتی ہے مگر اصغری کی مضبوط گرفت کے باعث نہیں اُٹھ سکتی) چھوڑ دو مجھے۔

اصغری۔ (دباتے ہوئے) میں اس خدمت سے خود کو چھڑانا نہیں چاہتی (سعیدہ کے پاؤں سے سینڈل اُتارتی ہے) مجید میاں کہہ رہے تھے، میں گستاخ ہوگئی ہوں —— کیا یہ درست ہے۔ دولہن بیگم۔

سعیدہ۔ بالکل درست ہے۔

اصغری۔ (بڑے اطمینان سے سعیدہ کے پاؤں کی اُنگلیاں چٹخاتے ہوئے) تو یہ بہت بُری بات ہے —— نوکرانی کو گستاخ کبھی نہیں ہونا چاہیے —— آپ میرے کان کھینچیے۔

سعیدہ۔ خاموش رہو!

اصغری۔ یہ ظلم ہے —— زبان بندی بہت بڑا ظلم ہے دولہن بیگم —— میں نے ایسی کونسی بات کی جو آپ کو ناگوار گزری۔

سعیدہ۔ (اضطراب کے ساتھ) تمھاری سب باتیں مجھے ناگوار گزرتی ہیں۔

اصغری۔ اصغری بے چاری اب کیا کرے ..... (توقف کے بعد) میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ جیسی لکھی پڑھی بیگم کی نوکری میں اس ایک برس کے اندر اندر ہی مجھے سب کچھ آگیا ہے ..... پر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں غلط سمجھتی تھی —— میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں سیکھا؟ —— لیکن یہ کس کا قصور ہے؟ سیکھنے والے کا یا سکھانے والے کا؟

سعیدہ۔ (اپنی دونوں ٹانگیں ایک طرف سمیٹتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں) تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

اصغری۔ (مصنوعی حیرت سے) میں؟

سعیدہ۔ ہاں تم —— کیا کہنا چاہتی ہو تم؟

اصغری۔ (سوچتے ہوئے) کہنے کو تو میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں ———

سعیدہ۔ (اُٹھ کر ننگے پاؤں گھاس پر چلتے ہوئے) تو کہہ ڈالو آج ——— مجھے تمھاری ہر روز کی مہین مہین چٹکیاں پسند نہیں ——— جو تم کہنا چاہتی ہو، میں سننے کے لیے تیار ہوں۔

اصغری۔ آپ بڑی ہمت والی ہیں۔ دولھن بیگم۔

سعیدہ۔ میں ہمت والی ہوں، یا بُزدل ہوں، تم اسے چھوڑو ——— جو کہنا چاہتی ہو آج اُگل ڈالو۔

اصغری۔ یہ تے آپ کو اور مجھے دونوں کو تکلیف دے گی۔

سعیدہ۔ میری تکلیف کا تم کچھ خیال نہ کرو ——— میں برداشت کروں گی۔

اصغری۔ (سوچتے ہوئے) میں سمجھی تھی۔ میرے دانتوں تلے دبی ہوئی کٹاری دیکھ کر آپ ڈر جائیں گی۔ پر اب ایسا لگتا ہے کہ آپ چلتی چلتی ایسی جگہ پہنچ گئی ہیں جہاں زخموں کی کوئی پروا نہیں رہتی ——— اب تو مجھے خوف آنے لگا ہے آپ سے۔

سعیدہ۔ (اضطراب میں اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے) اصغری!

اصغری۔ (چونک کر) جی ؟

سعیدہ۔ تم مجھے یہ بتاؤ ——— اگر امجد میاں گاڑی کے حادثے میں مر جاتے تو میں کیا کرتی ؟

اصغری۔ آپ ؟ ——— مجھے معلوم نہیں آپ کیا کرتیں۔

سعیدہ۔ میں جوان ہوں، خوبصورت ہوں ——— میرے سینے میں ایسے ہزاروں ارمان ہیں جو میں سترہ برس تک اپنے خیالوں کا شہد پلا پلا کر پالتی پوستی رہی ہوں ..... میں ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتی ——— میں نے بہت کوشش کی ہے اصغری ——— میرا خدا جانتا ہے، میں نے بہت کوشش کی ہے، لیکن میں اپنے ہاتھوں کو اس قتل پر آمادہ نہیں کر سکی ——— تم مجھے کمزور کہہ لو ——— بزدل کہہ لو ——— اخلاق باختہ کہہ لو..... تم ایک نوکرانی ہو ——— میں تمھارے سامنے اعتراف کرتی ہوں کہ میں اپنی جوانی کا باغ جس کے پتے پتے، بوٹے بوٹے میں میرے کنوارے ارمانوں کا گرم گرم خون دوڑ رہا ہے، اپنے ہاتھوں سے نہیں اجاڑ سکتی..... ویسے میں کسی کو بھی اجازت دے سکتی ہوں کہ وہ میری آنکھیں بند کر کے ——— نہیں ——— میرے تمام حواس میں تالے لگا کر بڑھاپے اور رنڈاپے کی گہری ترین گھرائیوں میں اُتار دے ——— یا ایک ہی بار دھکا دے کر مجھے اپنے ارمانوں کی لرزتی ہوئی چٹانوں کی چوٹیوں پر سے نیچے گرا دے جن پر میں اس وقت تک دامن سمیٹے تُند ہواؤں کا مقابلہ کرتی رہی ہوں ——— میں تم کو بھی اس کی اجازت دیتی ہوں۔

اصغری۔ (شکست خوردہ اُٹھتی ہے) بس دولھن بیگم۔

سعیدہ۔ میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہوں اصغری، جہاں زمین میرے قدموں کے نیچے گھوم رہی ہے۔ میں جس راستے کی طرف منہ کرتی ہوں وہی مجھ سے مُنہ موڑ لیتا ہے ——— میں جو ارادہ کرتی ہوں، مجھ سے اپنا دامن چھڑا کے بھاگ جاتا

ہے میں اس کے پیچھے بھاگتی ہوں ۔۔۔ اندھا دھند دوڑتی ہوں اور جب اسے پکڑلیتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریت کا بنا تھا۔ میرے پکڑتے پکڑتے ہی ڈھیر ہو جاتا ہے ۔۔۔ اصغری تم نہیں جانتی ہو، میں کتنی دیر سے انگاروں کے بستر پر لوٹ رہی ہوں۔ بجھانے کے لیے میں ان پر پانی ڈالتی ہوں تو بھاپ کے ایسے بگولے اٹھتے ہیں جو مجھے اپنے ساتھ اونچائیوں میں لے جاتے ہیں اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ایک دم نیچے دے ٹپکتے ہیں ۔۔۔ میری ہڈی ہڈی، پسلی پسلی چُور چُور ہو چکی ہے۔ اصغری..... کیا ہی اچھا ہوتا اگر امجد صاحب کے بدلے میں اپاہج ہوئی ہوتی۔

(طویل وقفہ ۔۔۔ اصغری خاموش کھڑی رہتی ہے ۔۔۔ سعیدہ اضطراب میں اِدھر اُدھر ٹہلتی رہتی ہے)

سعیدہ۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اصغری۔ (محویت کے عالم سے بیدار ہوتی ہے) کیا کرنا چاہیے ۔۔۔ آپ کو ۔۔۔ آپ کو امجد میاں کی موت کا انتظار کرنا چاہیے۔

سعیدہ۔ (کچھ دیر سوچ کر) تم مجھے انتہا درجے کی سنگدل کہو گی ۔۔۔ لیکن میں پوچھتی ہوں ۔۔۔ انھیں کب موت آئے گی

اصغری۔ جب اللہ میاں کو منظور ہوگا (بڑبڑاتی ہے) لیکن امجد میاں کی دوستی تو ان سے ختم ہو چکی ہے۔

سعیدہ۔ کیا کہا؟

اصغری۔ جی، کچھ نہیں۔

(اکھڑے اکھڑے قدم اُٹھاتی اصغری چلی جاتی ہے ۔۔۔ سعیدہ ننگے پاؤں گھاس کے ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر اضطراب کی حالت میں ٹہلتی رہتی ہے)

پردہ

چھٹا منظر

(نگار وِلا ۔۔۔ ڈرائینگ روم ۔۔۔ وسیع و عریض کمرہ جو پُرانی وضع کے ساز و سامان سے آراستہ ہے ہر چیز وزنی اور پائدار ہے ۔۔۔ دیواروں پر آئل پینٹنگز آویزاں ہیں۔ جو خاندان کے مختلف افراد کی ہیں ایک پینٹنگ بیگم کی ہے۔ جب کہ وہ جوان تھی۔ اس پینٹنگ کے نیچے بیگم ایک صوفے پر بیٹھی تقابل پیش کر رہی ہے۔ تصویر میں وہ بے فکر ہے مگر صوفے میں سخت فکرمند۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کا مجموعہ ہے کوئی اُونی چیز بُن رہی ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خیالات و افکار کے اُلجھے ہوئے دھاگے کبھی لپیٹتی ہے کبھی کھولتی ہے ۔۔۔ اصغری داخل ہوتی ہے)

بیگم صاحب۔ مجید میاں ملے؟

اصغری۔ جی ہاں۔

بیگم صاحب۔ کہاں تھے ؟
اصغری۔ باغیچے میں
بیگم صاحب۔ کیا کر رہے تھے ؟
اصغری۔ جی ؟ —— (رُک کر) جی اکیلے بیٹھے تھے۔
بیگم صاحب (اصغری کی طرف دیکھ کر نگاہیں نیچی کرکے) آ رہے ہیں۔
اصغری۔ جی ہاں !
بیگم صاحب۔ تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے —— مجید اس کی طرف دیکھتا اندر داخل ہوتا ہے)

مجید۔ کیا بات ہے امی جان ؟
بیگم صاحب۔ کچھ نہیں —— بیٹھ جاؤ۔
مجید۔ (پاس ہی صوفے کی دوسری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) یہاں سردی ہے۔
بیگم صاحب۔ ہاں —— یہاں سردی ہے

(وقفہ)

مجید۔ (بے چینی محسوس کرتے ہوئے) میرا خیال ہے —— آپ نے مجھے یہاں کچھ کہنے کے لیے بلایا ہے۔
بیگم صاحب۔ ہاں !
مجید۔ فرمایئے ؟
بیگم صاحب۔ میں تمھیں یہاں سے بھیجنا چاہتی ہوں۔
مجید۔ مجھے ؟ (اُٹھ کر) کہاں ؟
بیگم صاحب۔ بیٹھ جاؤ
مجید۔ (بیٹھ جاتا ہے) یہ لیجیے۔
بیگم صاحب۔ میں نے ابھی امجد سے بات نہیں کی۔
مجید۔ (پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) کون سی
بیگم صاحب۔ یہی تمھیں یہاں سے بھیجنے کی۔
مجید۔ لیکن آپ مجھے یہاں سے کیوں بھیج رہی ہیں ...... میرا مطلب ہے کوئی خاص کام ہے یا ......
بیگم صاحب۔ بیٹھ جاؤ۔
مجید۔ (بیٹھ جاتا ہے) کوئی خاص کام ہے ؟

بیگم صاحب۔ نہیں۔

مجید۔ تو پھر مجھے یہاں سے کہیں باہر بھیجنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے۔

بیگم صاحب۔ کہ میں اسی میں بہتری سمجھتی ہوں۔

مجید۔ بہتری؟ —— کس کی بہتری؟

بیگم صاحب۔ ہم سب کی —— اس گھر کی۔

مجید۔ (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) آپ پہیلیوں میں بات کر رہی ہیں۔ امّی جان۔

بیگم صاحب۔ مجید تم میرے لڑکے ہو، میں تمھاری ماں ہوں —— میرے تمھارے درمیان کوئی ایسی گفتگو نہیں ہونی چاہیے جو اس مقدس رشتے پر ذرا سی بھی کالک لگائے —— میں چاہتی ہوں کہ تم آج ہی کراچی چلے جاؤ اور جب تک میں کہوں وہیں رہو

مجید۔ لیکن امّی جان ——

بیگم۔ (بات کاٹ کر) تمھارے وہاں بے شمار دوست موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے، تم ان کی مدد سے، یا خود اپنی ہمت سے اس منجدھار میں سے جسے زندگی کہتے ہیں اپنی کشتی صحیح و سلامت کنارے لے جاؤ گے۔

مجید۔ (کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا اور بیٹھ جاتا ہے) بہت بہتر —— میں چلا جاؤں گا۔

بیگم صاحب۔ تمھارا فیصلہ ...... (ایک دم خاموش ہو جاتی ہے)۔

(کمرے میں امجد اپا ہجوں والی کرسی میں داخل ہوتا ہے جسے کریم چلا رہا ہے)

امجد۔ (مجید سے) یار مجید، تم بھی عجیب آدمی ہو —— میں وہاں کمرے میں بیٹھا تمھارا انتظار کر رہا تھا کہ تم آؤ گے تو ہم دونوں سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں گے —— لیکن تم یہاں بیٹھے ہو (بیگم صاحب سے) امّی جان —— آپ نے کیا سوچا —— کیسا تحفہ ہونا چاہیے —— میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا ہوں۔

بیگم صاحب۔ تم سعیدہ سے کیوں نہیں پوچھتے۔

امجد۔ لو اور سنو (ہنستا ہے) حد کر دی آپ نے امّی جان —— اُس سے مشورہ لیا تو تحفے کا مزا کیا خاک آئے گا۔ (مجید سے) کیوں مجید؟

(مجید خاموش رہتا ہے)

امجد۔ بولو یار۔

مجید۔ (اُٹھ کر) آپ امّی جان سے پوچھیے —— میں تو جا رہا ہوں۔

امجد۔ (حیرت سے) جا رہے ہو؟ —— کہاں جا رہے ہو؟

مجید۔ کراچی!

امجد۔ یقیناً تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے —— کیا کرنے جا رہے ہو کراچی؟

مجید۔ کیا کرنے جا رہا ہوں (پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ) منجدھار میں سے اپنی کشتی نکالنے۔

امجد۔ (بیگم سے) کیا ہو گیا ہے اسے (مجید سے) بیٹھو یار —— پرسوں اس کی سالگرہ ہے —— ابھی ابھی فیصلہ ہو جانا چاہیے۔

مجید۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

امجد۔ کیا؟

مجید۔ کہ میں کراچی جا رہا ہوں اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔

امجد۔ کیا بکتے ہو (بیگم سے) امّی جان، یہ قصّہ کیا ہے؟

بیگم صاحب۔ کچھ نہیں —— ماں بیٹے کی لڑائی ہو گئی کسی بات پر۔

امجد۔ کس بات پر؟

بیگم صاحب۔ تم نہیں پوچھ سکتے۔

امجد۔ عدول حکمی تو ہوتی ہے —— لیکن مجید میرا بھائی ہے —— آپ کے اور اس کے درمیان اگر کوئی رنجش یا غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے تو اُسے دُور کرنا میرا فرض ہے —— مجید کو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں —— اس سے ایسی کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی، جو آزار کا موجب ہو —— (مجید سے) ادھر آؤ مجید۔

مجید۔ بھائی جان، مجھے اپنا اسباب بندھوانا ہے۔

امجد۔ لاحول ولا —— یہ سب کیا ہے —— (بیگم سے) امّی جان —— خدا کے لیے اسے روکیے —— میرے لیے نہیں تو سعیدہ کے لیے روکیے —— اس گھر میں ایک صرف یہی ہے جس نے ابھی تک اسے اُداس نہیں ہونے دیا —— میری خاطر اتنی زحمت برداشت کرتا ہے —— اگر آپ نے اسے جانے دیا تو امّی جان، میں نہیں جانتا، میرا کیا حال ہو گا —— سعیدہ کو سیر کے لیے لے جاتا ہے تو میں تصوّر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے بدلے میں اس کے ہمراہ ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتا ہے تو وہ خلاء بہت حد تک پورا ہو جاتا ہے جو قدرت کے بے رحم ہاتھوں نے میری زندگی میں پیدا کر رکھا ہے —— میں تو کئی بار سوچتا ہوں امجد، اگر تیرا بھائی مجید نہ ہوتا تو کیا تیری شکستہ زندگی کا ملبہ تو اس قابل نہیں تھا کہ گھُورے پر پڑا ہوتا —— امّی جان اسے روکیے —— یہ تو میرا بازو ہے ..... کیوں آپ اس کو مجھ سے جُدا کر رہی ہیں —— اللہ میاں کی جگہ نہ لیجیے امی جان (رونے لگتا ہے)

مجید۔ میں جا رہا ہوں امّی جان۔

بیگم صاحب۔ ٹھیرو۔

مجید۔ (رُک جاتا ہے)

بیگم صاحب۔ (اُٹھتی ہے اور امجد کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) امجد بیٹا —— روؤ نہیں جان مادر —— مجید نہیں جائے گا —— جو چیز جہاں ہے وہیں رہے گی ..... اس لیے کہ اسے یہی منظور ہے ..... (مجید سے) مجید

——— بھائی کے پاس بیٹھو اور سعیدہ کی سالگرہ کے متعلق سوچو (چلی جاتی ہے)

(مجید کچھ دیر سوچتا ہے پھر امجد کی کرسی کی طرف بڑھتا ہے)

مجید۔ (آہستہ) بھائی جان، آپ مجھے جانے دیں۔

امجد۔ (جھکا ہوا سر اٹھا کر) جانے دوں؟ ——— کہاں جانے دوں؟ ——— پاگل مت بنو۔

مجید۔ آپ نہیں سمجھتے بھائی جان۔

امجد۔ میں سب سمجھتا ہوں ——— اپنا رومال نکالو اور ذرا میرے یہ آنسو پونچھ دو۔

مجید۔ (تھوڑے توقف کے بعد اپنا رومال نکالتا ہے اور امجد کے آنسو پونچھتا ہے ——— جلدی جلدی)

امجد۔ کیا کرتے ہو یار ——— تمھیں تو آنسو پونچھنا بھی نہیں آتا ——— (مسکراتا ہے) اتنا معمولی سا کام ہے۔

مجید۔ یہ معمولی کام نہیں بھائی جان۔

امجد۔ (مسکرا کر) اچھا بھائی بڑا جان جوکھوں کا کام ہے ——— آؤ ادھر بیٹھو ——— سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں۔ بیٹھو۔

مجید۔ (امجد کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) سوچیے۔

امجد۔ (آہ بھر کر) سوچتے ہیں بھائی سوچتے ہیں ——— سوچنے کے علاوہ اب اور کام ہی کیا ہے لیکن ذرا تم بھی سوچو۔

(مجید اور امجد دونوں سوچ میں مستغرق ہو جاتے ہیں)

پردہ

ساتواں منظر

(نگار ولا سے ملحقہ باغیچہ ——— شام کا وقت۔ فوارے کا پانی بند ہے، جیسے وہ اُبل اُبل کر عاجز آ چکا ہے۔ پس منظر میں خاکستری پہاڑیاں دھندلکوں میں اپنی سنگینیاں جیسے چھپا رہی ہیں۔ فرش پر سبزہ روندا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ دائیں طرف فوارے سے دور ہٹ کر گھنی جھاڑیاں جن کے عقب میں امجد اپاہجوں والی کرسی میں بیٹھا ہے۔ پشت پر اصغری کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہے ——— وہ اسے چلانے لگتی ہے)۔

امجد۔ نہیں اصغری ——— کچھ دیر ٹھہرو۔

اصغری۔ (ٹھیر جاتی ہے) لیکن امجد میاں .....

امجد۔ میں آج اپنی زندگی کا آخری زخم کھانا چاہتا ہوں۔

اصغری۔ یہ زخم کھانا اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنے تصور ہی میں کھا سکتے ہیں ——— لیکن ...... یہ زخم تو آپ کے لگ

چکا ہے ..... اسے دوبارہ کیوں کھلوانا چاہتے ہیں آپ ؟

امجد۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میری حالت میں جو آدمی ہو اس کے بدھو پنے کی کوئی حد نہیں رہتی ــــ اپنے زخموں کے ٹانکے کھول کھول کر دیکھتا ہے۔ انگوروں کی زبانی بیتیوں کی داستانیں سنتا ہے اور خود کو بہت بڑا شہید سمجھتا ہے ..... (ہنستا ہے) اصغری تمھاری کبھی کوئی چیز ٹوٹی نہیں، اس لیے تم لوگوں کا دردناک حال نہیں جانتی ہو جو عجز کی انتہا کو پہنچ کر شکست و ریخت میں بلند بام عمارتیں بناتے ہیں۔

اصغری۔ (مسکراتی ہے) میں تو ان حدوں سے بھی آگے نکل گئی ہوں امجد میاں ــــ بڑی اُونچی اُونچی عمارتیں بنا کر خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا چکی ہوں ــــ ایسا کرتے کرتے تو میرے دل میں بھی گٹے پڑ چکے ہیں۔

امجد۔ (کانپ جاتا ہے) اصغری ــــ تم بڑی خوفناک ہو۔

اصغری۔ (ہنستی ہے) ہر اجاڑ خوفناک ہوتی ہے ــــ حالانکہ بیچاری کیا خوفناک ہو سکتی ہے۔ اُسے اپنے ماتم سے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو دوسروں کو ڈرائے ــــ وہ تو خود دکی ہوئی، سہمی ہوئی ہوتی ہے۔

امجد۔ تمھاری زندگی بھی کسی حادثے سے دوچار ہوئی ؟

اصغری۔ جی نہیں ــــ اُس جی کی زندگی کسی حادثے سے کیا دوچار ہوگی جو کہ خود ایک حادثہ ہے۔

امجد۔ تمھاری باتوں سے جلے ہوئے گوشت کی بُو آتی ہے۔

اصغری۔ اس لیے کہ اب آپ کی سونگھنے کی حس جاگی ہوئی ہے۔

امجد۔ پہلے سو رہی تھی۔

اصغری۔ جی ہاں ــــ بہت گہری نیند۔

امجد۔ اسے جگایا کس نے ہے ؟

اصغری۔ اس گاڑی نے جو پٹڑی سے اُتر گئی۔

امجد۔ (بڑبڑاتا ہے) اس گاڑی نے ــــ جو پٹڑی سے اُتر گئی ..... (ذرا بلند آواز میں) کیا یہ پھر پٹڑی سے اُترے گی؟

اصغری۔ جو اللہ میاں کو منظور ہے وہی ہوگا۔

امجد۔ اللہ میاں کا نام مت لو ــــ میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے۔

اصغری۔ نہیں امجد میاں، اس شخص سے ہم ایسوں کی دوستی کبھی ختم نہیں ہوتی ــــ ٹوٹ ٹوٹ کے آپ جُڑتی رہتی ہے۔

امجد۔ یہ سب بکواس ہے۔

(دونوں، ایک دم چونکتے ہیں۔ قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے ــــ مجید اور سعید ہانپتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں ــــ سعیدہ جو بہت تھکی ہوتی ہے، فوارے کی منڈیر پر بیٹھ جاتی ہے۔ مجید کھڑا رہتا ہے)

سعیدہ - آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔

مجید - حالانکہ ہم زیادہ دُور نہیں گئے۔

سعیدہ - ہاں!

(وقفہ)

مجید - کیا ہی اچھا ہوتا، اگر میں کراچی چلا گیا ہوتا۔

سعیدہ - اچھا ہی ہوتا۔

مجید - میری جان عجب مشکل میں پھنس گئی ہے —— میں کراچی چلا جاتا..... لیکن سوال یہ ہے کہ میں اس منجدھار میں سے اپنی کشتی کیسے کر کنارے لے جاتا؟ —— نہیں —— میں ضرور ناکام رہتا۔

سعیدہ - مجھے معلوم ہے۔

مجید - تمھیں معلوم ہے —— مجھے معلوم ہے —— سوائے بھائی جان کے اور سب کو معلوم ہے اور یہی اس کہانی کا سب سے المناک حصّہ ہے۔

سعیدہ - میں نے کئی بار سوچا ہے کہ ان سے کہہ دوں، لیکن (اُٹھ کھڑی ہوتی ہے) مجھے ڈر ہے، وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکیں گے۔

مجید - مجھے خود اسی بات کا ڈر ہے —— ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک برس اور زندہ رہیں گے.. ..... غریب سے زندگی کا اتنا مختصر عرصہ چھیننا ظلم ہے۔

(جھاڑیوں کے عقب میں امجد اپنے دانت بھینچ لیتا ہے —— اصغری مضبوطی سے اس کا کندھا پکڑ لیتی ہے،)

سعیدہ - ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب تک وہ زندہ رہیں خوش رہیں۔ ان کے احساسات کے نازک آبگینوں کو ہلکی سی ٹھیس بھی نہ لگے......

مجید - اور اگر ہمارا کوئی بھالا ر گرکھا کے پھوٹ پڑا تو......

سعیدہ (قریب قریب چیخ کر) تو قیامت آجائے گی۔

مجید - اسی لیے میں سوچتا ہوں کہ میں چلا جاؤں ..... جب تک بھائی جان ......

سعیدہ (ایک دم بات کاٹ کر) ایسا نہ کہو مجید —— اتنے ظالم مت بنو۔

(امجد اپاہجوں کی کرسی میں لرز جاتا ہے، اصغری اس کا دوسرا کندھا بھی مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے)

مجید محبت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے سعیدہ —— کم بخت دوسروں کی موت پر ناچنے کی خواہش کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتی۔

سعیدہ ہمیں ایسے خیال اپنے دماغ میں نہیں لانے چاہئیں۔

مجید۔ٹھیک ہے ــــ لیکن آجائیں تو کیا کریں۔

سعیدہ۔کیا کر سکتے ہیں ــــ چلو۔

(سعیدہ کوٹھی کی جانب چلتی ہے ــــ مجید اس کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہے ــ جھاڑیوں کے عقب میں اپاہجوں والی کرسی میں امجد کا سر جھکا ہوا ہے۔اس کے پیچھے اصغری بُت بنی کھڑی ہے)

اصغری۔چلیں ؟

امجد۔(اسی طرح سر جھکائے، نہیں ــــ ابھی نہیں ــ میں سوچ رہا ہوں۔

اصغری۔کیا؟

امجد۔معلوم نہیں ــــ شاید یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا سوچنا چاہیے۔

اصغری۔ایسی سوچ بچار بالکل فضول ہوتی ہے۔

امجد۔(سر اُٹھا کر) فضول تو ہوتی ہے ــــ مگر پھر کیا کروں ــــ (وقفے کے بعد) اتنے ظالم نہیں ہیں جتنی تم ہو ــــ تم تو مجھے سوچنے سے بھی منع کرتی ہو ــــ تم بڑی ظالم ہو اصغری!

اصغری۔(مسکرا کر) محبت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے امجد میاں ــــ کم بخت اپنی موت پر بھی ناچنے سے باز نہیں آتی۔

امجد۔میرے سامنے آؤ۔

(اصغری، امجد کے سامنے آتی ہے۔امجد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے ــــ کچھ سوچتا ہے اور بڑبڑاتا ہے)

امجد۔یہ کتاب اب تک کہاں پڑی تھی۔

اصغری۔کہیں ردّی کی ٹوکری میں......اپنی صحیح جگہ!

امجد۔چلو ــــ مجھے لے چلو

(اصغری کُرسی کھینچتی ہے اور کوٹھی کی جانب چلتی ہے)

پردہ

آٹھواں منظر

(وہی کمرہ جو پہلے، دوسرے اور چوتھے منظر میں ہے۔رات کا وقت ـــ چھت سے سبز روشنی کی پھوار گر رہی ہے ــــ ہر شے کا اصلی رنگ بدلا ہوا ہے، جیسے اعصاب زدہ مریضوں کا ــــ مسہری خالی ہے کچھ اس طور پر خالی جیسے وہ کبھی آباد ہی نہیں تھی ــــ اصغری، امجد کو اپاہجوں والی کُرسی میں اندر لاتی ہے)

اصغری۔دولھن بیگم، بیگم صاحب کے کمرے میں کیوں چلی گئیں ؟

امجد۔ڈرتی تھی۔

اصغری۔ آپ سے ؟

امجد۔ (مسکرا کر) مجھ سے کوئی کیا ڈرے گا —— وہ اپنے آپ سے ڈرتی تھی

اصغری۔ وہ اتنی کمزور نہیں ہیں امجد میاں۔

امجد۔ وقت بڑے بڑے پہاڑ کھوکھلے کر دیتا ہے —— وہ تو ایک جوان لڑکی ہے۔

اصغری۔ (توقف کے بعد) آپ سونا چاہیں گے اب ؟

امجد۔ سونا ؟ ..... (ہنستا ہے) میرا مذاق مت اُڑاؤ اصغری —— میرے جلتے ہوئے زخموں کی توہین ہوتی ہے۔

اصغری۔ (توقف کے بعد) کیا آپ کو سعیدہ سے محبت ہے ؟

امجد۔ نہیں۔

اصغری۔ تو پھر یہ جلتے ہوئے زخم کیسے ؟

امجد۔ مجھے سوچنے دو ..... بولو اجازت دیتی ہو سوچنے کی ؟

اصغری۔ آپ سوچیے۔

(طویل وقفہ جس میں امجد سوچ میں غرق رہتا ہے)

امجد۔ مجھے سعیدہ سے محبت نہیں ہے —— جس طرح مارکٹ سے آدمی اچھی چیز چُن کے لاتا ہے —— اسی طرح میں نے سینکڑوں لڑکیوں میں سے اسے انتخاب کر کے اپنی بیوی بنایا تھا —— مجھے اپنے اس انتخاب پر ناز تھا اور بجا ناز تھا —— سعیدہ مبالغے کی حد تک خوبصورت ہے —— اس پر میرا صرف اتنا حق ہے کہ میں نے اُسے چُنا اور اپنی رفیقۂ حیات بنایا —— اس حیات کا جواب کُھلی ہوتی اسی کرسی میں ڈھیر ہے —— جو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر ہل جل نہیں سکتی ..... ڈاکٹروں نے مجھے زیادہ سے زیادہ ایک سال اور زندہ رہنے کے لیے دیا ہے ..... سمجھ میں نہیں آتا میں کیوں اس عرصے تک ا ن کو الجھی زنجیروں میں باندھ کے رکھنا چاہتا ہوں، جن کا ہر حلقہ میری اپنی زندگی کی طرح غیر یقینی ہے ... کچھ سمجھ میں نہ آتا ..... (سوچتے ہوئے) اس کی جوان خوبصورتی ہی ایک وجہ ہو سکتی ہے (ایک دم چونک کر) ہی ہی ... ہی ہے اور کوئی نہیں ..... (تکلیف محسوس کرتا ہے) اوہ —— اوہ ..... وہ نظارہ —— وہ نظارہ ..... مجھے مجھول سکتا ہے کبھی وہ نظارہ ..... اس مسہری میں جوان خوبصورتی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ لیٹی دُنیا کی حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر رہی تھی ..... یہ نظارہ میرے ساتھ چمٹ گیا ہے —— نہیں، میں اس کے ساتھ چمٹ گیا ہوں ..... (وقفے کے بعد) اصغری!

اصغری۔ (چونک کر) جی!

امجد۔ کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے جو یہ جھمیلہ خ گر میرے وجود سے علیحدہ ہو جائے۔

اصغری۔ ہر مشکل کی جھولی میں اس کو آسان کرنے کی ترکیب چھپی ہوتی ہے

امجد۔ تو ڈھونڈنی چاہیے ...... لیکن ...... لیکن مجھے حجاب کیوں محسوس ہوتا ہے۔
اصغری۔ معلوم نہیں کیوں ــــ یہ مشکل، آپ ہی کی مشکل ہے۔ اس کے لیے آپ کا ہاتھ کسی نامحرم کا ہاتھ نہیں ہوگا۔
امجد۔ جانتا ہوں ...... میں اپنے دل کی ان نام ناخلف لنسوں سے واقف ہوں جو اس غلط جذبے کی دھڑکنیں پیدا کرتی ہیں
ــــ لیکن آج اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔
اصغری۔ کس کا؟
امجد۔ میرے سامنے آؤ۔

(اصغری، امجد کے سامنے آجاتی ہے)

امجد۔ جاؤ مسہری میں لیٹ جاؤ۔
اصغری۔ (ہچکچا کر) امجد میاں ــــ مجھ میں وہ جوان خوبصورتی نہیں ہے۔ جس کی رعنائیاں دُنیا کے حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر سکیں ــــ میری جوانی تو کھُردرے ٹاٹ کی شرمندۂ احسان ہونا چاہتی ہے۔
امجد۔ مسہری میں لیٹ جاؤ اصغری۔
اصغری۔ (آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں) نہیں امجد میاں ــــ مسہری کو تکلیف ہوگی ــــ یہ دولہن بیگم کے نرم اور نازک بدن کی عادی ہے۔
امجد۔ میں تمھیں حکم دیتا ہوں۔
اصغری۔ (سر جھکا کر) آپ مالک ہیں (مسہری میں لیٹ جاتی ہے ــــ آنکھیں چھت میں گڑ جاتی ہیں)
امجد۔ جانتی ہو آج کون سی رات ہے؟ ...... وہ رات ہے۔ جب ایک تڑی تڑی جوانی اور زیادہ تڑتڑ کر سالمیت اختیار کرنے والی ہے ــــ یہ قیامت کی رات ہے! فنا کی رات ــــ اس کے اندھیاروں میں وجود، عدم کی بھٹیوں میں پگھل کر ایک غیر فانی قالب اختیار کرے گا ...... یہ وہ رات ہے جس کے بعد اور کوئی رات نہیں آئے گی۔ اس کی اندھی آنکھوں میں ایسے کاجل سے تحریریں ہوں گی جو انھیں ہمیشہ کے لیے روشن کر دیں گی ــــ یہ وہ رات ہے، جب موت کے پھڑکتے ہوئے نتھنوں سے زندگی کے آخری قطرے ڈر کر خود بخود ہی باہر آجائیں گے ــــ یہ وہ رات ہے جب شکستگی اپنی کوکھ سے سربلند ایوانوں کو جنم دے گی ــــ ایسے سربلند ایوان جن کے کنگروں کو عرش کی بلند ترین اونچائیوں سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ یہ وہ رات ہے جب زمزم کا سا پانی رینگ رینگ کر زمین کی نہوں میں چھپ جائے گا اس کے بدلے خاک اُڑے گی جس سے پاکیزہ روحیں تیمم کریں گی ــــ یہ وہ رات ہے۔ جب کاتبِ تقدیر اپنا قلمدان اوندھا کر کے عرش کے کسی کونے میں مُنہ کر کے روئے گا ...... یہ وہ رات ہے جس میں امجد اس دُنیا کی تمام خوبصورتیوں کو تین دفعہ طلاق دیتا ہے اور ایک بدصورتی کو اپنے رشتۂ مناکحت میں لاتا ہے ...... (ایک دم چیختا ہے) اصغری ــــ اصغری!

(اس دوران میں اصغری مسہری پر سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچ کر اسے کھول چکی ہے اور اس کی سل پر کھڑی ہو کر نیچے گہرائیوں میں دیکھ رہی ہے)

امجد۔ (چیخ کر) یہ کیا کر رہی ہو اصغری؟

اصغری۔ (کھڑکی کی سل پہ مڑ کر امجد کو دیکھتی ہے) ایجاب و قبول ضروری ہے میرے مالک!

(نیچے کود جاتی ہے)

امجد۔ (دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر) اصغری!..... (ہاتھ ہٹاتا ہے اور چند لمحات کھلی کھڑکی کے اندھیرے کو دیکھتا رہتا ہے جو سبز دیوار میں تاریک زخم کے مانند مُنہ کھولے ہے) ایجاب و قبول!..... (بڑبڑاتا ہے) ایجاب و قبول واقعی ضروری ہے (زور لگا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی کرسی آگے کو کھیتا ہے — بڑی مشکل سے کھڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے)...... مجھے مشکل کو آسان کرنے کا یہ راستہ معلوم تھا..... مگر شاید کسی انگلی پکڑنے والے کی ضرورت تھی......

(کھڑکی کی سل دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے اور اپنا اپاہج جسم بڑی دقتوں سے اُوپر اُٹھاتا ہے اور دوسری طرف لٹکنا شروع کر دیتا ہے)

امجد۔ میری پہاڑیاں — میری پیاری پہاڑیاں — میری پیاری اصغری!

(اگلا دھڑ نیچے پھسلتا ہے اور ایک دم اُس کا سارا وجود اندھیرا کھا جاتا ہے)

(پردہ)

("پھندنے" میں سے)

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اُس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دُنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سُنی تھی۔ تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی۔ "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چودھری نے اُس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا۔ "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے۔ دل ہی میں اُستاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور اُستاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اُس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہُوا تھا۔ حقے کا دَور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو اُستاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اُتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا:

"یہ کسی پیر کی بددُعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتے رہتے تھے اور میں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دُکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ دُعا دی تھی، جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے۔۔۔ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہُوا ہے۔ ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ "یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آ جائے گا یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددُعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اُسے اُن کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا جب کبھی وہ گورے کے سُرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اُن کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اُوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اُس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اُس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

"...... " یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا۔ "آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے، یوں رُعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم اُن کے باوا کے نوکر ہیں......"

اس پر بھی اُس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اُس کا کوئی ساتھی اُس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اُس کی...... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے — بالکل مُردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پُرزے اُڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"...... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں۔ رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور اُن کی گفتگو سے اُسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے۔ تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سُنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا — کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت اُستاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک اُنگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اُونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا۔ "چل بیٹا، چل بیٹا ——— ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اُس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو مُنہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا۔ "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈّے کو لوٹا تو خلافِ معمول اُسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سُنانے والا تھا ——— بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈّے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اُس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اُس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا۔ اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اُس کے جسم میں مسّرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اُس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی "...... غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ——— نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہُوا پانی ہو گا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اُس وقت اُس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں (سفید چوہوں (وہ اُن کو اُسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈّے میں داخل ہوا تو اُستاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ "لا ہاتھ اِدھر...... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ——— تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے...... مزے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا۔ "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے۔ یہ رُوس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

اُستاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون

اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اُس نے "رُوس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پُرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ "اُنھیں" روس والے بادشاہ کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سُرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ اُستاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "رُوس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سُنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اُس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے تھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُن میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:۔

جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دُنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

اُن بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوتی۔ چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے اس لیے اُستاد منگو صرف اُوپر کے جُملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اُس نے خیال کیا۔ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اُس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا:

"ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اُس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اُس نے اُن تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سُنا:۔

نئے آئین نے میری اُمیدیں بڑھا دی ہیں اگر ..... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔"

"وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُن میں کچھ تو کمی ہو گی۔"

اس گفتگو نے منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ......!" وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اُس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اُس نے دو برس ہوئے چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا،

جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک اُستاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اُس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی۔ اُن سے اُس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے موسم خلافِ معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے اُستاد منگو اُٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اُس نے صبح کے سرد دُھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اُسے ہر چیز پُرانی نظر آئی ——— آسمان کی طرح پُرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اُس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پُرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اُس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اُس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی...... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کوئی بھی نہیں، لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں" اس خیال سے اُسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اُس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے، خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے اُن کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کُن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب اُستاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اُس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اُس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہو گا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک

نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اس غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

"تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یُوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دئی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی "ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو"

کچھ بھی ہو مگر اُستاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اُسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ اُستاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور اُن کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو اُستاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اُس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اُسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اُس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا:۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا —— شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا —— جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اُسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اُسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور اُستاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا اُسی طرح اُستاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئین

جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا اُسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اُسے بلایا ہے پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اُسے سڑک کے اُس طرف دُور، بجلی کے کھمبے کے پاس ایک گورا کھڑا نظر آیا جو اُسے ہاتھ سے بلا رہا تھا جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اُستاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اُس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیے ہیں، ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اُس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اُس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے تھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا، اور اپنے اندر اس نے اس گورے کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رُخ بچا کر سگرٹ سلگا رہا تھا، مڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک اُستاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اُوپر کو اُڑ گئیں۔

اُستاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اُترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا، گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے۔ گویا وہ اُستاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ اُستاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اُسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پچھلے برس اُس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اُسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ اُستاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اُس کے پُرزے اُڑا دیے ہوتے۔ مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوان ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا۔ ”کہاں جانا مانگتا ہے؟“

اُستاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا۔ ”ہیرا منڈی۔“

”کرایہ پانچ روپے ہوگا۔“ اُستاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران ہوگیا۔ وہ چلّایا۔ ”پانچ روپے۔ کیا تم ——— ؟“

”ہاں، ہاں، پانچ روپے۔“ یہ کہتے ہوئے اُستاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کرگیا۔ ”کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟“

اُستاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر اُستاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کرچکا تھا۔ وہ خیال کررہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے اُستاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی اُستاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اُس نے کھڑے کھڑے اُوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اُسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اُس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اُوپر کو اُٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اُس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اُتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر اُستاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اُس نے زور زور سے چلّانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے اُستاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:۔

”پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ..... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ——— اب ہمارا راج ہے بچہ؟“

لوگ جمع ہوگئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو اُستاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو اُن دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اُوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے ——— اب نیا قانون ہے میاں ——— نیا قانون!“

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی اُستاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف

اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ نیا قانون، نیا قانون، چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی ہے پُرانا"

اور اُس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

("منٹو کے افسانے" میں سے)

شہیدِ ساز

میں گجرات کاٹھیاواڑ کا رہنے والا ہوں۔ ذات کا بنیا ہوں۔ پچھلے برس جب تقسیم ہندوستان کا ٹنٹا ہوا تو میں بالکل بیکار تھا۔ معاف کیجیے گا میں نے لفظ ٹنٹا استعمال کیا۔ مگر اس کا کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ اردو زبان میں باہر کے الفاظ آنے ہی چاہئیں۔ چاہے وہ گجراتی ہی کیوں نہ ہوں۔

جی ہاں، میں بالکل بیکار تھا۔ لیکن کوکین کا تھوڑا سا کاروبار چل رہا تھا جس سے کچھ آمدن کی صورت ہو ہی جاتی تھی۔ جب بٹوارہ ہوا اور اِدھر کے آدمی اُدھر اور اُدھر کے اِدھر ہزاروں کی تعداد میں آنے جانے لگے تو میں نے سوچا چلو پاکستان چلیں۔ کوکین کا نہ سہی کوئی اور کاروبار شروع کر دوں گا۔ چنانچہ وہاں سے چل پڑا اور راستے میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے دھندے کرتا پاکستان پہنچ گیا۔

میں تو چلا ہی اس نیت سے تھا کہ کوئی موٹا کاروبار کروں گا۔ چنانچہ پاکستان پہنچتے ہی میں نے حالات کو اچھی طرح جانچا اور الاٹمنٹوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسکہ پالش مجھے آتا ہی تھا۔ چکنی چپڑی باتیں کیں۔ ایک دو آدمیوں کے ساتھ یارانہ گانٹھا اور ایک چھوٹا سا مکان الاٹ کرا لیا۔ اس سے کافی منافع ہوا تو میں مختلف شہروں میں پھر کر مکان اور دکانیں الاٹ کرانے کا دھندا کرنے لگا۔

کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بھی چنانچہ الاٹمنٹوں کے سلسلے میں کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ کسی کے مسکہ لگایا کسی کی مٹھی گرم کی، کسی کو کھانے کی دعوت دی، کسی کو ناچ رنگ کی۔ غرضیکہ بے شمار بکھیڑے تھے۔ دن بھر خاک چھانتا، بڑی بڑی کوٹھیوں کے پھیرے کرتا اور شہر کا چپہ چپہ دیکھ کر اچھا سا مکان تلاش کرتا جس کے الاٹ کرانے سے زیادہ منافع ہو۔ انسان کی محنت کبھی خالی نہیں جاتی۔ چنانچہ ایک برس کے اندر اندر میں نے لاکھوں روپے پیدا کر لیے۔ اب خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی۔ بینک میں بے اندازہ مال پانی ——— معاف کیجیے گا میں کاٹھیاواڑ گجرات کا روزمرہ استعمال کر گیا۔ مگر کوئی واندہ نہیں۔ اُردو زبان میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہونے چاہئیں ——— جی ہاں، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی، نوکر چاکر، پیکارڈ موٹر، بینک میں ڈھائی لاکھ روپے۔ کارخانے اور دکانیں الگ ..... یہ سب تھا۔ لیکن میرے دل کا چین جانے کہاں اُڑ گیا۔ یوں تو کوکین کا دھندہ کرتے ہوئے بھی دل پر کبھی کبھی بوجھ محسوس ہوتا تھا؟ لیکن اب تو جیسے دل رہا ہی نہیں تھا۔ یا پھر یوں کہیے کہ بوجھ اتنا آن پڑا کہ دل اس کے نیچے دب گیا۔ پر یہ بوجھ کس بات کا تھا؟ آدمی ذہین ہوں، دماغ میں کوئی سوال پیدا ہو جائے تو میں اس کا جواب ڈھونڈ ہی نکالتا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے

(حالانکہ دل کا کچھ پتا ہی نہیں تھا) میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس گڑبڑ گھوٹالے کی وجہ کیا ہے ؟

عورت ؟ ..... ہو سکتی ہے ۔ میری اپنی تو کوئی تھی نہیں ۔ جو تھی وہ کاٹھیاواڑ گجرات ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی ۔ لیکن دوسروں کی عورتیں موجود تھیں ۔ مثال کے طور پر اپنے ماما ہی کی تھی ۔ اپنا اپنا ٹیسٹ ہے ۔ سچ پوچھیے تو عورت جوان ہونی چاہیے اور یہ ضروری نہیں کہ پڑھی لکھی ہو ، ڈانس کرنا جانتی ہو ۔ اپن کو تو ساری جوان عورتیں چلتی ہیں ۔ (کاٹھیاواڑ گجرات کا محاورہ ہے جس کا اُردو میں نعم البدل موجود نہیں) ۔

عورت کا تو سوال ہی اُٹھ گیا اور دولت کا پیدا ہی نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے کہ بندہ زیادہ لالچی نہیں جو کچھ ہے اسی پر قناعت ہے لیکن پھر یہ دل والی بات کیوں پیدا ہو گئی تھی ۔

آدمی ذہین ہوں ۔ کوئی مسئلہ سامنے آجائے تو اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں ۔ کارخانے چل رہے تھے ۔ دکانیں بھی چل رہی تھیں ۔ روپیہ اپنے آپ پیدا ہو رہا تھا ۔ میں نے الگ تھلگ ہو کر سوچنا شروع کیا اور بہت دیر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دل کی گڑبڑ صرف اس لیے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا ۔

کاٹھیاواڑ گجرات میں تو نے بیسیوں نیک کام کیے تھے ۔ مثال کے طور پر جب میرا دوست پانڈورنگ مر گیا تو میں نے اس کی رانڈ کو اپنے گھر ڈال لیا اور دو برس تک اُس کو دھندا کرنے سے روکے رکھا ۔ وناٹک کی لکڑی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو اسے نئی خرید دی ۔ تقریباً چالیس روپے اس پر اُٹھ گئے تھے ۔ جمنا بائی کو گرمی ہو گئی سالی کو (معاف کیجیے گا) کچھ پتا ہی نہیں تھا ۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا ۔ چھ مہینے برابر اس کا علاج کرواتا رہا ..... لیکن پاکستان آکر میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا اور دل کی گڑبڑ کی یہی وجہ تھی ۔ ورنہ اور سب ٹھیک تھا ۔

میں نے سوچا ، کیا کروں ؟ —— خیرات دینے کا خیال آیا ۔ لیکن ایک روز شہر میں گھوما تو دیکھا کہ قریب قریب ہر شخص بھکاری ہے ۔ کوئی بھوکا ہے ، کوئی ننگا ۔ کس کس کا پیٹ بھروں ، کس کس کا انگ ڈھانکوں ؟ —— سوچا ایک لنگر خانہ کھول دوں ، لیکن ایک لنگر خانے سے کیا ہوتا اور پھر اناج کہاں سے لاتا ؟ بلیک مارکٹ سے خریدنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ سوال بھی ساتھ ہی پیدا ہو گیا کہ ایک طرف گناہ کر کے دوسری طرف کار ثواب کا مطلب ہی کیا ہے ؟

گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر میں نے لوگوں کے دُکھ درد سُنے ۔ سچ پوچھیے تو ہر شخص دُکھی تھا ۔ وہ بھی جو دکانوں کے تھڑوں پر سوتے ہیں اور وہ بھی جو اُونچی اونچی حویلیوں میں رہتے ہیں ۔ پیدل چلنے والے کو یہ دُکھ تھا کہ اس کے پاس کام کا کوئی جُوتا نہیں ۔ موٹر میں بیٹھنے والے کو یہ دُکھ تھا کہ اس کے پاس کار کا نیا ماڈل نہیں ۔ ہر شخص کی شکایت اپنی اپنی جگہ درست تھی ۔ ہر شخص کی حاجت اپنی اپنی جگہ معقول تھی ۔

میں نے غالب کی ایک غزل اللہ بخشے شو لاپور کی امینہ بائی چتلے کر سے سُنی تھی ۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

کس کی حاجت روا کرے کوئی

معاف کیجیے گا یہ اس کا دوسرا مصرع ہے اور ہو سکتا ہے پہلا ہی ہو ۔

جی ہاں ، میں کس کس کی حاجت روا کرتا جب سو میں سے سو ہی حاجت مند تھے ۔ میں نے پھر یہ بھی سوچا کہ خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں ۔ ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں ۔ لیکن میں نے مہاجرین کے کیمپوں میں جا جا کر جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا ۔

تو مجھے معلوم ہوا کہ خیرات نے بہت سے مہاجرین کو بالکل ہی نکما بنا دیا ہے۔ دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں: تاش کھیل رہے ہیں جُگا ہو رہی ہے۔ (معاف کیجیے گا جُگا کا مطلب ہے جُوا یعنی قمار بازی) گالیاں بک رہے ہیں اور فوگٹ یعنی مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں...... ایسے لوگ بھلا پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ بھیک دینا ہرگز ہرگز نیکی کا کام نہیں۔ لیکن پھر نیکی کے کام کے لیے اور کون سا رستہ ہے؟

کیمپوں میں دھڑا دھڑ آدمی مر رہے تھے۔ کبھی ہیضہ پھوٹتا تھا کبھی پلیگ۔ ہسپتالوں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مجھے بہت ترس آیا۔ قریب تھا کہ ایک ہسپتال بنوا دوں مگر سوچنے پر ارادہ ترک کر دیا۔ پوری سکیم تیار کر چکا تھا۔ عمارت کے لیے ٹنڈر طلب کرتا۔ داخلے کی فیسوں کا روپیہ جمع ہو جاتا۔ اپنی ہی ایک کمپنی کھڑی کر دیتا اور ٹنڈر اس کے نام نکال دیتا۔ خیال تھا ایک لاکھ روپے عمارت پر صرف کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ستر ہزار روپے میں بلڈنگ کھڑی کر دیتا اور پورے تیس ہزار روپے بچا لیتا مگر یہ ساری اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ جب میں نے سوچا کہ اگر مرنے والوں کو بچا لیا گیا تو یہ جو زائد آبادی ہے وہ کیسے کم ہوگی۔

غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی فالتو آبادی کا ہے۔ لفڑا کا مطلب ہے جھگڑا، وہ جھگڑا جس میں فضیحتا بھی ہو۔ لیکن اس سے بھی اس لفظ کی پوری معنویت میں بیان نہیں کر سکا۔

جی ہاں غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی اس فالتو آبادی کا باعث ہے۔ اب لوگ بڑھتے جائیں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زمینیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی۔ آسمان بھی ساتھ ساتھ پھیلتا جائے گا۔ بارشیں زیادہ ہوں گی۔ اناج زیادہ اُگے گا۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا —— کہ ہسپتال بنانا ہرگز ہرگز نیک کام نہیں۔

پھر سوچا مسجد بنوا دوں۔ لیکن اللہ بخشے شولاپور کی ابینہ بائی پتھلے کر گا گایا ہوا ایک شعر یاد آ گیا ؎

نام منجور ہے تو فیج کے اسباب بنا

وہ منظور کو منجور اور فیض کو فیج کہا کرتی تھی۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا۔

کس کم بخت کو نام و نمود کی خواہش ہے۔ وہ جو نام اچھالنے کے لیے پُل بناتے ہیں۔ نیکی کا کیا کام کرتے ہیں؟ خاک! میں نے کہا نہیں یہ مسجد بنوانے کا خیال بالکل غلط ہے۔ بہت سی الگ الگ مسجدوں کا ہونا بھی قوم کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ عوام بٹ جاتے ہیں۔

تھک ہار کر میں حج کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے خود ہی ایک راستہ بتا دیا۔ شہر میں ایک جلسہ ہوا۔ جب ختم ہوا تو لوگوں میں بدنظمی پھیل گئی۔ اتنی بھگدڑ مچی کہ تیس آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کی خبر دوسرے روز اخباروں میں چھپی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاک نہیں بلکہ شہید ہوئے تھے۔

میں نے سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کے علاوہ میں کئی مولویوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اچانک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں انھیں شہادت کا رُتبہ ملتا ہے۔ یعنی وہ رُتبہ جس سے بڑا کوئی اور رتبہ ہی نہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر لوگ مرنے کی بجائے شہید ہوا کریں تو کتنا اچھا ہے۔ وہ جو عام موت مرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موت بالکل اکارت جاتی ہے۔ اگر وہ شہید ہو جاتے تو کوئی بات بنتی۔

میں نے اس باریک بات پر اور غور کرنا شروع کیا۔

چاروں طرف جدھر دیکھو خستہ حال انسان تھے۔ چہرے زرد، فکر و تردد اور غمِ روزگار کے بوجھ تلے پسے ہوئے، دھنسی ہوئی آنکھیں بے جان چال، کپڑے تار تار۔ ریل گاڑی کے کنڈم مال کی طرح یا تو کسی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پڑے ہیں۔ یا بازاروں میں بے مالک مویشیوں کی طرح منہ اُٹھائے بے مطلب گھوم رہے ہیں کیوں جی رہے ہیں۔ کس کے لیے جی رہے ہیں اور کیسے جی رہے ہیں۔ اس کا کچھ پتا ہی نہیں کوئی وبا پھیلی۔ ہزاروں مرگئے اور کچھ نہیں تو بھوک اور پیاس ہی سے گھل گھل کر مرے۔ سردیوں میں اکڑ گئے، گرمیوں میں سوکھ گئے کسی کی موت پر کسی نے دو آنسو بہا دیے۔ اکثریت کی موت خشک ہی رہی۔

زندگی سمجھ میں نہ آئی، ٹھیک ہے اس سے حظ نہ اُٹھایا، یہ بھی ٹھیک ہے...... وہ کس کا شعر ہے۔ اللہ بخشے شو دلوری کی امینہ بائی چٹیلے کر کیا درد بھری آواز میں گایا کرتی تھی ؎

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میرا مطلب ہے اگر مرنے کے بعد بھی زندگی نہ سدھری تو لعنت ہے شُسری پر۔

میں نے سوچا کیوں نہ یہ بیچارے، یہ قسمت کے مارے، در در کے ٹھکرائے ہوئے انسان جو اس دنیا میں ہر اچھی چیز کے لیے ترستے ہیں۔ اس دنیا میں ایسا رتبہ حاصل کریں کہ وہ جو یہاں ان کی طرف نگاہ اُٹھانا پسند نہیں کرتے وہاں ان کو دیکھیں اور رشک کریں۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ عام موت نہ مریں بلکہ شہید ہوں۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ لوگ شہید ہونے کے لیے راضی ہوں گے؟ میں نے سوچا کیوں نہیں۔ وہ کون مسلمان ہے جس میں ذوقِ شہادت نہیں۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی تو ہندوؤں اور سکھوں میں بھی یہ رتبہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے سخت ناامیدی ہوئی جب میں نے ایک مریل سے آدمی سے پوچھا۔ کیا تم شہید ہونا چاہتے ہو؟" تو اس نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

سمجھ میں نہ آیا کہ وہ آدمی جی کر کیا کرے گا۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ دیکھو بڑے میاں، زیادہ سے زیادہ زیادہ سے زیادہ تم ڈیڑھ مہینہ اور جیو گے۔ چلنے کی تم میں سکت نہیں۔ کھانستے کھانستے غوطے میں جاتے ہو تو ایسا لگتا ہے کہ بس دم نکل گیا پھوٹی کوڑی تک تمہارے پاس نہیں، زندگی بھر تم نے سکھ نہیں دیکھا۔ مستقبل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اور جی کر کیا کرو گے فوج میں تم بھرتی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے محاذ پر اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دینے کا خیال بھی عبث ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم کوشش کر کے یہیں بازار میں یہ ڈیرے میں جہاں تم رات کو سوتے ہو، اپنی شہادت کا بندوبست کر لو۔ اس نے پوچھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے جواب دیا "یہ سامنے کیلے کا چھلکا پڑا ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ تم اس پر سے پھسل جاؤ...... ظاہر ہے کہ تم مر جاؤ گے اور شہادت کا رتبہ پاؤ گے۔" پر یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی کہنے لگا "میں کیوں آنکھوں دیکھے کیلے کے چھلکے پر پاؤں دھرنے لگا ـــ کیا مجھے اپنی جان عزیز نہیں" ـــ اللہ اللہ کیا جان تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ جھریوں کی گٹھڑی!!

مجھے بہت افسوس ہوا اور اس وقت اور بھی زیادہ ہوا جب میں نے سُنا کہ وہ کمبخت جو بڑی آسانی سے شہادت کا رتبہ اختیار کر سکتا تھا۔ خیراتی ہسپتال میں لوہے کی چارپائی پر کھانستا کھنکارتا مر گیا۔

ایک بڑھیا تھی منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ آخری سانس لے رہی تھی۔ مجھے بہت ترس آیا۔ ساری عمر غریب کی مفلسی اور رنج وغم میں گذری تھی۔ میں اُسے اُٹھا کر ریل کے پاٹے پر لے گیا۔ معاف کیجیے گا۔ ہمارے یہاں پٹڑی کو پاٹا کہتے ہیں۔ لیکن جناب جونہی اس نے ٹرین کی آواز سُنی ہوش میں آگئی اور کوک بھرے کھلونے کی طرح اُٹھ کر بھاگ گئی۔

میرا دل ٹوٹ گیا لیکن پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ بنیا کا بیٹا اپنی دُھن کا پکا ہوتا ہے۔ نیکی کا جو صاف اور سیدھا راستہ مجھے نظر آیا تھا میں نے اس کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

مغلوں کے وقت کا ایک بہت بڑا احاطہ خالی پڑا تھا۔ اس میں ایک سو اکاون چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ بہت ہی خستہ حالت میں۔ میری تجربہ کار آنکھوں نے اندازہ لگا لیا کہ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کی چھتیں ڈھے جائیں گی چنانچہ میں نے اس احاطے کو ساڑھے دس ہزار روپے میں خرید لیا اور اس میں ایک ہزار مفلوک الحال آدمی بسا دیے۔ دو مہینے کرایہ وصول کیا۔ ایک روپیہ ماہوار کے حساب سے۔ تیسرے مہینے جیسا کہ میرا اندازہ تھا۔ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کمروں کی چھتیں نیچے آرہیں اور سات سو آدمی جن میں بچے بوڑھے سبھی شامل تھے۔ شہید ہو گئے۔

وہ جو میرے دل پہ بوجھ سا تھا کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ آبادی میں سے سات سو آدمی کم بھی ہو گئے۔ لیکن انھیں شہادت کا رتبہ بھی مل گیا ——— ادھر کا پلڑا بھاری ہی رہا۔

جب سے میں یہی کام کر رہا ہوں۔ ہر روز حسب توفیق دو تین آدمیوں کو جام شہادت پلا دیتا ہوں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اللہ بخشے شولاپور کی امینہ بائی چتلے کر ایک شعر گایا کرتی تھی۔ لیکن معاف کیجیے گا وہ شعر یہاں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ کچھ بھی ہو، کہنا یہ ہے کہ مجھے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کو جس کا وجود چھکڑے کے پانچویں پہیے کی طرح بے معنی اور بیکار تھا۔ جام شہادت پلانے کے لیے مجھے پورے دس دن جگہ جگہ کیلے کے چھلکے گرانے پڑے لیکن موت کی طرح جہاں تک میں سمجھتا ہوں شہادت کا بھی ایک دن مقرر ہے۔ دسویں روز جا کر وہ پتھر کے فرش پر کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا اور شہید ہُوا۔

آج کل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے۔ دو لاکھ کا ہے۔ اس میں سے پچھتر ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ بیمہ بھی کرا لیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ اڑاڑا دھڑام گر پڑے گی۔ کیونکہ مصالحہ ہی میں نے ایسا لگوایا ہے۔ اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے۔ خدا کے گھر سے مجھے پُوری پُوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ پرلے درجے کا گناہگار ہے۔ جس کی شہادت اللہ تبارک و تعالیٰ کو منظور نہیں تھی۔

(”نمرود کی خدائی“ میں سے)

بڑا نامور افسانہ نگار تھا

۱۳۷۴ھ

مختصر حالات

پیدائش	۱۱ مئی ۱۹۱۲ء
مقام پیدائش	سمبرالہ ـ ضلع لدھیانہ
اولاد	نگہت، نزہت اور نصرت
تعلیم	امرتسر اور علی گڑھ میں
قیام	امرتسر، علی گڑھ، لاہور، دلی اور بمبئی
انتقال	۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء مدفن لاہور میانی صاحب

○

پہلی کہانی	عاشہ
آخری کہانی	کبوتر اور کبوتری

○

جن کہانیوں پر مقدمے چلے

کالی شلوار	دھواں
بو	کھول دو
ٹھنڈا گوشت	اوپر نیچے اور درمیان

○

افسانوں کا پہلا مجموعہ، "منٹو کے افسانے" ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا

تصانیف

منٹو کے افسانے	منٹو کے ڈرامے
افسانے اور ڈرامے	دھواں
چغد	لذتِ سنگ
یزید	ٹھنڈا گوشت
نمرود کی خدائی	سیاہ حاشیے
خالی بوتلیں خالی ڈبے	تلخ ترش شیریں
سڑک کے کنارے	گنجے فرشتے
بادشاہت کا خاتمہ	اوپر نیچے اور درمیان
سرکنڈوں کے پیچھے	پھندنے
برقعے	شکاری عورتیں
منٹو کے مضامین	آؤ
جنازے	تین عورتیں
کروٹ	عصمت چغتائی
نور جہاں سرور جہان	سرگذشتِ اسیر (ترجمہ)
ویرا (ترجمہ)	گورکی کے افسانے (ترجمہ)

○

ان کے علاوہ منٹو کی سات آٹھ کتابیں زیرِ طبع ہیں۔

(۳)

منٹو کے فن اور شخصیت پر مضامین

فن پر لکھنے والے

ممتاز شیریں
وقار عظیم
محمد حسن عسکری
عابد علی عابد
ابواللیث صدیقی
عبادت بریلوی
ممتاز حسین

شخصیت پر لکھنے والے

عصمت چغتائی
اوپندر ناتھ اشک
احمد ندیم قاسمی
ہاجرہ مسرور
ابوسعید قریشی
حامد جلال
غلام عباس
محمد طفیل

منٹو کی فنی تکمیل

منٹو کے آخری دَور کی دو تحریریں، میری نظر میں منٹو کی ادبی تکمیل کی مظہر ہیں۔ ڈرامہ "اس منجدھار میں" اور افسانہ "سڑک کے کنارے"۔ "بابو گوپی ناتھ" ایک بڑا اہم موڑ تھا جس سے منٹو کی افسانہ نگاری کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس میں منٹو نے خلافِ معمول بڑا بھرپور، پیچیدہ اور مکمل کردار پیش کیا تھا اور اس کردار کو پیش کرتے ہوئے منٹو کا رویہ بھی ایک سچے فن کار کا رویہ تھا۔ ایک مکمل کردار کے ساتھ اس افسانے میں ایک مکمل اور بھرپور تجربہ بھی تھا۔ جیسا کہ عسکری صاحب نے کہا ہے۔ منٹو عموماً چھوٹے چھوٹے انفرادی تجربوں کو فوراً رقم کر کے افسانہ کی گرفت میں لے آتا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ چھوٹے چھوٹے تجربے آپس میں مل کر اور وقت گزرنے پر فن کار کے ذہن میں ڈھل کر ایک مکمل اور بڑے تجربے کی تشکیل پائیں۔ البتہ "بابو گوپی ناتھ" میں ایک تجربے اور اس تکمیل کا احساس پایا جاتا تھا۔

منٹو کے فن کے اس تدریجی ارتقا کی تکمیل آخری دَور کی اُن دو تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ جن میں ایک تکمیل، ایک وسعت، ایک کائناتی گیرائی کا احساس ہے۔ زندگی اور وجود کا ایک فلسفہ ہے۔ سماج اور زندگی کی حقیقتوں کو بڑی بے رحم صداقت اور بے باکی سے بیان کرنے میں منٹو کے قلم کی قوت منفی اور تخریبی تھی۔ بعد میں منٹو میں اثباتی اقدار تو پیدا ہو ہی چلے تھے۔ لیکن آخر میں منٹو اس درجہ تک پہنچ چکا تھا جس میں کہ ایک فن کار میں زندگی اور وجود کا ایک مثبت فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔

اگر کوئی "اس منجدھار میں" کی گہرائیوں کو سمجھ سکے تو اسے یہ احساس ہوگا کہ اس میں منٹو نے منفی عناصر (NEGATIVE ELEMENTS) کو، جن میں زندگی کی قوت نہیں، عدم اور فنا کی طرف جاتے ہوئے دکھایا ہے۔ اور اُن اثباتی عناصر (POSITIVE ELEMENTS) کو آپس میں ملایا ہے جن سے حیات کی تجدید ہوتی ہے اور زندگی آگے بڑھتی ہے

یوں تو پہلی نظر میں "اس منجدھار میں" کا موضوع وہی نظر آتا ہے، جو ڈی۔ ایچ لارنس کے (LADY CHALLERLEY LOVER) کا ہے۔ کردار بھی تقریباً وہی ہیں، ایک شوہر جو شادی کے فوراً بعد مفلوج ہو جاتا ہے، اس کی حسین، جوان صحت مند بیوی، ایک جوان صحت مند مرد جو اس کی بیوی کو زندگی کی قوت دے سکتا ہو اور ایک خادمہ جو اس مفلوج شوہر سے ہمدردی اور لگاؤ رکھتی ہے لیکن لارنس کی اس موضوع پر پیش کش سے منٹو کی پیش کش کہیں اونچی اور فن کارانہ ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ایک ناول ہے، دوسرا ڈرامہ۔ اس میں ایک فلسفہ ہے، لارنس سے مختلف، حالانکہ لارنس کا بھی ایک فلسفہ تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لارنس نے جنس ہی کا ایک فلسفہ بنا لیا تھا۔

منٹو کی اس تحریر میں ("اس منجدھار میں") ایک جمالیاتی (AESTHETIC) احساس ہے اور ایک جمالیاتی رویہ (AESTHETIC APPROACH) یوں تو زندگی کی قوت کو منٹو نے بھی لارنس کے معنی میں لیا ہے، یعنی جنس، لیکن یہاں منٹو

نے حسن کو زیادہ اہمیت دی ہے اور ان دوسرے اثباتی عناصر کو بھی جو حسن اور زندگی کی تکمیل کرتے ہیں۔

حسن ایک اثباتی عنصر ہے، حسن، جوانی، صحت، لطیف جذبات، محبت کی قوت یہ سب اثباتی عناصر ہیں جو بیوی میں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور کم و بیش اس کے شوہر کے چھوٹے بھائی میں بھی موجود ہیں۔ لیکن شوہر جب وہ کسی حادثہ کی وجہ سے اس طرح مفلوج ہو جاتا ہے کہ اس میں زندگی کی قوت مفقود ہو جاتی ہے، ایک منفی عنصر بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ منٹو کے ہاں اس مفلوج شوہر کو پیش کرتے ہوئے وہ ہلکی سی تحقیر نہیں پائی جاتی جو لارنس کے لہجہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف منٹو کو اس کردار سے پوری ہمدردی ہے، بلکہ منٹو نے اس بے پناہ ذہنی کرب واذیت اور کشمکش کو ڈرامہ کا اہم حصّہ بنایا ہے۔ اس میں یہ محسوس کرنے کی صلاحیت ہے کہ آخر اس کی حسین اور نوجوان بیوی کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ اس کے بھائی کی طرف متوجہ ہو جس سے اسے صحیح معنوں میں مثبت محبّت مل سکتی ہے اور ان دونوں کو آپس میں بے اختیار کشش ایک فطری امر ہے۔ وہ خود تو اپنے مفلوج جسم، نفسیاتی کمزوری اور احساس کمتری کے ساتھ ایک منفی عنصر بن چکا ہے جس سے ہمدردی کی جاسکتی ہے، محبّت نہیں۔ محبّت اسے اپنی خادمہ سے ملتی ہے جو خود محبت کے قابل نہیں جو بدصورت ہے، اور بدصورتی بجائے خود ایک منفی عنصر ہے۔ یہ دونوں منفی عناصر (یعنی مفلوج شوہر اور خادمہ)، ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں، لیکن ان کی قربت اور آپس میں ملاپ کوئی اثباتی قوت پیدا نہیں کر سکتے، لہٰذا وہ زندگی کی بجائے موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، ایک ساتھ خودکشی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ منفی عناصر فنا کی طرف جاتے ہیں۔

دوسری طرف مثبت عناصر بے اختیار ایک دوسرے کی طرف کھنچ جاتے ہیں، آزاد، کھلی فضاؤں میں، قدرت کے رنگین نظاروں میں ان کی محبت پروان چڑھتی ہے اور جب مثبت عناصر آپس میں ملتے ہیں تو زندگی پر بہار آجاتی ہے۔

منٹو، یوں تو ایک فطری فن کار ہے لیکن اپنی چند ایک تحریروں میں۔ چنانچہ "بو"، "ٹھنڈا گوشت" (منٹو نے خود "ٹھنڈا گوشت" پر جو کچھ لکھا ہے اس سے اس بات کی پوری تصدیق ہوتی ہے) "سڑک کے کنارے" اور "اس منجدھار میں" وغیرہ میں وہ بڑا ہی شعوری فن کار (CONSCIOUS ARTIST) نظر آتا ہے۔

ایک اور اہم بات جو منٹو کے آخری دَور کی ان دو تحریروں میں پائی جاتی ہے اور منٹو کی ادبی تکمیل کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ وِژن کی وسعت ہے۔ ان دونوں تحریروں میں ایک کائناتی وِژن (COSMIC VISION) ہے۔ یہاں منٹو کے وِژن میں وہ وسعت پیدا ہو چکی ہے جو انفرادی اور خصوصی (PARTICULAR) کو آفاقی اور کائناتی (UNIVERSAL AND COSMIC) میں تحلیل کر دے۔

ایک خاص واقعہ، ایک خاص تجربہ، ایک خاص، انوکھا، انفرادی کردار پیش کرنا منٹو کی ایک خصوصیت تھی "سڑک کے کنارے" میں بھی ایک خاص واقعہ ہی ہے لیکن یہاں خصوصیت، آفاقیت میں حلول ہو گئی ہے۔ افسانے کے سارے جزئیات میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو خصوصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مرد کی نیلی آنکھیں، لیکن ان نیلی آنکھوں سے آسمان کی نیلاہٹ کی تشبیہہ (آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا)، اس خصوصیت میں بھی وسیع کائناتی وِژن کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔

یہاں ہم زمان ومکان (TIME AND SPACE) کی تخصیص بھی بھول جاتے ہیں، یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ واقعہ کسی خاص عورت اور خاص مرد سے وابستہ تھا، وہاں ازلی عورت اور ازلی مرد ہے۔ ان کا ملاپ، وجود کی تکمیل، وہ ازلی بنیادی گناہ، اور اس بنیادی گناہ کا کفارہ جو صرف عورت ادا کرتی ہے۔

"دو روحوں کا سمٹ کر ایک ہو جانا، اور ایک ہو کر والہانہ وسعت اختیار کر جانا، دو روحیں سمٹ کر اس ننھے سے نقطے پر پہنچتی ہیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے۔"

یہاں منٹو کا جنس کا تصور بھی کتنا مختلف اور کتنا بلند ہے۔ گو منٹو کا نظریہ جنس کے متعلق ہمیشہ صحت مند رہا ہے اور وہ اسے ایک ازلی، فطری صحت مند جذبہ سمجھتا رہا ہے۔ لیکن پہلے منٹو کے ہاں جنس کا تصور محض جسمانی تھا۔ لیکن یہاں منٹو کا یہ تصور اتنا بلند ہو چکا ہے کہ اسے وجود کی تکمیل اور روحوں کے ملاپ سے تعبیر کیا ہے۔

وجود کی تکمیل اور روحوں کے ملاپ کے اس تصور کے ساتھ ہی یہاں بنیادی گناہ کا تصور بھی شامل ہے اور ٹرک کے کنارے میں بنیادی گناہ کا تصور اتنا گہرا ہے جتنا کہ ہمیں ہاتھورن کے ہاں ملتا ہے۔

اس گناہ کا نشان عورت کے سینے پر داغ دیا گیا ہے۔ اور عورت اپنے سینے پر اس دہکتے ہوئے انگاروں کو دیکھ کر اپنے آپ سے یہ پوچھتی ہے، کیا یہ واقعی گناہ تھا؟ اور کیا یہ صرف میرا گناہ تھا؟

"میں نے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی، اس کے وجود کی تکمیل کی تھی اور اس کے وجود کے ذروں سے اپنی ہستی کی تعمیر و تکمیل کی تھی......"

یہ اس کی شخصیت کی تکمیل تھی کہ وہ ماں بن رہی تھی، ایک موتی اس کی کوکھ کی سیپ میں تشکیل پا رہا تھا۔ ماتا کی گرمی اس کی ساری رگوں میں سرایت کر گئی تھی اور اس کی دودھ بھری چھاتیوں کی گولائیوں میں مسجد کے اجلے پاکیزہ میناروں کی سی تقدیس آ رہی تھی۔ وہ ماں بن رہی تھی۔ اس کی تکمیل تو آج ہوئی تھی۔ لیکن اب جبکہ اس کی تکمیل ہو گئی تھی وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا......

"اس کائنات میں ایک روح کبھی کبھی کیوں گھائل چھوڑ دی جاتی ہے؟"

عورت یوں محسوس کرتی ہے جیسے وہ ہاتھورن کی ہیسٹر کی طرح ایک چوراہے پر کھڑی ہے "یہ دنیا ایک چوراہا ہے، یاد رکھ تجھ پر انگلیاں اٹھیں گی"۔ اور جب اس کی کوکھ کا موتی سیپ سے باہر نکلے تو گناہ کی زندہ علامت ہو جائے گا۔ (ہاتھورن کے (SCARLET LETTER) میں بھی موتی گناہ کی زندہ علامت ہے۔ موتی (PEARL) ہیسٹر کی ناجائز بچی کا نام ہے اور اس نام میں بھی گویا ایک رمزی معنویت (SYMBOLIC-SIGNIFICMCE) ہے۔

"انگلیاں اٹھیں گی، سیپی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی...... یہ انگلیاں سنپولیاں بن بن کر ان دونوں کو ڈسیں گی اور اپنے زہر سے ان کو نیلا کر دیں گی......

اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی، زندگی موت سے بدتر ہو گی، اس کی بھی اور بچی کی بھی۔ اس سے بہتر ہے کہ اس ننھی زندگی کو آغاز ہی میں ختم کر دیا جائے۔

اور جب ایک ماں، اپنے سارے جذبات اور احساسات کو کچل کر، اپنی ممتا کا آپ گلا گھونٹ کر جب اس زندگی کو ختم کرنے لگتی ہے، جو اس کی اپنی زندگی کا ایک حصہ تھی، اس کے اپنے خون سے بنی تھی، اس کی کوکھ میں تشکیل پائی تھی، وہ ماں کس بے پناہ ذہنی و روحانی کرب سے گزرتی ہوگی؟ اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے!

اور اخبار میں چھپی ہوئی وہ چند سطریں، چند سرد، منجمد سطریں اس المیہ کو کہاں پا سکتی ہیں؟ لیکن فن کار منٹو اخبار کی ان چند سطروں میں وہ گہرا المیہ تلاش کر لیتا ہے، جو عورت اور ماں کا المیہ ہے۔

اس المیہ کو اپنی ساری گہرائیوں اور ساری (PIOGNANCY) کے ساتھ پیش کر چکنے کے بعد جب منٹو اچانک اپنا افسانہ اس اخباری رپورٹ پر ختم کرتا ہے تو ہم گویا ایک دھچکے کے ساتھ بہت بلندیوں پر سے سطح زمین پر آ گرتے ہیں یا وسیع گہرائیوں سے اچانک باہر نکل آتے ہیں، زمینی سطح پر۔

اور کائناتی وسعت اور گیرائی سمٹ کر ایک خصوصی نقطہ پر آ جاتی ہے

افسانہ کے اختتام پر یہ اخباری رپورٹ، پہلی نظر میں، کچھ غیر ضروری معلوم ہوتی ہے، اور غیر فن کارانہ بھی، جس سے افسانے کے ٹمپو، ٹون اور کیفیت کو ایک دھچکا سا لگتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اختتام ٹھیک معلوم ہوتا ہے، منٹو نے ایک معنویت، ایک خاص (SIGNIFICANCE) پیدا کی ہے۔

اس افسانے میں جو سارا ذہنی کیفیات سے مرتب ہے، واقعاتی طور پر یہ بتانا کہ عورت آخر میں بچی کو مارنے کی کوشش کرتی ہے بالکل مناسب اور موزوں نہ تھا۔ منٹو نے اس بات کا انکشاف اخباری رپورٹ کے ذریعہ کر دیا ہے۔ یہ زیادہ موثر ہے۔ علاوہ بریں اس رپورٹ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچی زندہ رہ جاتی ہے اور اس دوسرے انکشاف پر کئی اور سوال ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ یہ بچی زندہ رہ کر سماج کے ہاتھوں کیا کیا دکھ اٹھائے گی، وہ عورت بن کر شاید ہی گناہ کرے گی، (یا گناہ پر مجبور کی جائے گی) جو اس کی ماں نے کیا تھا، شاید وہ بھی ماں بنے گی اور اپنے 'موتی' اپنے گناہ کے پھل کو اپنے ہاتھوں......

کیا یہ داستان پھر دہرائی جائے گی؟ اور کہانی ایک دائرہ میں گھوم کر اسی نقطہ پر آ جائے گی؟ بچی کا زندہ رہنا بھی گویا (IRONY OF FATE) ہے۔

اور پھر اس اختتام سے ایک تضاد کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ آفاقیت (UNVERSAL) اور انفرادیت (PARTIEULAR) کا تضاد، ———

ازلی مرد اور ازلی عورت دو روحوں کا ملاپ، وجود کی تکمیل، پہلا بنیادی گناہ اور اس گناہ کا کفارہ ...... اور پھر اختتام پر اچانک یہ احساس کہ یہ محض ایک عام واقعہ تھا، ان بیسیوں وارداتوں میں سے ایک جو آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ کائناتی وسعت اور گیرائی سمٹ کر ایک خصوصی نقطہ پر آ جاتی ہے۔

اور حقیقت کے دو پہلوؤں، حقیقت کی دو سطحوں کا تضاد!..

ایک خارجی، واقعاتی، سطحی حقیقت جو اخبار کی چند سطروں میں سمو دی گئی ہے . . . . "ایک نوزائیدہ بچی سردی سے ٹھٹھرتے سڑک کے کنارے پائی گئی، کسی سنگ دل نے بچی کی گردن کو کپڑے میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا اور نازک جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مر جائے۔"

اور سنگدل کے لفظ پر ہم چونکتے ہیں۔

سنگدل کون تھا؟

وہ ماں جس نے اپنی رگوں میں سرایت کرتی ہوئی ماتا کا خون کر کے بچی کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا؟

یا وہ مرد (بچی کا باپ) جو عورت سے سب کچھ حاصل کرنے کے بعد اسے دھوکا دے کر اور اس نازک حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تھا؟

یا وہ سماج جس کے خوف نے عورت کو یہ غیر فطری حرکت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ سماج جو عورت کے سب سے اہم پہلو ماں کا بھی گلا گھونٹ دیتی ہے؟

ایک خارجی، واقعاتی حقیقت جو صرف یہ بتاتی ہے کہ ایک عورت نے گناہ کیا تھا اور اپنی نوزائیدہ کو مارنے کی کوشش کی تھی۔

اور دوسری گہری باطنی حقیقت جو سارے افسانے میں عورت کی ذہنی کیفیات اور محسوسات کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ عورت کی مضطرب ذہنی کیفیتوں، جذباتی ہلچل (DISTURBEP EMOTIONS) کے ذریعہ جب وہ ماں بن رہی ہوتی ہے۔

یکے بعد دیگرے وہ ساری کیفیات ——— جب عورت نے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح مرد کے حوالے کر دی تھی اور محسوس کیا تھا کہ دو روحیں سمٹ کر ایک ہو گئی ہیں، اس نے وجود کی تکمیل کی ہے، اور اس کی اپنی تکمیل اب ہوتی ہے جب وہ ماں بننے والی ہے۔

عورت کے ماں بننے کی کیفیت جب وہ ایک بلند و برتر اور مقدس ہستی بن جاتی ہے، جب ماتا کا گرم گرم خون اس کی رگوں میں بہتا ہے اور اس کے سینے کی دودھ بھری گولائیوں میں مسجد کے پاکیزہ میناروں کی تقدیس اور طہارت آ جاتی ہے۔

پھر وہ اذیت ناک احساس ——— نہیں یہ تقدیس اور طہارت کچھ بھی نہیں . . . . . وہ تو دنیا کی نگاہوں کے سامنے ایک چوراہے پر کھڑی ہے۔ اس کے سینے پر گناہ کی علامت ایک سرخ نشان دہک رہا ہے۔ انگلیاں اس کی طرف اٹھ رہی ہیں، یہ سب لوگ اسے سنگسار کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں مگر اس پر پہلا پتھر اٹھانے کا ان میں سے کوئی بھی مجاز نہیں۔

اور پھر وہ ہلچل، وہ جذباتی طوفان، وہ کرب و اضطراب، وہ کشمکش اذیت

وہ کش مکش، اور مجبوری اور بے بسی کی وہ آخری چیخ! مت چھینو، اسے
مت چھینو، میری روح کا یہ ٹکڑا مجھ سے مت چھینو!"

خارجی حقیقت کا پردہ چاک کر کے جب منٹو ہمیں یہ باطنی حقیقت دکھاتا ہے تو وہاں صرف ایک روح نظر آتی ہے۔

ایک عورت اور ایک ماں کی زخمی پھڑپھڑاتی ہوئی روح!

ممتاز شیریں

منٹو کا فن

منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دور بین و دور رس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے ملعون کیا گیا ہے اور اس داد و تحسین اور ہجو و تضحیک میں لوگوں کا جذبہ رو بہ رہا ہے اس میں حق پسندی اور توازن بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط و تفریط کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے۔ منٹو ایک مثالی ہیرو بھی نظر آتا ہے اور مثالی ویلن بھی۔ کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اُسے بس حُسن کا مجسمہ سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں برائیوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔ دنیا کی ہر دوسری چیز کی طرح منٹو "نہ محض اچھا ہے اور نہ محض بُرا"۔ اس کے افسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محض برائیوں کے حامل۔ اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دور رس اور دور بین نظر، اس کی جرأت آمیز حق گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فقرہ بازی کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہیں —— کبھی بہت اچھے اور کبھی بہت بُرے۔

ان اچھے، بُرے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے —— کلرک، مزدور، طوائف، رند خرابات اور زاہد پاکباز، کشمیر، بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چائے خانے، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی اُلجھنیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گوناگوں مظاہر منٹو کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں۔ بعض کوچوں میں پہنچ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی۔ بعض افراد کا ذکر وہ جس ادائے خاص سے کرتا ہے وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض رموز آشکار کرنے میں جو مزا آتا ہے وہ دوسری باتیں کہتے اور کرتے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا لیکن ذکر کسی کوچے کا ہو، کسی شخص کا ہو اور کسی بات کا ہو یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ منٹو اس کوچے کے سارے پیچ و خم، اس شخص کے دل کے سارے بھید اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں —— جہاں تک ان گوناگوں موضوعات کا تعلق ہے ان کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے، بہت سوں کی بُرائی مول

لی ہے اور بہت سوں کی گالیاں سُنی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں نے انھیں گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر دبی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لیے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے۔ اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جن کا منٹو نے پوری ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطہ نظر کی بھی اہمیت ہے جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے، لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا، جس چیز نے اُسے وہ بڑائی دی جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں، وہ اس کا فن ہے۔ اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ لکھا جائے اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے اور اس کے اظہار کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا حدیں ہیں، شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطۂ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا کیا مفہوم ہوتا ہے ——— اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منطقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے تکنیک کے وہ مبادیات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار، ڈرامیٹسٹ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈراما یا افسانہ لکھتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ ایک خاص صنفِ ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے اس کے خلوص اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انھیں پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک، اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جاننا، سمجھنا اور ان کا صدقِ دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔ اس لیے کسی فن کار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو، ان اصول و قوانین کو، اس کی روایت کو کس حد تک جانا سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کار نے فن کی روایات کی پابندی کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کیے ہیں۔ ان مختلف وسائل کے استعمال میں فن کار کے تخیل، فکر اور ذہنی کاوش اور انہماک و توجہ کو خاصا دخل ہوتا ہے۔ اس لیے جو فن کار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے اسی حد تک اس کی توجہ، انہماک اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار اور ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آجاتے ہیں۔ اظہار اور ابلاغ کی یہی منزل ہے، جہاں مصنف کا تخیل اور فکر جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزا اور عناصر ہیں اظہار و ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ یہی رنگ مصنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا مظہر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جزو سمجھا

جاتا ہے جس میں فنی روایات اور اظہار و ابلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

فنی جائزہ لیتے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فن کار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیش نظر نہ رکھی جائیں تو یہ فنی جائزہ ادھورا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے ان پہلوؤں کا انوکھا پن اور اس رنگ کی شوخی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے اعصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس انہماک اور کاوش کے اہل نہیں رہتے جس سے اظہار کے وسائل کو نیا پن اور بلندی ملتی ہے اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے تو فن کا رنگ بھی پھیکا ہونے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ان حقائق کو پیشِ نظر رکھے بغیر فن کار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں انحطاط پیدا ہونا لازمی ہے لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوب اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جو اس کے فن کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ظاہر ہونے کے بجائے صرف کبھی کبھی اُبھرتے اور اندھیرے میں چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

منٹو کے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

افسانہ، ناول، ڈراما، داستان، کہانی ——— ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ، اس قصّے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقعہ کی ابتدائی اور اس خاتمہ تک اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص اندازِ فکر و نظر، یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں، اس کہانی میں بھی جو بڑی بوڑھیاں رات کی خاموشی میں بچوں کو سناتی ہیں۔ اس افسانے، ناول اور ڈرامہ میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ لیکن ان کئی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک نہ ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔ داستان میں تخیل اور تصوّر کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کش مکش، ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی اکائی یہ امتیازی اور انفرادی خصوصیت ہیں۔ افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے ——— ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو۔ عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غفلت برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ [illegible] نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔ اُردو کے افسانہ نگاروں

میں پریم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیش نظر رکھا ہے لیکن کبھی کبھی جذبات کی رَو میں بہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پوری فنی زندگی میں کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ انھیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں ——— یعنی منٹو کا ہمہ گیر مشاہدہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے۔ واقعہ اور کردار کے ذکر میں منٹو بہت کم اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کیے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں۔ لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فروعی اور جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحول یا کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری کا مقصد نہیں بناتے۔ یہ سارا علم گویا ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر، جذبہ، ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ مثلاً ان کے افسانے "نیا قانون"، "خوشیا"، "نعرہ" اور "نیا سال" پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے تخیل، فکر اور تجزیۂ حیات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔ افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی اَن گنت تصویریں اس کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں اور ان سے حسب موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے، لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے مصورانہ قلم کے بنائے ہوئے یہ بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں ——— یہ چیز "نیا قانون"، "خوشیا"، "نعرہ" اور "نیا سال" کے مرکزی کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور نفسیاتی رنگارنگی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس جذباتی کیفیت کے ترجمان ہیں جس میں ایک خاص فرد مبتلا ہے۔ "منتر" اور "میرا اور اس کا انتقام" اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں۔ ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منفرد خصوصیات کا عکس ہے۔ لیکن افسانہ پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے نمایاں اثر قبول کرتا ہے وہ صرف ایک واقعہ ہے ——— ایک صورت میں واقعہ کی ہلکی پھلکی ہنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاج کا ایک ملا جلا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔ اسی طرح "ہتک" ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بسنے والے گوناگوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر ہتک کی ہیروئن "سوگندھی" کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔ وہ ساری فضا جو افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضا کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے مل جل کر سوگندھی کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت

کچھ ہونے کے باوجود سوگندھی ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم سوگندھی کے علاوہ باقی سب چیزوں کو باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر غالب آ کر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ صرف سوگندھی کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہمارا راز ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گذری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی۔ لیکن ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اُسے کہانی کے ذریعہ صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتارنی اور جاگزیں کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم کرنے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگر پوری فنکاری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعہ قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے۔ اپنے افسانہ کا ایک ڈھانچا بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح ختم ہوگا۔ اچھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرف یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکے تو پڑھنے والے کے ذہن کو تاثرات کے انتشار میں مبتلا نہ کر دے۔ دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔ فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کا نقطۂ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں، جنھیں ہم افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطۂ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم جما کر ہمواری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں جو افسانہ کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کبھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں برتتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ منٹو نے ایک دیانت دار اور مخلص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی میں جانی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔ منٹو نے اچھے اور بُرے جتنے افسانے بھی لکھے ہیں ان کے موضوع

اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو لیکن افسانہ کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف موقعوں پر مختلف کام لیے ہیں، لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا ہو قاری کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ منٹو کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگائیے کہ تمہید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے اسے کن کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

نیا قانون اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔"

اسی طرح "بلاؤز" کی تمہید یہ ہے:۔

"کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔"

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے۔ لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی اور اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے۔

دو تمہیدیں اور دیکھیے:

"گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے، لڑکیوں، بچے، بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بلبلا رہے ہیں، تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لیے بے سُری تانیں اُڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی بس گائے جا رہی ہیں، نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا کیوں نہ ہو ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے"

"میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دُور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے

اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا،
دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا اور حدِ نظر تک پھیلے ہوتے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دُور بہت دُور،
جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھیں
اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا گہرے رنگ کا قالین ہے جسے اِدھر سے اُدھر سمیٹا جا رہا ہے۔"

پہلی تمہید "شو شو" کی ہے اور دوسری "بانجھ" کی۔ دونوں تمہیدوں میں افسانہ نگار نے آنے والے واقعات کے لیے ایک فضا تیار کی ہے اور اس فضا میں دونوں موقعوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا او جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے پڑھتا ہے۔

"پھاہا" کی تمہید صرف ایک جملہ ہے۔ لیکن اس جملے سے افسانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔"

گوپال کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے اوسان بھی تھوڑے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا —— یہی افسانہ نگار کی جیت ہے۔ اس نے ایک معمولی سی خبر سنا کر قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی تمہید دیکھیے:

"ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر
گھوما جائے اور ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو بوتل اور وسکی کے پیدا کردہ تکدر کو دُور کر سکے۔"

یہ تمہید "پہچان" کی ہے۔ اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے، نہ کوئی فضا یا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے۔ بلکہ بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ، اگر تم بھی ان شرابیوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آجاؤ —— اور معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے۔

اور سنیے:

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

"نعرہ" کی تمہید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کیشو لال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی کہے گا کہ افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ کیشو لال کے اس شدید احساس کے پیچھے کیا واقعہ کام کر رہا ہے۔ اس کے دل میں یہ جاننے کی خلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھیے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

"دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی

> کا دارو غہ صفائی، جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر، شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا ——— وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا، مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔"

یہ تمہید "ہتک" کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں، ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں، اس لیے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھمسان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سیدھے سادے انداز میں کہنے کے بجائے ذرا تیکھے تیور کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان تیکھے تیوروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تھک ہار کر سو جانے والی اور اپنی بیوی کا محبوب دارو غہ صفائی آگے چل کر کیا گل کھلاتے ہیں، افسانہ کے منجدھار میں کود پڑتا ہے۔

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ انہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تمہید ہے، جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے، کردار کو متعارف کرنے کا، ایک خاص فضا یا ماحول بنانے کا، ایک پھڑکتی ہوئی خبر سنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مصوری کرنے کا، آنے والے واقعات کے لیے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی بہ یک وقت کئی ملے جلے مقصد پورے کرنے کا، لیکن ان گوناگوں کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افسانہ کی ہر تمہید نے اپنے ذمے لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کرکے، اس کے دل میں گدگدی پیدا کرکے یا اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کرکے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔ منٹو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لیے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعہ پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جماتا اور اسے افسانہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کرتا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں ہیں جن میں طرح طرح کی صعوبتیں مسافر کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے کانٹے ہیں جو اس کے تلووں میں چبھنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے والا ان صعوبتوں کو آسان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے افسانہ نگار کی رہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر افسانہ نگار کی رہنمائی اسے اس منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے، جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کٹھن منزلیں طے کرنے اور چبھنے والے کانٹوں کی خلش کو گوارا اور آسان بنا لینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے سکون و راحت کا سرمایہ بہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لیے قابلِ قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی ذرا سی سستی، ذرا سی تن آسانی، ذرا سی سہل انگاری اور بالکل معمولی سی غفلت اور تھکن اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتی ہے ——— منٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں

کو پوری طرح محسوس کر کے عموماً اپنا فنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس لیے اس "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ بلکہ منٹو کے بعض افسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی اس خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا افسانہ "نیا قانون" اس طرح ختم ہوتا ہے:

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے — راستے میں اور تھانے کے اندر وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا، مگر کسی نے نہ سنی۔

"نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو — قانون وہی ہے پرانا!"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"پھاہا" کا انجام یہ ہے:

نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹ لینے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا ابھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹکی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بلبلا اٹکا ہوا ہے۔

نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اس ننھے سے ابھار پر جما دیا۔

"شہ نشین پر" کے آخری الفاظ یہ ہیں:

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا "مجھے زندہ رہنا ہو گا۔"

اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

"ہتک" کی ہیروئن سوگندھی ہم سے اس طرح رخصت ہوتی ہے:

"بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

"...... اس کے حلق سے ایک نعرہ ...... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا ——— ہت تیری ......!

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر او نگھ رہے تھے، ڈر گئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اُس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ ہوٹل کی عمارت اڑا اڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سُن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سُن کر ڈر گئی تھی، کہا۔ "پگلا ہے!"

(نعرہ)

"...... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ مگر فوراً ہی سب معاملہ صاف ہو گیا ——— سیوا جی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپا مار گئے تھے۔" (میرا اور اس کا انتقام)

"اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سُوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں ——— یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر لٹکا رہے گا۔"

(نامکمل تحریر)

"جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا "ڈاکٹر صاحب! اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔" میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگو کی یادگار!

اُن کو نکالنا نہیں، یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔" میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔" (بیگو)

"وہ گھبرا کر اُٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا ——— سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے ......" (سجدہ)

منٹو کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے والے کو اپنے ذہنی انتشار کے مجتمع کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے

جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہا تھا، دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہو کر برابر زیادہ منظم بنتا رہا تھا، افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منٹو نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انھیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

"نیا قانون" کے خاتمہ میں استاد منگو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد ردِ عمل ہے جس سے پڑھنے والے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ "بچا ہا" کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا سیدھا سادہ اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔ "شہ نشین پر" کا انجام جذباتی کھنچاؤ کشمکش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فن کارانہ حل کی تصویر ہے۔ "ہتک" کے انجام میں افسانے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید ردِ عمل اور زندگی کے ایک بڑے دُکھتے ہوئے ناسور کو بظاہر ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سوگندھی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم نوا ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سوگندھی کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ "نعرہ" کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشو لال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فضا کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی ٹریجڈی کو تلخ تر بنا دیتی ہے جذباتی شدت اور فضا کی تلخی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا منٹو کے افسانوں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ "بیگو" کا انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو اپنے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گذار دیتے ہیں جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ یہ معمولی سی غیر اہم بات گذرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ "میرا اور اس کا انتقام" میں آخری جملے میں چھپی ہوئی ہلکی سی ایمائیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور صریح نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ "نامکمل تحریر" میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے رومانی واقعہ کو ایک ناقابلِ فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔ "سجدہ" کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاتموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات

محسوس کرتا ہے کہ فن کے نقطۂ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی تاثر کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اس مسّرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرتِ بیان اور اس کے اندازِ فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ کبھی محض سادگیٔ بیان سے، کبھی تضاد سے، کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شوخی سے، کبھی طنز سے، اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانہ کے خاتمہ کا یہ انداز پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے خاتمہ کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، نطفت اور شوخی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ افسانہ اتار چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے ——— بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ تھکن کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی۔ اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم عنان و ہم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام ——— ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی غفلت یا بے نیازی برتے تو افسانہ کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ منٹو کو فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لیے کہ ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن وہ اس سے متاثر اور مسرور ضرور ہوتا ہے۔ افسانہ شروع ہو کر بڑی دھیمی لیکن نپی تلی چال سے۔ بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس دھیمی اور نپی تلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسّرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے کہ اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے ——— ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آجاتی۔ اس میں لکھنے والے کو پورے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ کوئی کڑی اگر ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھٹکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کے لیے اس ربط میں ایک خوش گوار جھنکار کا جو تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ہمارے کم افسانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھنکار کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنھوں نے دی ہے انھوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔ منٹو کے فن کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کو کبھی نہ بھلاتے ہوئے ہمیشہ ہر افسانہ کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور اتار چڑھاؤ کو فنی ذمہ داری کے ساتھ برتا ہے۔ منٹو کے نزدیک فن کے ان مراحل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ منٹو کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجیے۔

"نیا قانون" کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سُن کر خوشی سے پھُولا نہیں سماتا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہو جانے ہو جانے کے بعد بھی اُسے ایک گورے سے لڑنے کے جُرم میں حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس آغاز اور انجام کے درمیانی حصّوں کو اس طرح پُر کرنا کہ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لیے حد درجہ کرب انگیز بن جائے، منٹو کے فنّی احساس اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب و تنظیم کا مظہر ہے۔ نیا قانون نافذ ہونے کی خبر سُن کر منگو خاں کو جو خوشی ہوئی تھی اس کے لیے نئے قانون کے نافذ ہونے کی تاریخ تک منٹو نے کئی ایسے موقعے پیدا کیے جن پر منگو خاں کی حالت دیکھ کر قاری برابر یہ اندازہ لگاتا رہتا ہے کہ اس کی مسّرت آہستہ آہستہ وارفتگی و دیوانگی کا درجہ اختیار کر رہی ہے اور بالآخر جب وہ روزِ سعید آ پہنچتا ہے تو اس کی مسّرت وارفتگی اور دیوانگی، شوقِ آزادی کو مجسّم دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگتی ہے اور عین اُس وقت جب اس وارفتگیٔ شوق کو بظاہر اپنی تحصیل کا موقع مل جاتا ہے، اسے حوالات میں داخل ہونا پڑتا ہے —— اور اس طرح منگو خاں نے جذبات و احساسات کے جو متعدد نازک مرحلے طے کیے تھے ان کا یہ غیر متوقع انجام دیکھ کر وہ تو غرقِ استعجاب ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک ایسی ٹریجڈی کا نقش مرتسم ہو جاتا ہے جو اپنی انتہائی سادگی کے باوجود حد درجہ تڑپا دینے والی ہے۔

"نیا قانون" منٹو کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے اس لیے اس میں آغاز اور انجام کے درمیان واقعات کا یہ فنّی اتار چڑھاؤ، یہ نازک اُونچ نیچ، اور ایک شدید قسم کا نقطۂ عروج شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طرف مائل کرے کہ منٹو اس طرح کے مرحلے صرف ایسے افسانوں میں طے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔ حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منٹو کے نقطۂ نظر سے اپنے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں امتیاز برتنے کا قائل نہیں۔ فن کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں یکساں توجّہ اور انہماک کے ساتھ پورے ہونے چاہئیں۔ اس اندازے کے لیے منٹو کی چند اور کہانیوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالیے۔

"منتر" اور "میرا اور اس کا انتقام" موضوع کے اعتبار سے وہ بالکل سیدھی سادی اور غیر اہم سی کہانیاں ہیں جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ پڑھنے والا انھیں پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ اُس نے ایک ہلکی پھلکی تفریحی چیز پڑھی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا مجموعی تاثر کسی طرح کے قاری پر بھی اس تفریحی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن منٹو نے ان دونوں کی ترتیب میں بھی پورے فنّی انہماک سے کام لیا ہے۔ دونوں افسانوں کا آغاز، دونوں کا انجام اور دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی منزلیں سب پورے فنّی رکھ رکھاؤ کے ساتھ طے ہوئی ہیں۔

"پھاہا" "بلاؤز" اور "کالی شلوار" ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جنھیں منٹو کے محبوب موضوع کہا جا سکتا ہے اور جن محبوب موضوعات کے قریبی تعلق نے منٹو کو اُردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار بنایا۔ "پھاہا" اور "بلاؤز" میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ان بھولے بھالے اور معصوم جنسی احساسات کی مصوری ہے جو شباب کی صبر آزما اور کٹھن منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں ابھرتے اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو بڑے سیدھے سادے انداز میں شروع کرنے اور اسی سیدھے

سادے انداز میں ختم کرنے کے علاوہ آغاز اور انجام کو گہری معنویت دینے کے لیے افسانہ نگار نے بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات کو جوڑ کر ایسی فضا تیار کی ہے جو پوری توجہ اور پورے انہماک کے بغیر ظہور میں نہیں آسکتی۔ افسانہ نگار کے اسی فنی انہماک اور غور و فکر نے دو سیدھے سادے افسانوں کو ایک علمی حیثیت دے دی ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ افسانے نفسیاتی نقطۂ نظر سے دو اہم مطالعے ہونے کے باوجود فن کے ان حدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کہانی کہانی نہیں رہتی۔

یہی صورت "کالی شلوار" کے ساتھ ہے۔ کالی شلوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول ہیں واقعات میں ایسا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ در پیچ مراحل سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے، جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ کالی شلوار طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لیے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کہانی کے مختلف ٹکڑوں میں یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں شیر و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں منٹو کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانہ میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں) موجود نظر آئے گی۔ منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعہ بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

(۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو وہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مجموعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا اتار چڑھاؤ، ان واقعات کے پیچ اور الجھاؤ، اس اتار چڑھاؤ، پیچ اور الجھاؤ کے بعد افسانہ کا نقطۂ عروج اور اس کا خاتمہ۔ ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے، اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے دو سب سے اہم چیزیں ہیں۔ منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزا و عناصر کو جو اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منٹو ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لیے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے یقینی وسائل ہیں۔ گویا فن کار کا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لیے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یہ ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد یہاں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں "تاثر انگیزی" کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لیے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے برتنے اور استعمال کیے ہیں جنھیں ہم اس کے اسلوبِ نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے لیکن ان سے بھی خاص حیثیت اظہار اور ابلاغ کے ان طریقوں کو حاصل ہے جنھیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا اندازہ کیا ہو۔ اس کے لیے کسی خاص محل پر سیدھے سادے فقرے، اشارے، کنائے، تشبیہہ، استعارے، تضاد یا تکرار میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور انھیں صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لیے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔ لفظوں، فقروں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور منفرد انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطۂ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔ فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی، لفظوں کے برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی اور بہت اہم اور بڑی گہری بات کو اس طرح ادا کر دینے کی قدرت کہ جیسے وہ بات نہ اہم ہے نہ عمیق۔ منٹو کے اندازِ اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔

بعض ٹکڑے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کیجیے۔

(۱) سب سے پہلی مثال 'نیا قانون' کی ہے۔ استاد منگو نئے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لیے بے قرار ہے۔ اتنے میں نتھو گنجا اڈے پر آتا ہے۔ منگو بلند آواز سے اس سے کہتا ہے:

"ہاتھ اِدھر لا، ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے —— تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

(۲) 'پہچان' میں بازارِ حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے —— "یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکتی رہتی ہیں —— آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں۔"

(۳) 'پہچان' ہی میں ایک لڑکی کا ذکر یوں آیا ہے —— "مروڑیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔"

(۴) 'پہچان' میں ایک اور بازاری عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں "وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار دوکاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پوری تول نہیں تولے گی۔"

(۵) "شوشو" میں ایک جگہ کہا گیا ہے ——— شوشو..... شوشو...... ارے یہ کیا؟ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپرمنٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔

(۶) "شوشو" ہی میں سونے سے پہلے کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے "میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔"

(۷) "خوشیا" میں کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔"

(۸) "آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں بانجھ ہیں۔" (بانجھ)

(۹) "..... محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے۔" (بانجھ)

(۱۰) "اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرّے کو بم بنا لیا تھا کہ وقت پر کام آئے۔" (نعرہ)

(۱۱) "جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر اڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔" (بلاؤز)

(۱۲) "نتھو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چیخنے لگی ہیں۔" (اس کا پتی)

(۱۳) "کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو ——— اوپر ہوا نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا بس ہوا ہی ہوا ہے۔ اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔" (ہتک)

(۱۴) "فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔" (دھواں)

(۱۵) "میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی ——— میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اُلجھے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔"

(۱۶) "اُسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس۔ دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔" (نیا سال)

(۱۷) "محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لے کر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں۔" (قبض)

(۱۸) زندگی کیا ہے؟ ——— میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے، ٹوٹ جائے گا۔ (مصری کی ڈلی)

منٹو کے افسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے انداز بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثال نمبرا میں منگو نے جب یہ بات کہی کہ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی۔ لیکن یہ بظاہر معمولی معلوم ہونے والی بات منگو کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منٹو نے منگو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور گنجے نتھو کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا

جملہ لکھا جو منگو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لیے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سنجیدہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنا نا منٹو کے جدّت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال نمبر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہہ آتی ہے، اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے نئے پن کا احساس تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا۔ لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ "آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں"۔ تو پوری تشبیہہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ جملہ جو خیال یا بیان کے اعتبار سے بالکل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے، بازاری عورت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں مشاہدہ کی جو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرزِ فکر کی ایک خصوصیت ہے۔ لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ مروڑیاں نیچے گر رہی تھیں اس کے لیے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لیے اکثر لکھنے والوں کو بحرِ فکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے گوہر آبدار نکالنے کی فکر ہوتی۔ لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبہ کے اظہار کے لیے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دینا کہ جملے کی ظاہری حیثیت تو سادہ و حقیر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کئی گنا زیادہ ہو جائے منٹو کی قدرتِ بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ——— ادنیٰ اس لیے کہ یہ کرشمہ کبھی کبھی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت مثال نمبر ۴ کی ہے جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک قابلِ نفرین ہے ——— لیکن نفرت اگر ایسے لفظوں کے ذریعہ ظاہر کی جاتے جو بدیہی طور پر جذبۂ نفرت کے مظہر ہوں تو بیان میں عمومیت آ جاتی۔ منٹو نے اپنے انداز کو ہمیشہ عمومیت سے بچایا اور سادگیٔ بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثال نمبر ۵ تاثر انگیزی کی خصوصیت کے لحاظ سے اوپر کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پیپرمنٹ کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لیے بھی شوشو کے نام میں وہی لذت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پوری طرح آشنا ہے۔

چھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے اندازِ بیان کی ندرت اور قدرتِ کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور نازک اور لطیف جذبہ مجسم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آ جاتا ہے۔ ایک غیر مرئی اور غیر مادی حس ایک ٹھوس اور مرئی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کیے ہیں۔ 'بانجھ' اور 'اسقاط' کا ایک واضح لغوی مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے اس لیے جب منٹو محبت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہو سکتی ہے یا اس کا اسقاط ہو سکتا ہے تو ہمارا ذہن

اس کا جو فوری اثر قبول کرتا ہے اس میں اُلجھن اور تکدر کی ایک ملی جلی کیفیت ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ نئے سیاق و سباق میں ان لفظوں کے مفہوم پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ منٹو نے ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے اظہار کے لیے دو ایسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور فکر کا بوجھ اُٹھانے کے اہل نہیں تھے۔ لیکن منٹو کی چابکدستی کی بدولت ان دونوں معمولی اور حقیر لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انھوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار بڑی کامیابی سے کر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے اہل نہیں تھے، بلکہ پڑھنے والے کے لیے سوچ بچار کے دروازے بھی کھول دیے۔ منٹو کے اسلوب کی جدت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے ——— یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔

دسویں سے لے کر پندرھویں مثال تک ہر جملہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوبِ نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ جملوں سے، کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے محل معلوم ہوتیں جہاں منٹو نے انھیں کامیابی سے برتا ہے اور کبھی بہت سی ملی جلی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل اثر قبول کر لیتا ہے ——— دل کی بات ایک زندہ اور مرئی حقیقت بن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ دیکھو میں یہ ہوں۔ مجھے اچھی طرح پہچان لو اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لیے ناقابلِ فراموش بن جاتی ہے۔

سولھویں مثال میں منٹو کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر سنا کر فوراً ایک دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ مخصوص کیفیت جس کا بیان مقصود ہے آئینہ کی طرح روشن اور سورج کی طرح تاباں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

سترھویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے ہمیں ایک خبر یہ کہہ کر سنائی کہ محبت ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لیے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور طنز کی ایک بات معلوم ہونے کے باوجود اس قدر منطقی ہے کہ کوئی سننے والا اسے جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ منٹو کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں۔ یہاں بھی سادگی بیان اور اہم ترین بات کو حد درجہ معمولی سمجھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت برابر کار فرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منٹو کے فکر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور امتزاج سے جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادی عبارت اور معمولی سی تشبیہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرنے کا بہترین اور موثر ترین انداز وہ ہے جسے منٹو نے اپنایا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے، ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں

کی نظر میں بالکل حقیر اور بے حیثیت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور مؤثر سے مؤثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عمومیت کو تصور آفریں، فکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کر دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لیے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں آورد نام کو نہیں، ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی مظہر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر یہی بے تکلفی اور بے ساختگی چھائی ہوتی ہے۔ اس کا پرتو ہمیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے ترکشِ فن کے بڑے صید افگن تیر ہیں ——— ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگائیے کہ منٹو کا ہمہ رنگ اور ہمہ صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

استاد منگو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ دیکھیے وہ کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے:

"ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر
سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو" (نیا قانون)

منٹو کے دل میں (یا منٹو کے کسی کردار کے دل میں) کسی چیز، کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ، فقروں اور جملوں کی کمی نہیں، اسی طرح ان کا ذہن تازہ مشکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کرنے پر قادر ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے ——— اور اکثر بالکل معمولی معمولی تشبیہوں سے ——— وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جیتا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اتار دیتے ہیں۔ وہ جذباتی طور پر پوری طرح اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے ——— استاد منگو کی زبان سے مارواڑیوں کو غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل کہلوانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کہنے میں کہ "نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا" منٹو کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب استاد منگو کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ بہ یک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں کی گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے برمحل صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مرئی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں یوں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں لیکن منٹو کا دوررس تصور ہمیشہ دو چیزوں میں موزوں ترین مشابہت تلاش کر کے اُسے بڑی برجستگی سے صرف کرتا ہے اور ایک معمولی اور بظاہر بے حقیقت سی

تشبیہ ایک مکمل مفہوم کی حامل اور ایک گہرے تجربہ کی عکاس بن جاتی ہے۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں جیسی اور بہت سی سیدھی سادی لیکن اپنے تاثر کے لحاظ سے اہم تشبیہیں منٹو کے ہر افسانہ میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

"وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے۔" (پہچان)

"اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے۔" (شوشو)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کانتا برہنہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور اپنی اس حرکت کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا کہ "کیا ہرج ہے، اپنا خوشیا ہی تو ہے۔ یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے رُوپ بھر کر اُسے ستاتی اور پریشان کرتی ہے۔ ان بے شمار رُوپوں میں سے ایک یہ ہے:

"خوشیا نہ ہوا، سالا وہ بِلّا ہو گیا جو اُس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے۔" (خوشیا)

'بانجھ' میں ایک منظر کا تصور منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:

"کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے ہوں کی ہے (بانجھ)

یہ تشبیہ بھی غیر معمولی نہ سہی لیکن اس تک منٹو کے سوا کسی اور کے ذہن کی نارسائی اسے غیر معمولی بھی بنا دیتی ہے اور منٹو کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

"گالی ——— یوں سمجھیے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اُتر گیا۔" (نعرہ)

"بار بار یہ دو گالیاں، جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں، اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھِڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں۔" (نعرہ)

"دو گالیاں، جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر پھینک دیے ہیں۔" (نعرہ)

"دو گالیاں ——— اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے۔" (نعرہ)

ایک گالی یا دو گالیاں ——— میرے اور آپ کے لیے دو سُنی سنائی بے حقیقت باتیں ہیں جنھیں آدمی صبح سے

شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلتے سنتا تھا، لیکن کیشولال کے دل پران گالیوں نے جو اثر کیا ہے اس کی شدت اور ترتیب کو منٹو ان گنت تشبیہوں کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہیں۔ اوپر کی چاروں تشبیہوں میں کوئی نیا پن نہیں، لیکن ان فرسودہ تشبیہوں سے منٹو نے بار بار جو کام لیا ہے اس سے عمومیت میں خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔ سطحیت میں گہرائی آتی ہے۔ منٹو نے ایک ہی تشبیہہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچنے اور فضا قائم کرنے کی جو خدمت کی اس کی چند اور تصویریں دیکھیے۔ پہلی دو سطریں دھواں کی ہیں:

"موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔"

(دھواں)

"ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم مخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔" (دھواں)

"وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے۔" (مصری کی ڈلی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے گوشوں میں سے نکال کر منظرِ عام پر لاتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتا ہے:

"یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے۔ پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کا شربت پی رہا ہے۔" (سجدہ)

"اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا گیا ہو۔" (سجدہ)

وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے۔" (سجدہ)

"اس کی شرارت اب دم کٹی گلہری بن کر رہ گئی تھی۔" (سجدہ)

"نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا — جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مدمقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔" (نیا سال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے کر اسے ایک ایسی تصویر بنانے میں

مدد دیتی ہیں جس کا ہر رنگ تیکھا اور ہر نقش واضح ہے۔ منٹو کی تشبیہوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی تڑپ و تیزی سے خالی نہیں۔ ہر تشبیہ کے پیچھے ایک مکمل اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جیسے منٹو کی فنی چابک دستی اس طرح برمحل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا تاثر قبول کرتا ہے اور وہی ذہنی اور جذباتی نتائج اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہیں۔ منٹو کا اسلوب اظہار جس میں الفاظ، فقروں اور تشبیہوں کو یکساں اہمیت ہے۔ مکمل تاثر کی تخلیق کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی نہ ہوئی ہو۔ اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو بھی دخل ہے ——— اور وہ ہے 'تکرار'

'تکرار' مشرقی اسلوبِ اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم میں برتا گیا ہے۔ لیکن اردو اور فارسی میں عموماً 'تکرار' کو ایک لفظی صنعت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے لکھنے والوں نے عموماً صوتی ترنم اور تاثر انگیزی کا کام لیا ہے۔ گو کبھی کبھی یہ تاثر محض صوتی ترنم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ نثر میں مغربی اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقروں کی تکرار خاصی عام ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی شالیں ملتی ہیں لیکن کسی افسانہ نگار نے اظہار کے وسیلہ کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا جیسے منٹو نے۔ منٹو کے مشہور افسانوں میں 'خوشیا'، 'نعرہ'، 'بلاوز'، 'ہتک'، 'نیا قانون' اور نسبتاً کم معروف افسانوں میں 'اُلّو کا پٹھا' اور 'قمیض' اس فن کے بڑے کامیاب مظہر ہیں۔

دو تین افسانوں پر نظر ڈال کر دیکھیے کہ اس تکرار سے منٹو نے کیا کیا کام لیے ہیں۔

'نعرہ' میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالاخانے سے نیچے اترا تو افسانہ نگار کے لفظوں میں:

"اُسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں"

اس لیے کہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہ کرنے کی سزا میں سیٹھ نے اُسے دو گالیاں دی تھیں اور وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سمائی جا رہی تھیں۔ ان گالیوں سے کیشو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ منٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبانی سُنیے:

..... مالک مکان نے غصے میں آکر اسے گالی دی ——— گالی ..... یوں سمجھیے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچ گیا اس کا کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا......

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریاں پڑے چہرے پر قے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے...

سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی ——— اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اُوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے . . . . .

ایک نہیں دو گالیاں ——— بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں۔ اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے "چاؤں" کیا اور پرے ہٹ گیا، اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے . . . . . . گالی . . . . . . گالی ٹھیک اسی طرح اس سے اُلجھ کر رہ گئی جیسے جھڑ بیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ اس کی رُوح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا ——— دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو ——— پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا، جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلے ہوں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔

گالیاں ——— گالیاں ——— کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے۔

اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گندھ گئے ——— دو مہینے کا کرایہ، اس کا پتھر کی بلڈنگ میں دو بت

لے کر جانا ــــ سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدی آواز، اس کے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور ..... یہ موٹی گالی ..... پھر دوسری ..... اور اس کی خاموشی ..... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑتڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جائیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔

نعرہ میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے منٹو نے آہستہ آہستہ کیشو لال کے ذہنی اور جذباتی ہیجان کو واضح کرنے میں مدد لی ہے اور اس تکرار اور بڑھتے ہوئے ہیجان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیشو لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ بن گیا جس سے کیشو لال کے دل کو ضرور تسکین مل گئی لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ "پگلا ہے" ـــ منٹو اپنے فن میں افسانہ کی تمہید، اُس کی اٹھان، اس کے نقطۂ عروج اور اس کے انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خلوص اور انہماک سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں وہ نعرہؔ میں گالیوں کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔ تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے۔ تکرار ہی نے افسانہ کو آہستہ آہستہ اٹھان کی طرف لے جا کر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے اور تکرار ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو قاری کے نقطۂ نظر سے اس کا مقصود ہے

'بلاوز' شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس جنسی بیداری کی کہانی ہے جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منٹو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر تصورات کی تکرار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک دن مومن کو:

"شکیلہ کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آگیا ..... یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔"

مومن کے دل میں اس کے بعد دھندلے خیال پیدا ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹرنک کھول کر اپنے عید کے لیے بنے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو .....

"نوری ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا پھندنا آگیا اور پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔"

اور پھر کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے ساٹن کی چمکیلی کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیے......

> "حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا مسلتا رہا —— لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔"

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آ کر بلاوز کو دیکھتا تو......

> "اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔"

اور بالآخر ایک رات کو:

> "جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے —— ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اس سے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولا بنا ہوا تھا —— پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنے شروع ہوئے —— بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آندھی آ گئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا —— پھندنے کی تلاش میں نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا —— ایک کالی ساٹن کے بلاوز پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے......"

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقا، اس کے منتہا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منٹو نے ایک خاص تصور کی تکرار کو فن کی بنیاد بنایا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے جو مراحل طے کیے ہیں ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے، لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے تصورات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔ فن کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنے لیے یہ امتیاز مخصوص کیا ہے کہ جب کسی خاص محل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس محل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔ نعرہ اور بلاوز کی مثالوں سے منٹو کے فن میں تکرار کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے ہتک، نوشیا، الو کا پٹھا اور قبض جیسے افسانوں میں بھی اجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو نے تکرار کی طرح تضاد کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسانوں میں برتا ہے ——— ہماری سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدروں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشے اور تشویش کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماج کے مختلف طبقوں میں اونچ نیچ اور معاشرتی اور معاشی کشمکش، زندگی کے متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر اور باطن میں بدیہی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔ منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسان کو فریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و مسرت کی بربادی کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوب ادا سے جس میں لفظ، فقرے اور افسانے کے مختلف اجزا مل جُل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں، بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

پہلا اقتباس نعرہ کا ہے جس میں کیشو لال کے جذبات کی مصوری میں تصورات کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی اونچ نیچ کا پیدا کیا ہوا ہے:

"اس کے گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اُوپر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر، پھر اس کے بدن سے چمٹ گئے، جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔"

اسی طبقاتی تضاد کی ایک شکل بلاوز' میں اس طرح دکھائی دیتی ہے:

"..... نوکروں کے متعلق کون غور کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔"

دو کردار ایک ہی صورتِ حال کو اپنے اپنے جذبات اور تصورات کی روشنی میں کس کس رنگ میں دیکھتے ہیں، اس کا اظہار ہتک' میں کئی جگہ مادھو اور سوگندھی کے جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے۔ ان کی کئی تصویروں میں سے ایک یہ ہے:

"ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا، جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔ زور کا قہقہہ لگا کر اس نے 'اونہہ' کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی شکل سے

اس نے ہنس کر اتنا کہا "اچھا کیا —— مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آخری جملہ میں مادھو نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک پُرفریب جھوٹ کی شکل اختیار کی ہے —— اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھیے:

"...... مادھو ڈر گیا۔ وہ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی۔
خبردار —— پڑی رہنے دے وہیں —— تو جا، تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گا۔"

سوگندھی کے اس تلخ طنز بھرے جملے میں کئی تضاد ایک جگہ آ کر جمع ہو گئے ہیں —— ایک تضاد تو وہ ہے جو سوگندھی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیّر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سوگندھی کا ایک ایک لفظ ڈوبا ہوا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس مفہوم سے ظاہر ہے جو گزرے ہوئے واقعات اور موجودہ صورتِ حال میں تصادم بن کر رونما ہوا ہے۔

ہتک کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فن کارانہ تصویر ہے:

"بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتّے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی ۔۔"

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر منٹو کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں یہ تضاد بعض دوسری لفظی اور معنوی صورتوں میں بھی رونما ہوتا ہے کہ ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اب تک جو بہت سی مثالیں پیش کی گئیں، ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ چمکتے دکھائی دیتے ہیں —— مثلاً "نعرہ" کے پورے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کی زندگی کے انداز کا تضاد اور دو آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو متضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح نمایاں ہے اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں منٹو کی کہی ہوئی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے ماسٹر نثار تک ہر انسان نے محبت کی ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے ہے جنھیں ہم تکنیک کے مبادیات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال، اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص محل کی ضرورت کے مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔ ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگار ان مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

——— فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد اندازِ فکر کی بنا پر جزئیات نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے چنانچہ اس خاص نقطۂ نظر سے منٹو کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔ منٹو نے ہمیشہ کسی واقعہ یا تاثرات و نقوش کی وضاحت کے لیے ایسی جزئیات کو زیادہ اہمیت دی ہے جنھیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ منٹو جس طرح بیان و اظہارِ خیال کے معاملہ میں اور اپنے تصورات کی وضاحت کے لیے تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انھوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی پہلو کو اہم اور غیر معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ وہ واقعہ کی ہو یا کردار کی انھیں معمولی رنگوں سے شوخ اور تیکھا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں دیکھیے :

"مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دُکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چُوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا۔ "ہت تیری ایسی کی تیسی"۔

یہ استاد منگو ہیں 'نیا قانون' میں ——— اسی افسانے میں انہی کی دو تصویریں اور ملاحظہ ہوں :

"چھاؤنی پہنچ کر منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سُلگایا اور اگلی نشست کے گدّے پر بیٹھ گیا"۔

گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا: "صاحب بہادر! کہاں جانا مانگتا ہے ؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصّے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔

انہی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہمیں اُستاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملا ہے۔ "بھابا" میں گوپال کے پتاجی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے :

"اس کو اپنے پتاجی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی ...... اس کے پتاجی لالہ پرشوتم داس تھالے دار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چُوس رہے تھے"۔

"پہچان" میں کچھ شب زندہ داروں نے جن کمروں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے:

"کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی، تکیہ بھی پڑا تھا جس پر سرخ رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کارنس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک کالی گرگابی رکھی تھی۔"

"کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے، لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرتِ استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوسڑے نکل آئے تھے۔ کالر کھلا تھا اور قمیص بس ایک اور دُھلائی کی مار تھی۔" (بانجھ)

"باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی"

(بلاؤز)

"وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی بانہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا، جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔" (ہتک)

یہ منٹو کی جزئیات نگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو نے کسی واقعہ کی مصوری کرنے، کسی ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بنانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ منٹو فن کار تھا اور فن کار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی ——— دوسروں کو معمولی اور حقیر نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں، بشرطیکہ فن کار انھیں صحیح انداز سے اور برمحل برتنے پر قادر ہو۔ اور یہ قدرت منٹو میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انھیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظروں میں محترم بھی۔ جزئیات کی قدر پہچاننے، انھیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے

منٹو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو، جن میں افسانہ کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوبِ نگارش کی ساری خصوصیتیں شامل ہیں یعنی تشبیہیں، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقروں کی تکرار اور ان کے استعمال میں تضاد کا صرف اس کی شخصیت، مزاج اور اندازِ نظر سے متاثر ہوئے ہیں۔ منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور ان کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے، اسے بغیر جھجک، خوف اور اندیشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے ——— ان سب باتوں میں اس کے شدت پسند مزاج اور توانا شخصیت کا بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق ——— معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے اس کی باریک بین اور نکتہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں، کن سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کن سے انسانی زندگی اس سکون و مسرت سے محروم ہوتی ہے جو فطرت کا مقصود ہے۔ منٹو انسانی زندگی کو اس کے سب اجتماعی اداروں یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں فطرت کے بتلائے ہوئے راستے اور اس کے بنائے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ ناانصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون ناانصافی کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے۔ منٹو نے اس ناانصافی کو مٹانے، اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بہت اہم کام کا بیڑا اٹھانا بجائے خود ایک مہم ہے، لیکن اس سے سخت تر مہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔ منٹو کی مخصوص نظر نے انھیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساس درد نے انھیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں ——— ہر ناانصافی کرنے والا، سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رُخ سے فریب اور طلسم کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو رسوا کرتا ہے۔ اس لیے اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا نڈر، اتنا بے خوف اور جری ہونا چاہیے کہ وہ ہر دشمنی کے مقابلے کے لیے سینہ سپر رہے۔ منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے خوفی، یہ جرأت اور یہ مردانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر وار کو دلیری سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبعی سے جھیل لے۔

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے ——— اچھا بھی اور بُرا بھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی خرابیوں کا تجزیہ کر کے، انھیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے کہ چوٹ کھانے والا تلملا کر رہ جائے

انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور بڑا اس طرح کہ حیاتِ انسانی کے بعض مستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی دزدیدہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوتے ناسوروں کی نمائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا — اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاری سے دنیا والوں کو صرف عریانی سکھائی ہے۔ یوں اس بُرے پہلو کا ایک اچھا پہلو بھی ہے اور اس کی اچھی تاویل یہی کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ یہ سب منٹو کا مزاج تھا۔ اس کی شخصیت تھی اور منٹو فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن میں اپنے آپ کو بُری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں، جنھوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پہلو نمایاں کیے ہیں۔ سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ منٹو نے اپنی زبردست قوتِ ارادی سے ہر طرح کے انتشار، کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کر دینے والے حالات کا مقابلہ بڑی دلیری اور جوانمردی سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے لیے فتح کی راہ نکالی اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں نے بڑے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفان، انتشار اور کشمکشوں کی ٹکر اور ریلے سے اس کے پیروں کو ڈگمگاتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار گزار سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض منزلوں میں اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آمادہ پایا ہے۔ شکست کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر بُرا اثر ڈالا اور جب اُس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لیے کسی آبِ زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشمکش اور خارجی ماحول اور بیرونی زندگی کے اس تصادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آئی ہے اور منٹو کی شخصیت کی عظمت اور بھی نمایاں ہوئی ہے —— لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور پسپا بنانے کا پیش خیمہ بنی ہے۔

منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیاتِ فن کے ہر دور میں کسی نہ کسی طرح جاری رہی ہے لیکن اس کے فن کا آخری دور اس تصادم اور کشمکش کا سخت ترین دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو نے اس دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے تواتر کی جھلک نمایاں ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ منٹو نے مدتوں کچھ نہیں لکھا۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح تواتر اور تسلسل سے لکھے ہوتے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا۔ مثلاً منٹو کے مجموعۂ ٹھنڈا گوشت، کے سب افسانے (سوائے ٹھنڈا گوشت کے) ۲۴ اور ۳۱ جولائی ۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ بادشاہت کا خاتمہ (مجموعہ) کے سب افسانے یکم جون ۵۰ء اور ۱۴ جون ۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح یزید (مجموعہ) کے سب افسانے ۴ اکتوبر اور ۱۵ نومبر ۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔ منٹو کے آخری دور کے بعض اور مجموعے جو زیرِ ترتیب اور زیرِ اشاعت ہیں۔ منٹو کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان افسانوں کو پڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر تین باتیں محسوس کرتا ہے —— ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے

منٹو کے کمتر درجے کے افسانے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن انحطاط کی منزلوں سے گزر رہا ہے اس نے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنھیں ہم مجموعی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے جا بجا منٹو کی ذہانت، ان کی جدت پسندی، ان کی شوخیٔ طبع، ان کی گہری طنز اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ منٹو کی قادر الکلامی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں۔ اس دور میں بھی اُسی تازگی اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے —— بہت اچھے اور بُرے سب افسانے —— دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔ منٹو کو فطرت نے ایک قصہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اُس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی اور جب اُس نے مجبور اور بے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے فطری محاسن کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کئی گُر کی باتیں معلوم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ ان کے فطری میلان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان گُر کی باتوں سے پوری طرح فائدہ اُٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے۔ ہر انسان اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا موزوں اور دلچسپ موضوع ہے —— لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے' اور بظاہر معمولی معلوم ہونے کے باوجود یہ شرط قصہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرنا جانتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں انتہائی یگانگت اور بے تکلفی کا رشتہ قائم ہو جائے۔ پڑھنے یا سننے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصہ گو اسے اپنا ہم راز سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تامل نہیں کرے گا، وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔ کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو قالب ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح کہنا کہ وہ بے حد اہم ہے، کہانی کہنے والے کی بڑی جیت ہے۔ منٹو قصہ گوئی کے میدان میں یہ جیت حاصل کرنے میں ماہر تھا وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح باتیں کرنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا کہ دوسرے اس کے جھوٹ کو، اس کے پُر فریب تخیل کو، اس ذہانت کی آغوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب تصور کو سچ سمجھ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کس طرح کہانی بن سکتی ہے۔ اس کی مثال منٹو کا افسانہ "یہ ہے دواں" ہے۔ کہانی میں کس طرح باتوں کا مزا پیدا کر کے اپنے اور پڑھنے والے احساسات میں مکمل مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے اس کا اندازہ چغد مس ٹین والا، میرا نام رادھا ہے، ٹوٹو، ننگی آوازیں، حامد کا بچہ، رحمتِ خداوندی کے پھول، خورشٹ، باسط، ٹیٹوال کا کتا، چوہنگی اور والد صاحب جیسے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کس طرح عجیب و غریب اور ناقابلِ اظہار خیال افسانوں میں جگہ پا کر اور منٹو کی چابک دستی کے حلقہ بگوش بن کر پڑھنے والوں کا دل موہ سکتے ہیں۔ یہ بہرن، صاحبِ کرامات، بادشاہت کا خاتمہ، کتے کی دُعا، اور عزت کے لیے، جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ منٹو اپنے ذہنی ماحول میں سے اتنی

آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنجیدہ مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا، یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی —— لیکن یہ سب کچھ یہ تھا کہ منٹو کہانی کہنا جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دورِ انحطاط میں بھی وہ کہانی کہنا بھولا نہیں تھا۔ اسی لیے اس انحطاط کے زمانہ میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

یہی ساری باتیں ہیں جو مل جُل کر منٹو کے فن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور انفرادیت اور عظمت بھی۔ لیکن منٹو میں اگر اسکنڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی، پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ اور گرماگرمی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگر چونکا دینے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتا، وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح برتنے اور دوسروں کو کچوکے دے کر اس میں لذّت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی تجزیہ کو نفسیات کی نازک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچہ و بازار میں رسوا کرنے سے احتراز کر سکتا تو منٹو یقیناً اس سے بھی بڑا فن کار ہوتا جیسا کہ وہ اب تھا —— اس لیے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال نہیں کہ وہ ان چند کمزوریوں کے باوجود بہت بڑا فن کار تھا۔ اس کے مشاہدہ، تخیل، تصوّر، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا بڑا گہرا رنگ ہے اور شخصیت میں غیر معمولی قوّت و توانائی —— وہی قوت و توانائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے اور آنے والے ہر دور میں ہر طرح کے حوادث کے خلاف سپر بن کر اس فن کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی —— منٹو مر گیا۔ لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔

وقار عظیم

منٹو کا مقام

جس دن منٹو مرا تھا اُس دن بھی میں نے یہی کہا تھا کہ منٹو جیسے آدمی کی زندگی یا موت کے بارے میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، ہمیں تو اُس کی زندگی اور موت دونوں کے معنی متعین کرنے چاہئیں۔ منٹو تو ان لوگوں میں سے تھا جو صرف ایک فرد یا ایک ادیب سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر اب تو جذبات پرستی کی گنجائش یوں بھی نہیں رہی کہ منٹو کو مرے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے اور ہمارے لیے یہ سوال زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ اُردو ادب میں یا کم سے کم پچھلے بیس سال کے اُردو ادب میں منٹو کی جگہ کیا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں منٹو اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ منٹو چاہے موپاساں وغیرہ کی صف میں نہ آ سکے لیکن یورپ کے اچھے خاصے افسانہ نگاروں سے اُس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں سے متفق ہوں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر منٹو موپاساں کے برابر نہیں پہنچ سکا تو اس میں اتنا قصور خود منٹو کا نہ تھا جتنا اُس ادبی روایت کا جس میں وہ پیدا ہوا۔ جس بات میں منٹو موپاساں سے پیچھے رہ جاتا ہے وہ موپاساں کی نثر ہے۔ اور موپاساں کو جس قسم کی نثر درکار تھی وہ فرانس میں اور کچھ نہیں تو دو سو سال سے نشوونما پا رہی تھی۔ موپاساں کے پیچھے روسُو تھا، والٹیر تھا، استاں دال تھا، فلوبیر تھا۔ منٹو کے پیچھے کون تھا؟ میری بات کا وہ مطلب نہ سمجھیے جو اُردو کے ایم۔ اے سمجھیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُردو نثر بالکل فضول ہے۔ اس میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن منٹو کو جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اُردو نثر کی روایت میں موجود نہ تھیں۔ منٹو کو پانی پینے کے لیے اپنے آپ کنواں کھودنا پڑا۔ موضوع اور ہیئت دونوں میں منٹو کی حیثیت ایک پیش رَو کی ہے۔ اس لیے منٹو کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اُس سے پہلے اُردو میں کیا تھا، اُس کے بعد ہم عصر کیا کر رہے تھے، منٹو کیا کر سکا اور کیا نہیں کر سکا، یہ باتیں دیکھے بغیر ہم منٹو کو اچھا یا بُرا تو کہہ لیں گے، مگر اُردو ادب میں منٹو کی حیثیت ہماری سمجھ میں نہ آئے گی۔

منٹو نے جو کنواں کھودا تھا وہ ٹیڑھا بھینگا سہی، اور اس میں سے جو پانی نکلا وہ گدلا یا کھاری سہی۔ مگر دو باتیں ایسی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو یہ کہ منٹو نے کنواں کھودا ضرور، دوسرے یہ کہ اُس میں سے پانی نکالا۔ اب ذرا گنیے تو سہی کہ اُردو کے کتنے ادیبوں کے متعلق یہ دونوں باتیں کہی ہیں۔

میں اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ آج سے نہیں بلکہ شروع سے ہی بہت سے "خوش مذاق" حضرات کو منٹو کی ان دونوں خوبیوں سے انکار رہا ہے۔ اس کے برخلاف ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اقبال کی وفات سے لے کر آج تک کسی اُردو ادیب کا ماتم اس طرح نہیں ہوا جس طرح منٹو کا۔ آخر کوئی چیز تو تھی جس نے لوگوں کو اتنا سوگ منانے پر مجبور کیا۔ خیر،

بعض لوگ اُنی مقبولیت کو بھی منٹو کی پستی کا آخری اور قطعی ثبوت سمجھیں گے، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ ادیب کو ہر آدمی کے لیے نہیں لکھنا چاہیے۔ ایسے لوگوں کو بیس سال سے منٹو پر یہی اعتراض رہا ہے کہ منٹو تو بس ایسی باتیں کرتا ہے جس سے لوگ چونک پڑیں۔ شاید یہ کوئی شریفانہ یا غیر ادیبانہ بات ہو، لیکن میں نے جو تھوڑا بہت ادب پڑھا ہے اُس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو چونکانا ادب کا ایک مقدس فریضہ رہا ہے۔ بلکہ مِل ورل نے تو ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جو چونکانے سے ڈرتے ہیں۔ منٹو کو چھوڑیئے۔ بودلیئر جیسے عظیم شاعر کو کیا کہیے گا جس کا ایک ادبی اصول ہی یہ تھا کہ متوسط طبقے کو چونکایا جائے؟ اگر چونکانا کوئی بہت بُرا ادبی نقص ہے تو چونکنے سے ڈرنا ایک ذہنی بیماری ہے، کمزور شخصیت کی نشانی ہے جو آدمی دوسروں کو چونکانا چاہے اُس میں پہلے خود چونکنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ جس شخص کے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعصاب زندہ نہ ہوں وہ کسی کو کیا چونکائے گا، ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی۔ اگر کوئی ادیب اپنے پڑھنے والوں کو چونکاتا ہے تو یہ کوئی شکایت کی بات نہیں۔ ورنہ پھر تو بڑھئی کی شکایت کیجیے کہ اُس نے کرسی کیوں بنائی۔ ایسا ادیب تو محض اپنا فریضہ ادا کرتا ہے۔ ہاں، ادیب سے آپ یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ تم نے ہمیں چونکانے کے بعد دکھایا کیا۔ اگر ہمیں جھنجھوڑ کر جگانے کے بعد منٹو نے ہمیں انسانی فطرت اور انسانی معاشرے کا کوئی تماشا نہیں دکھایا۔ اگر اس نے ہمارے اندر زندگی کا کوئی نیا شعور پیدا نہیں کیا تو پھر ہم اُسے گالیاں دینے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس نے ہمیں چین سے سونے بھی نہیں دیا۔ جو لوگ کسی قیمت پر جاگنا ہی نہیں چاہتے، اُنھیں تو اُن کے حال پر چھوڑ دیے۔ لیکن کیا آپ "نیا قانون"، "ہتک"، "بابو گوپی ناتھ" جیسے افسانے پڑھ کر دیانت داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ منٹو نے ہمیں چونکا کر مفت میں ہماری نیند خراب کرائی؟

اچھا، منٹو نے چونکایا بھی ہے دو طریقے سے۔ ایک تو اُس کے اچھے افسانے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ انسانی حقیقت ہمارے لیے کچھ بدل سی گئی ہے۔ دوسری طرف اُس کے بُرے افسانے ہیں۔ منٹو کا ڈھنڈورچی ہونے کے باوجود مجھے تسلیم ہے کہ اس نے بعض بہت ہی خراب افسانے لکھے ہیں، لیکن اُس کے بُرے سے بُرے افسانے میں بھی آپ کو دو ایک فقرے ایسے ضرور ملیں گے جو کسی نہ کسی آدمی یا چیز یا خیال یا احساس کو منور کر کے رکھ دیں گے —— چاہے یہ روشنی ایسی ہو جو آپ کو پسند نہ آئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں بھی آورد زیادہ ہے، یہ بھی منٹو کا مداری پن تھا۔ مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ آمد اور آورد کا فرق ادب میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کوئی چیز آمد ہو یا آورد، فیصلہ کن بات تو یہ ہے کہ اس سے نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ اگر آورد کے ذریعے کسی تجربے کو اظہار مل گیا تو وہ آمد سے بہتر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نوائے سروش بھی دو طرح سنی جاتی ہے، کبھی تو سروش اپنے آپ بول پڑتا ہے، کبھی اس کے کان مروڑنے پڑتے ہیں۔ سروش کی فیاضی سے تو ہر آدمی ہی ادیب بن سکتا ہے، لیکن سروش کو زبردستی بلوانے کے لیے ہمت درکار ہے کیونکہ سروش کے کان مروڑنے کا مطلب ہے اپنے کان مروڑنا۔ آپ یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بعض دفعہ منٹو نے سروش کے کان اس طرح مروڑے کہ وہ بولنے کے بجائے چیخ پڑا یا اول فول بکنے لگا۔ لیکن منٹو نے حوصلہ تو دکھایا۔ یہ کہہ دینا

[illegible]

حلیہ بگڑ جاتا ہے۔

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

منٹو کے اندر اس شعبدے بازی کی تہہ میں جو چیز کام کر رہی تھی وہ یہ کہ منٹو اپنے چھوٹے چھوٹے احساس یا جذبے کو دبانے یا رد کرنے کا قائل نہ تھا۔ ہر چیز اُس کے اندر کوئی نہ کوئی ردِ عمل پیدا کرتی تھی، اور وہ اس ردِ عمل کو قبول کر لیتا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے اور وقتی تجربات کو ایک دوسرے سے متعلق اور منضبط کرتے رہنے کی عادت اُس میں نہ تھی۔ وقتی ردِ عمل کو وہ اتنا دلچسپ یا وقیع سمجھتا تھا کہ اس پر انضباط و ارتباط کو قربان کر دیتا تھا۔ اسی لیے اس کے افسانے کبھی تو بہت اچھے ہوتے تھے، کبھی بہت بُرے۔ اور کبھی افسانے میں ایک آدھ فقرہ ہی کام کا نکلتا تھا۔ منٹو میں یہ بہت بڑا نقص تھا۔ لیکن اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کا حال یہ رہا ہے کہ وہ یا تو اپنے احساس کو ایک ڈھرے پر لگا دیتے ہیں، اس ڈگر سے ہٹ کر کسی اور قسم کے تجربے کی صلاحیت ان میں باقی ہی نہیں رہتی، یا پھر وہ چھوٹے چھوٹے اور ہنگامی تجربات کو حقیر سمجھ کر رد کرتے چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادیب دو چار اچھے افسانے لکھ کے ٹھپ ہو جاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں بس منٹو ایک ایسا آدمی ہے جو کسی جذبے یا احساس سے نہ ڈرتا تھا اور جس کے لیے کوئی احساس حقیر یا غیر دلچسپ نہ تھا۔ بعض حضرات نے منٹو کے کارنامے کو یہ کہہ کر اُڑانے کی کوشش کی ہے کہ منٹو کے یہاں افسانے کا خام مواد تو ہے، افسانے نہیں ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کے پاس خام مواد تک نہیں ہے۔ کیونکہ خام مواد تو احساسات اور جذبات ہی فراہم کرتے ہیں۔ جب آدمی اپنے اعصاب پر پہرے بٹھا دے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ منٹو کی شخصیت اُردو کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ آزاد تھی۔ اس معنی میں کہ اُس نے اپنے احساسات پر کسی قسم کی بندشیں نہیں لگائی تھیں۔ جب اُس کے احساسات ایک دوسرے سے آزاد ہونے لگتے تھے تو یہی چیز اُس کے افسانے کے لیے مہلک بھی بن جاتی تھی۔ لیکن اُردو میں کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں، جو احساسات کی آزادی سے اتنا کم ڈرتا ہو۔ احساسات اور تعاشات کی ہلچل میں منٹو کی شخصیت ضرور پاش پاش ہو گئی، لیکن اپنی زندگی اور موت سے منٹو نے ہمیں اتنا ضرور دکھا دیا کہ فن کار اپنا مواد کس طرح حاصل کرتا ہے، کیونکہ اس نے مواد جمع کرنے کا کام سرِ عام اور سب کی نظروں کے سامنے کیا۔ اسی لیے اُردو میں اُس کی حیثیت محض ایک ادیب سے زیادہ ہے۔ اسی لیے اس کی موت اُس کی زندگی کی معنویت کو مکمل کرتی ہے اور اسی لیے اُس کے بڑے افسانوں کو بُرا سمجھنے کے باوجود میں منٹو کو اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہتا ہوں۔

محمد حسن عسکری

گنجا فرشتہ

منٹو (مرحوم) مجھ سے عمر میں کوئی پانچ سال کے قریب چھوٹا تھا۔ لیکن جب وہ امرتسر سے لاہور آیا تو میں ایم۔ اے کر چکا تھا، اور وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر الجھنوں میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کا اور میرا ایک مشترک دوست تھا (اور ہے) وہ مجھ سے دیال سنگھ کالج میں پڑھ چکا تھا۔ اور کبھی کبھی نثر کی کوئی چیز لے کر آجایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ منٹو کو لے آیا۔ ان دنوں بھی (اور یہ مدت کی بات ہے) منٹو کے انداز میں ایک نخوت اور پندار کا رنگ تھا۔ جو خودداری سے بڑھ کر تھا۔ ان دنوں بھی منٹو کسی نفسیاتی الجھن کا مریض نہ تھا۔ عمر بھر منٹو کو یہی چیز پریشان کرتی رہی کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا مریض نہیں ہوا۔ اور جن لوگوں سے اسے واسطہ پڑتا تھا اور پڑتا تھا۔ وہ کم و بیش مختلف نفسیاتی بیماریوں کے شکار تھے۔ بے باک نگاری، حق گوئی، صداقت شعاری، خلوص، دیانتداری۔ ادب میں اسی ادیب کو نصیب ہوں گی جو حقائق کو نفسیاتی تعصبات اور الجھنوں کی عینک چڑھائے بغیر دیکھے گا۔ ورنہ چیز اور حقیقت کی شکل مسخ ہو جائے گی میٹھی چیز تلخ معلوم ہو گی اور تلخ شیریں۔ مستطیل مربع معلوم ہو گا۔ اور دائرہ مکعب۔ حقائق کے مسخ کرنے کی صلاحیت خود مشاہدہ کرنے والے کی ذات میں مخفی ہوتی ہے اور وہ حقائق کا بیان کرتے وقت ان تمام باتوں سے (سرسری تم جہاں سے گذرے) کے انداز میں گذر جاتا ہے جو اُسے تکلیف دیتی ہیں یا جن سے کوئی تلخ یاد وابستہ ہوتی ہے۔ یا جن سے کسی نفسیاتی الجھن کا تعلق ہوتا ہے۔

منٹو حقائق کا نقاش نہیں تھا، عکاس تھا۔ فنون لطیفہ میں عکاسی اور مصوری میں یہی فرق بتایا گیا ہے کہ عکاسی حقائق و اشیاء کو اس طرح دیکھتی ہے۔ جس طرح وہ موجود ہوتی ہیں۔ اور مصوری اس طرح، جس طرح مصوّر کے ذہن میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اس طرح مصوّر کی تخلیق میں اور اس نمونے یا موضوع میں، جو تخلیق کا موجب ہوا ہے۔ بعض اوقات ایسا بُعد ہوتا ہے کہ پہچان نہیں پڑتا۔ کیوبسٹ آرٹ، تجریدی آرٹ کی مختلف قسمیں۔ اس قسم کے مشاہدے کی مثالیں ہیں، جہاں مصوّر اشیاء کی ماہیت اور موضوع کی معنویت کی جستجو میں، علامات و رموز سے کام لیتا ہے "اور اصل چیز جس کی تصویر بنائی جاتی ہے محض ایک محور ہو جاتی ہے، جس کے اردگرد مصوّر کے تصورات و افکار گھوم جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف عکاسی میں کیمرہ، اشیا یا حقائق کو بعینہٖ اس طرح دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے، جس طرح وہ موجود ہوتی ہے۔ یعنی موجود فی الخارج۔

میں نے عرض کیا ہے منٹو حقائق کا عکاس تھا۔ وہ نہایت استغنا اور بے پروائی سے اور بہ کمال اطمینان خاطر وہ تمام نقشے الفاظ میں اُتارتا تھا، جو اُسے گرد و پیش کی دُنیا میں نظر آتے تھے۔ یہ نقشے اپنے اصلی خط و خال اور رنگ روپ میں بہت سے آدمیوں کو دُکھ پہنچاتے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو آگاہ ہی نہ تھا کہ حقیقت کی یہ شکلیں بھی ہیں۔ دوسرا گروہ وہ تھا،

جو آگاہ تو تھا۔ لیکن مشرق کی وضعداری اور متانت کے خلاف کسی بات کو (وہ مختصر افسانہ ہی کیوں نہ ہو) گوارا کر سکتا تھا ایک وہ گروہ تھا جس کے دل کے چور پکڑے جاتے تھے بلکہ افسانوں میں ان کے دل چوری کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے ان کی جھنجھلاہٹ بجا تھی، وہ اب تک قائم ہے اور غالباً رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

یہ مقام کہ کوئی شخص کسی نفسیاتی بیماری کا شکار نہ ہو، بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتا ہے۔ منٹو کے تکبّر، نخوت اور پندار کو مرض نہ سمجھا جائے۔ یہ فن کار کو اپنی مہارت پر جو ناز تھا، اس کا اظہار تھا۔ اور صرف ان موقعوں پر ہوتا تھا جب فن زیرِ بحث ہوتا تھا کہ یہ حقیقت کی عکاسی ہیں، فن کار کو، جزئیات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اپنے ماحول کی اجتماعی تصویر کھینچنے کے لیے اس کو طے کرنا پڑتا ہے کہ زندگی کے یہ پہلو دکھائے جائیں گے اور یہ نہیں۔ منٹو نے یہ کام بہت سلیقے سے کیا تھا۔ اس کے افسانوں کے مطالعے سے ہماری معاصرانہ زندگی اور اس کے ماحول کے بہت سے پہلو اسی طرح اجاگر ہوتے ہیں کہ مختلف افسانوں کو ملا کر ایک مکمل تصویر بنتی ہے۔ اس تصویر میں جنس کے رنگ بھی چوکھے لگے ہیں لیکن بات تو یہ ہے کہ جنسی معاملات میں، ہمارے ملک میں ہر لڑکا اور ہر لڑکی کسی واہیات کتاب سے یا کسی واہیات تر دوست یا سہیلی سے جنسی معلومات حاصل کرنا پاتا کرتی ہے اور یہ معلومات ایسی ناقص اور بیہودہ ہوتی ہیں کہ بہت سی جنسی گمراہیوں اور کج رفتاریوں کا موجب ہوتی ہیں۔ منٹو اس گمراہی اور کجروی کی عکاسی کرتا ہے (اور جنسی بھوک کا تذکرہ بھی کرتا ہے) بات ذرا طول پکڑ گئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ حقیقت کی عکاسی کے لیے ضروری ہے کہ عکاس کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ یعنی ذہنی بیماری میں۔ منٹو اس اعتبار سے اپنے دَور کا بڑا صحت مند ادیب تھا۔ اس نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کو بالی عمر کے بچے اور بچیاں پڑھیں تو اُن کے اخلاق پر بُرا اثر ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خود منٹو کی نیت کا کیا عالم تھا؟

حقیقت کے عکاسوں کو دُنیا نے ہمیشہ بُرا بھلا کہا ہے کہ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔ انھیں تو وہ نقاش پسند آتے ہیں جو وہ نقش لگائیں کہ دل کو بھلے معلوم ہوں۔ موضوعِ تصویر کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی حسین شکل پیدا کریں کہ آدمی گھنٹوں دیکھا کرے لیکن ادب کو پہلے عکاس کی ضرورت ہے، پھر نقاش کی۔ اصلیت معلوم ہو گی تو وہ تصویر بنائی جائے گی، جو ملحوظ ہے اور منشائے دلی ہے۔ دنیائے باطنی اس وقت تک خارج میں متشکل نہیں ہو سکتی۔ جب تک پہلے فن کار کے ضمیر کے اندر پیدا نہ ہو۔ یہ دُنیا تبھی وجود میں آسکتی ہے کہ ادب میں ہر مرحلے پر عکاس پیدا ہوتے رہیں۔ تاکہ انسان حقیقت سے آگاہ رہے اور آنکھیں بند کر کے یہ نہ سمجھ لے کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔

دنیائے خارج میں کوئی معیاری معاشرت اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک حقیقت کے عکاس برابر ظہور میں نہ آتے رہیں اور پریشان خاطر رہ کر بھی یہ سکونِ قلب اجزا کو دیکھ کر ایک اجتماعی تصویر نہ بناتے رہیں کہ نقاشوں کو معلوم ہو سکے کہ اصل صورت کیا ہے۔ نئی دنیا بنانے کے لیے، نئی اقدار دریافت کرنے کے لیے، نئی انفرادی تربیت کے لیے، اجتماعی اصلاح کے لیے پہلے اس دنیا کی عکاسی کی ضرورت ہے، جو ہے۔ تاکہ وہ جو ہونا چاہیے، وجود میں آسکے۔

افسانوں میں فن کار اپنی مخلوقاتِ ذہنی اپنے کرداروں کے ذریعے بات کرتا ہے۔ اس لیے جو کچھ اُسے کہنا ہوتا ہے وہ بالواسطہ کہا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں اگرچہ مصنف کی اخلاقی اقدار مترشح ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کے ذاتی عقائد کا زندگی پر اس کے نقطۂ نظر کا

سراغ بہت کم ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ افسانے میں مصنف ان تمام خیالات سے اختلاف کرے، جو کرداروں کی زبانی ظاہر کیے گئے ہیں۔ برعکس اس کے انسانوں میں ایسا اکثر ہوتا ہے۔ افسانوں کے متعلق، فن کے متعلق، زندگی کے متعلق اور بہت سے دوسرے مسائل کے متعلق، منٹو کا نقطۂ نظر زیادہ وضاحت سے اس کی کتاب گنجے فرشتے کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ یوں بھی یہ کتاب منٹو نے جو فن کی منزلیں طے کی ہیں، ان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوانح نگاری اور ذاتی تاثرات کے امتزاج سے کم و بیش اردو میں ایک نئی صنفِ ادب وجود میں آئی ہے۔ یہ طے کرنا کہ اس صنفِ ادب کا نام کیا رکھا جائے۔ چنداں ضروری نہیں۔ صرف یہ طے پا جانا ضروری ہے کہ گنجے فرشتے میں منٹو نے بہت سے عناصر کو سمو کر سوانح نگاری کا ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے۔ اس کتاب میں قائدِ اعظم (مرحوم) آغا حشر (مرحوم)، اختر شیرانی (مرحوم)، میراجی (مرحوم)، باری (مرحوم)، عصمت چغتائی، شیام، پری چہرہ نسیم بانو، نرگس، ڈیسائی اور بابو راؤ پٹیل کے متعلق مضامین ہیں۔ ان مضامین میں منٹو کے سوانح حیات کے بہت سے تار الجھے ہوئے ہیں صنعتِ فلم سازی کے تذکرے موجود ہیں پیشہ ور نقادوں پر ہلکی ہلکی چوٹیں بھی ہیں۔ جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا کردار اور ان کی شخصیت منفرد ہے۔ لیکن ان کے تذکرے میں ایک قدر مشترک ہے منٹو کا بے تکلفانہ اندازِ نگارش جو اس مجموعے کی تمام شخصیتوں کو گویا ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ (ذاتی تعلقات تو ظاہر ہیں کہ تھے۔ قائدِ اعظم مرحوم کے سوا) بظاہر یہ مجموعہ، بارہ آدمیوں کے متعلق ہے۔ لیکن درحقیقت اسی کا موضوع ایک تیرھواں آدمی بھی ہے اور وہ خود منٹو ہے۔ جس کی شخصیت اس کتاب میں بے نقاب ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ منٹو بمبئی کی حد درجہ پُرتصنع فلمی دنیا میں رہ کر بھی جذباتی رہا۔ خلوص کا خواہاں اور حامل۔ مزے کی بات یہ ہے کہ منٹو نے اپنی جذباتیت کو، اپنی خوبیوں کو اور اپنے خلوص کو بڑے اہتمام سے پڑھنے والوں سے مخفی رکھنا چاہا ہے لیکن جو شخصیت اس کتاب میں سب سے زیادہ ابھری ہے۔ وہ منٹو کی ذات ہے۔ معلوم نہیں کہ ترتیب میں ترتیبِ زمانی کس حد تک ملحوظ ہے لیکن سلسلہ وار مطالعے سے منٹو کی ایک شخصیت ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، پہلے نوجوان، سادہ دل، فن کاروں اور مصنفوں پر فریفتہ، پھر دنیا کی منافقت سے دوچار، کارزارِ حیات میں نبرد آزما اور آخر اپنی ہی ذات کی ایک کمزوری سے شکست کھا کر مایوس و نامراد انسان۔ آغا حشر سے جن دو ملاقاتوں کا منٹو نے ذکر کیا ہے، اُس میں ہمیں وہ کم عمر منٹو نظر آتا ہے۔ جس کی طبیعت پڑھائی سے اُچاٹ ہو چکی تھی اور جو اپنے اردگرد کے حالات کو تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس زمانے میں اُس پر مشہور صحافی اور مورخ باری کا بہت اثر تھا۔ جو منٹو کے خیال میں حد درجہ بزدل واقع ہوئے تھے۔ اختر شیرانی سے جو ملاقات کا تذکرہ کیا ہے اُس سے منٹو کے جذباتی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ "تین گولے" میں (یہ میراجی کے متعلق مضمون ہے) منٹو نے پُراسرار تثلیث کا افسانہ شروع کر کے جڑی پتے کی باتیں کہی ہے اور میراجی کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے اس سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف، یہ اور بات ہے۔ لیکن منٹو نے جو دادِ موشگافی دی ہے اس سے انکار کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی وہ لکھتا ہے:

"حسن عشق اور موت ...... اس تثلیث کے تمام اقلیدسی زاویے صرف ان

تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آتے تھے۔ لیکن حسن اور عشق کے انجام کو چونکہ اس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا جس کے شیشوں میں تریڑے تھے۔ اس لیے اُس کو جس شکل میں اُس نے دیکھا تھا، صحیح نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے سارے وجود میں ایک ناقابلِ بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ اس کا ہر نقطہ اس کا نقطہ آغاز ہے اور وہی نقطہ انجام۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ابہام نوکیلا نہیں تھا۔ اس کا رُخ موت کی طرف تھا۔ نہ زندگی کی طرف۔ رجائیت کی سمت نہ قنوطیت کی جانب۔ اس نے آغاز اور انجام کو اپنی مٹھی میں اس طرح بھینچ رکھا تھا کہ ان دونوں کا لہو نچڑ نچڑ کر اسی میں سے ٹپکتا رہتا تھا۔ لیکن مادیت پسندوں کی طرح وہ اس سے مسرور نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں پھر اس کے جذبات گول ہو جاتے تھے۔ اُن تین آہنی گولوں کی طرح جن کو میں نے پہلی مرتبہ حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں دیکھا تھا۔"

منٹو کو اپنے معاصروں سے، فن کاروں سے خاص طور پر اور انسانوں سے عام طور پر کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے میراجی کے مرنے پر یہ لکھا کہ "اچھا ہوا کہ وہ جلدی مر گیا۔ کیونکہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور خراب ہونے کی گنجائش نہیں تھی"۔ بظاہر ان فقروں سے سنگدلی ٹپکتی ہے۔ لیکن ان کے بین السطور پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ منٹو کا دل رحم سے جیسے بھر آیا ہے، وہ میراجی کی، انسان کی مزید ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اس کے مرنے پر "اچھا ہوا" کے کلمات استعمال کرتا ہے۔

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

باری پر منٹو کا مضمون نہایت شگفتہ لیکن نہایت دقیق مشاہدات پر مبنی ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ منٹو باری کو بہت بزدل تصور کرتا تھا۔ اپنے لیے کاروبار کی جو سکیم وہ بناتا تھا اس میں فرار کا چور دروازہ ضرور ہوتا تھا کہ اگر حالات ناخوشگوار ہو جائیں اور محاذ سے پیچھے ہٹنا پڑے تو ایک راہ کھلی رہے۔ باری کو جس طرح منٹو نے دیکھا ہے۔ ان کے کردار کا تشخص ایک جملے میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

"باری صاحب قبر میں ہیں۔ معلوم نہیں۔ اس میں بھی کوئی ایسی کھڑکی ہے جس سے وہ کود کر باہر نکل سکیں"۔

باری کے متعلق منٹو کے مضمون میں طنز کا رنگ بہت چوکھا ہے اور بذلہ سنجی کے کرشمے بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ گویا منٹو کو باری سے جو محبت تھی۔ وہ اُسے طنزیہ جملوں کے پردے میں چھپانا چاہتا ہے تاکہ

پڑھنے والے کہیں یہ نہ کہیں کہ، ابن منٹو ایک بزدل کو دوست رکھتے ہوں لیکن سارا مضمون پڑھ جائیے۔ دوبارہ پڑھ جائیے، تو معلوم ہوگا کہ منٹو نے دوستی کو دشمنی کا سا رنگ دے دیا ہے۔ ریاکاری کی یہ عجیب و غریب شکل ہے۔ لوگ معنفت کو بدنظر رکھ کر دشمن کو بھی دوست کہتے ہیں۔ منٹو دوست کے گن بھی حسب دلخواہ نہیں گاتا کہ لوگ اس کی اس کمزوری پر مطلع نہ ہو جائیں کہ وہ جذباتی قسم کا آدمی ہے اور دوستوں کے تمام عیب معاف کر دینے پر قادر ہے۔ منٹو کے اپنے بیان کے مطابق باری کی زندگی کے کچھ پہلو ریڈیائی ڈرامے جو نلسٹ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں منٹو کا ایک فقرہ اس کی اصل نیت کی غمازی کرتا ہے: "لیکن ٹریجڈی یہ تھی کہ ان صحافیوں سے اس کے خلاف (یعنی ڈرامے) لکھوایا گیا جن کی ناگفتہ بہ حالت کی عکاسی اس میں کی گئی تھی۔"

اب معلوم ہو گیا کہ منٹو کا جو مضمون باری پر ہے اس میں وہ صرف باری پر ہی نہیں اپنی ذات پر بھی طنز کر رہا ہے۔ کیونکہ خود اس نے بھی زندگی صحافی کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ اس مضمون میں درحقیقت منٹو نے اس زمانے کو یاد کیا ہے۔ جب اُس نے کارزارِ حیات میں قدم رکھا ہی تھا۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ تصنیف و تالیف کا چسکا پیدا کرنے کا محرک باری مرحوم ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب منٹو یہ دریافت کر رہا تھا کہ اس کی فطرت کے ممکنات کیا ہیں اور تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کامیاب ہوگا، وہ کامیاب ضرور ہوگا۔ لیکن لازوال شہرت، بے پناہ خلوص، حیرت انگیز مشاہدہ، بے تکان لکھنے کی قدرت، کوئی چیز بھی آخر اُسے اس معاشی بحران سے نہ بچا سکی جس کے صدمات کو بھلانے کے لیے وہ شراب پیتا تھا۔ باری پر جو مضمون ہے۔ وہ دائرے کی طرح ہے۔ اس میں منٹو جہاں سے چلا ہے وہیں واپس آتا ہے۔ معاشی بے اطمینانی سے معاشی بے اطمینانی تک۔ ان دونوں حدود کے درمیان وقتی ثروت کی کئی منزلیں ہیں۔ لیکن ان سے منٹو نے کبھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ تو باری پر جو مضمون ہے وہ صرف باری کا ہی نہیں، منٹو کا اپنا مرثیہ بھی ہے۔ اور کم و بیش ہر صحافی، ادیب اور فن کار کا مرثیہ ہے۔ اس مضمون کا زہر خند غالباً بے نظیر ہے اور منٹو کی کسی اور ذہنی تخلیق میں ایسے تیکھے فقرے نہیں ملیں گے۔ مثلاً:

> "یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ پرائمری سکول کے استاد سے ترقی کرتے کرتے کسی یونیورسٹی کے ریڈر ہو جاتے۔"
>
> "جاؤ کوئی اور کام کرو۔ ہیگل اور کارل مارکس تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ غریب باری بھی ابھی تک ان کے فلسفے کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔"
>
> "اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آگیا تھا کہ اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ مگر سردیوں میں معلوم ہوا کہ کام نہیں دے سکتا۔"
>
> "ان کی طبیعت صلح کل تھی۔ دل کا عارضہ ان کو بہت دیر سے تھا۔ مگر اس کا علاج انھوں نے جب بھی کیا، مصالحت آمیز طریقے سے کیا۔ اس کی مدافعت میں ان سے کبھی جارحانہ قدم نہ اُٹھا۔"

وہ انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ لیکن یہ عجیب تماشا ہے کہ جب انگریز چلا گیا تو وہ اسی کے

نوکر ہو گئے ۔"

منٹو ادب کے معاملے میں بڑی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ لیکن اس کا مطالعہ بہت وسیع نہیں تھا۔ اس لیے جب وہ نقاد کا بہروپ بھرتا تھا تو بڑی پُر لطف کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ اس کی ذہانت اور فطانت بعض اوقات اُسے ایسے نکتے سجھاتی تھی کہ پیشہ ور نقاد منہ دیکھتے رہ جاتے تھے اور کبھی وہ ایسے دعوے کرتا تھا جن کا اثبات ممکن ہی نہیں۔ عصمت چغتائی پر جو اس نے مضمون لکھا ہے۔ اس میں اسی قسم کے تضاد کا نہایت پُر لطف مظاہرہ ہے۔ ایک بار عصمت سے زبان کے مسئلے پر جو گفتگو شروع ہوئی، تو عصمت نے بھی شاہد کی تائید کی کہ منٹو سے زبان کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا۔ منٹو نے کہا "صحیح لفظ دراز دستی ہے۔"

"شاہد قصہ ختم کرنے کے لیے دوسرے کمرے سے لُغت اُٹھا لایا۔ دال کی تختی میں لفظ
دست درازی موجود ہی نہ تھا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ منٹو ہم سے کہنا چاہتا ہے کہ دست درازی کرنا، کوئی محاورہ ہی نہیں۔ نہ دست درازی کوئی صحیح ترکیب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لغات میں دست درازی مندرج ہے اور اس کے معنی بھی طاقت اور زبردستی وغیرہ بصراحت لکھے ہیں۔ معلوم نہیں، شاہد نے کونسی لغت دیکھی۔ اسی طرح عصمت کے افسانوں پر انتقاد کرتے ہوئے اس نے عزیز احمد صاحب کی تنقید پر جو انتقاد کیا ہے وہ اس کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ہر ہر نکتے میں موجود ہے جو اس کے سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں کو ہم مصنف کی جنس سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔" سراسر زیادتی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے لکھے ہوئے افسانے پڑھ کر فوراً پتہ چلتا ہے کہ مصنف عورت ہے اور مرد کے افسانے کا بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ مصنف مرد ہے۔ یہ غلط صریح ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ عورت مردوں کی فطرت کی تصویر کشی میں مرد مصنفوں سے کم رُتبہ ہے۔ نہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ صرف مرد ہی مردوں کے جذبات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ فن کار کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہوتا ہے۔ وہ مشاہدے، مطالعے اور تخیل سے مدد لے کر جنسِ متقابل کے جذبات کی صحیح تصویر کھینچ سکتا ہے۔ عورت اور مرد کے جذبات بنیادی طور پر یکساں ہوتے ہیں کہ انسانیت دونوں میں مشترک ہے۔ اور انسان نے جو کچھ محسوس کیا ہے اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہاں کسی افسانے کے متعلق ہمیں معلوم ہو کہ لکھنے والی عورت ہے تو ہم پر نفسیاتی اثر ضرور ہو گا اور ہم کہیں گے کہ جذبات کی یہ لطافت اور یہ نفاست صرف عورت ہی کے افسانوں میں مل سکتی ہے۔ منٹو بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر عصمت کے بعض افسانوں کو عورت کے نازک اور ملائم افسانے کہتا ہے۔ منٹو کی نظر میں یہ افسانے عورت کی ادائیں ہیں۔ صاف شفاف ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ میں نے عرض کیا تھا نا کہ منٹو جب نقاد کا روپ دھارتا ہے تو زورِ کلام میں کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ عورتوں نے ایسے ایسے غیر نازک اور نا ملائم افسانے لکھے ہیں کہ بایدوشاید۔ ادھر مردوں نے بھی ایسی نزاکتِ خیال دکھائی ہے کہ سبحان اللہ۔ اس سلسلے میں ہیجڑے کے ادب کا ذکر بھی منٹو نے کیا ہے۔ پطرس پر منٹو نے یہ پھبتی چست کی تھی کہ "یہ ٹھیٹ

بظاہر سی فقرے بازی ہے: "اب یہ ہیجڑے کے ادب کا ذکر جو آیا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ خالص منٹو طرازی ہے۔ بذلہ سنجی انتقاد کے سلسلے میں دلیل کی نعم البدل نہیں بن سکتی۔ دعوے اور دلیل میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اسی مضمون میں فنی تعمیر کے متعلق بھی ایک آدھ انتقادی فقرہ ہے۔ اس سے بھی در گذر کر ہی لیا جائے تو اچھا ہے۔

عصمت چغتائی کے بعد جن لوگوں سے منٹو ہمارا تعارف کراتا ہے وہ سب فلم کے مصنوعی آسمان کے درخشندہ لیکن رو بہ زوال ستارے ہیں فلمی زندگی کے متعلق لڑکے لڑکیوں کے دلوں میں جو رومانی تصورات پرورش پاتے رہتے ہیں ان میں سے کچھ تو ان مضامین کے مطالعے کے بعد زیادہ نشوونما پاتے ہیں۔ اور کچھ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ فلم کی دنیا خود منٹو کی ذات کی طرح متضاد باتوں کا مجموعہ ہے۔ منٹو نے بڑی چابکدستی سے اس تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ بیشتر مضامین کا اسلوب ہمدردانہ ہے۔ ان مضامین میں بھی منٹو بے حد جذباتی نظر آتا ہے اور حسب معمول اپنی جذباتیت کے اخفا میں مصروف۔ جس وقت برصغیر ہند و پاک کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ منٹو بمبئی کے نگار خانوں میں مسلّم ادبی حیثیت اور وجاہت رکھتا تھا۔ ہزاروں روپے ماہوار کماتا تھا۔ اسے پاکستان آنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ ہاں یہ تھا کہ بمبئی ٹاکیز میں بڑے بڑے منصب مسلمانوں کے تصرف میں تھے تقسیم کے بعد بمبئی ٹاکیز کے ارباب اقتدار کو گمنام خطوط موصول ہونے لگے کہ مسلمانوں کو الگ کر دو، ورنہ اسٹوڈیو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ منٹو نے دل میں سوچا کہ بمبئی ٹاکیز کے ارباب اقتدار یعنی اشوک کمار اور واچہ کو تکلیف میں مبتلا کرنا ٹھیک نہیں۔ اس نے بمبئے ٹاکیز جانا ترک کر دیا۔ پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا اور خود اس کے لفظوں میں:۔

"میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔"

اس کے بعد:

تجھ سے مخفی ہے جو مجھ پہ گذری
تو قریب رگِ جاں رہتا ہے

منٹو نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ لیکن فارغ البالی اور آسودگی کے بعد یکایک معاشی بے اطمینانی میں مبتلا ہو جانے کے نتائج ظاہر ہو کر رہے۔ اور وہ منٹو جو کسی سے نہیں ڈرا تھا جس نے کسی سے شکست نہیں کھائی تھی۔ خود اپنے آپ سے شکست کھا گیا۔ ڈاکٹروں نے اُس سے کہا، شراب پینی ترک کر دو، ورنہ مر جاؤ گے۔ کچھ عرصہ اُس نے اس مشورہ پر عمل بھی کیا۔ لیکن:

پیسران نمی پرند
مریدان ہمی پرانند

والاقصہ ہوا۔ اور آخر شراب نوشی کی کثرت نے منٹو کو بھی ہلاک کر دیا۔ یہ اتفاق دیکھیے گا کہ "گنجے فرشتے" میں تین اور بھی ادیب ایسے ہیں جن کو شراب لے ڈوبی۔ یعنی آغا حشر، اختر شیرانی اور میرا جی۔ آدمی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ہمارے

ہاں زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کا سوائے شراب کے شاید اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ باری مرحوم دل کے مریض تھے۔ معلوم نہیں شراب کس حد تک ان کی موت کی ذمہ دار ہے۔

میں ذرا بہک گیا ہوں۔ اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ "گنجے فرشتے" بارہ آدمیوں کے حالات پر مشتمل نہیں۔ اس میں ایک تیرھویں شخصیت بھی ہے، یعنی خود منٹو۔ ایک طرح یہ کتاب منٹو کے خود نوشت سوانح حیات کے چند ٹکڑوں پر مشتمل ہے اور چونکہ منٹو کا ذکر کتاب میں گویا ضمناً آیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کے مندرجات منٹو کی شخصیت کو اُجاگر کرنے میں مضمون "منٹو" سے کہیں زیادہ معاون ہوتے ہیں جو "سرکنڈوں کے پیچھے" کا آخری جزو ہے۔ کیونکہ اس مضمون یعنی "منٹو" میں مصنف کچھ باتوں کو مخفی رکھنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یوں بھی اپنے سوانح حیات لکھنے کی شعوری کوشش میں ریاکاری کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور مختلف مضامین میں بغیر سوچے ہوئے مصنف جو کچھ لکھ جاتا ہے اُس سے انکشافِ ذات وصفات میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

"گنجے فرشتے" کا پہلا مضمون "میرا صاحب" ہے۔ اس میں قائدِ اعظم کا شوفر اپنی زبان میں ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے۔ یہ شوفر محمد حنیف آزاد ہے۔ اس مضمون میں شروع سے لے کر آخر تک عقیدت و احترام کا بڑا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ جو میں نے کہا تھا کہ منٹو شدید قسم کا جذباتی انسان تھا۔ اس کا مزید ثبوت ملتا ہے۔

منٹو بمبئی کے نگار خانوں میں کامیابی کے تمام مراحل طے کر چکا تھا۔ ایسی کہانیاں لکھ چکا تھا جو مقبول ہوئی تھیں۔ مکالمات قلمبند کر چکا تھا۔ سیناریو لکھ چکا تھا۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس کے ڈرامے اس معیار تک نہیں پہنچے جو اس کے افسانوں نے حاصل کیا۔ پانچ ناولٹ میں اس کی فلمی کہانی "کٹاری" پوری تفصیلات کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کہانی کا موضوع یہ ہے کہ ایک نواب صاحب ہیں (بڑی سرکار) جنھوں نے جوانی میں وہ سب کچھ کیا تھا، جو نوابوں کو کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اپنے مالی کی بیوی سے بھی عشق فرمایا تھا۔ ان کے صاحبزادے ہیں (چھوٹی سرکار) وہ باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں بلکہ بڑی سرکار اب عمر کی اس منزل پہ ہیں کہ چھوٹی سرکار کو محبت کے جال میں شکار پھانستے دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں، اور بس۔ بڑی سرکار کا مالی ایک لڑکی کا باپ ہے جس کا نام چنبیلی ہے۔ دراصل یہ لڑکی بڑی سرکار کی ہے جو مالن کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ مرتے وقت مالن نے خاوند کو حالات کی صحیح صورت سے مطلع کر دیا تھا اور اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ حرامی لڑکی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ لیکن مالی کے دل میں شیطان جاگ پڑا اس نے بڑی سرکار کی لڑکی کو اپنی لڑکی بنا کر پالا اور جب سیانی ہوئی تو چھوٹی سرکار کو موقع دیا کہ اس بچی سے بھی وہی کھیل دہرا دیں جو ان کے باپ نے مالی کی بیوی سے کھیلا تھا۔ یوں مالی نے خوفناک قسم کا انتقام لے کر اپنے دل کی آگ بجھائی۔ اس کہانی کا موضوع ایسا ہیبت ناک تھا کہ منٹو اگر چاہتا تو چھوٹی سرکار، بڑی سرکار، مالی، مالن اور اس کی لڑکی چنبیلی، انہی کرداروں کے ارد گرد تمام واقعات گھوم جاتے لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس

تیس صفحے کی فلمی کہانی میں بڑی سرکار کے منشی کا لڑکا گلاب ہیرو ہے اور خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لڑکی کُماری ہیروئن ہے۔ جیسا کہ ڈرامے کے نام سے ظاہر ہے۔ یوں بھی واقعات کے اتار چڑھاؤ کے اعتبار سے یہ کھیل میلو ڈرامہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میلو ڈرامہ بھی کمزور سا ہے۔ کُماری اور گلاب کی داستانِ معاشقہ جو چھوٹی اور بڑی سرکار کی ہوس رانیوں کے متوازی چلتی ہے بالکل بیکار تو نہیں۔ آخری سین میں گلاب اور چنبیلی کی تقدیر میں جو مشابہت ہے اس کا ذکر کر کے منٹو نے کُماری کے رومان کو بھی ڈرامے کا ضروری جزو بنا دینا چاہا ہے لیکن بات بنی نہیں۔ یوں بھی ڈراموں میں منٹو کی زبان میں وہ صناعانہ اختصار جو ایجاز کی حد تک پہنچا ہوا ہونا چاہیے، موجود نہیں۔ زبان روزمرہ کی ہے۔ یہ تو خیر کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن نقص یہ ہے کہ جو حیرانِ کلام ہوتی ہے اس پر منٹو زیادہ توجہ صرف نہیں کرتا۔ چھوٹی سرکار اور بڑی سرکار کی کوئی واضح تصویر بھی پڑھنے والے کے ذہن میں نہیں اُبھرتی اور کُماری اگرچہ ڈرامے میں برابر تھرکتی رہتی ہے لیکن اس کے باوصف بے جان ہے۔ اس کے مقابلے میں چنبیلی جیتی جاگتی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لڑکی کا معاشقہ اس معاملے میں معاونی حیثیت رکھتا ہے جو آغا حشر کے ڈراموں میں دوسرا متوازی پلاٹ رکھتا تھا۔ کُماری کی داستان خارج کر دینے سے اصل ڈرامہ کسی طرح متاثر نہیں ہوتا۔ ڈرامہ جہاں ایک لفظ بھی فالتو نہیں ہوتا وہاں منٹو نے پوری داستان فالتو لگا دی ہے۔ یوں بھی اس کھیل میں ان انگریزی فلموں کے مناظر کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے جو خانہ بدوشوں کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کا سردار ڈمرو وہ تمام باتیں کرتا ہے جس سے پڑھنے والے کی توجہ اس کے حیرت انگیز کردار کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اس کے پاس ایک باجہ جس کے تار نہیں، گھڑی ہے جس کی سوئیاں نہیں۔ لیکن اس کے باوصف وہ کسی انگریزی فلم کا سلولائیڈ کا ٹکڑا ہے جسے منٹو نے کسی انگریزی فلم سے نکال کر یہاں چپکا دیا ہے۔

یہی موضوع اگر منٹو اپنے افسانے کے لیے انتخاب کرتا تو آپ دیکھتے کہ کیا صورت پیدا ہوتی۔

"منٹو کے ڈرامے" (ریڈیائی) میں بھی یہی بات ہے کہ منٹو الفاظ کو بغایتِ اختصار استعمال نہیں کرتا۔ ان میں سے کبوتری خالص میلو ڈرامہ ہے لیکن منٹو نے اس میں کچھ (PROBLEM PLAY) کا سا انداز پیدا کر دیا ہے۔ اس ڈرامے کی ہیروئن دُرگی ہے۔ جس پر ایک لال لال آنکھوں والا کمبل پوش مرتا ہے۔ دُرگی کی شادی ایک تھانیدار سے ہوئی ہے اور اسے آخری سین میں کوئی گولی سے مار ڈالتا ہے۔ یہ اشارہ ملتا ہے کہ قاتل تھانیدار خود ہے۔ لیکن کمبل پوش عاشق قتل کا اعتراف کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے منٹو کے خیال میں دُرگی کو دو آدمیوں نے قتل کیا ہے۔ اس کے جسم کو اس کے شوہر تھانیدار نے، جسے شبہ ہو گیا تھا اس کی کبوتری کسی کمبل پوش کے من میں بھی بستی ہے اور اس کے وجودِ معنوی کو کمبل پوش نے، جو اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرتا ہے۔ کمبل بھی علامتی اہمیت کا حامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق کے متعلق یہ دریافت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ "انتظار کا دوسرا رُخ" کئی بار پڑھنے کے بعد بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا۔ ایک لڑکی بلقیس نے ساڑھے آٹھ بجے کسی سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کی ماں اُسے روکنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ بھائی کی مدد سے بہانہ بنا کر آخر گھر سے نکل جاتی ہے۔ دوسرے منظر میں جس سے ملنے کے لیے نکلتی ہے اس کے متعلق یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دل کا دورہ پڑا، مر گئے یا سو رہے ہیں۔ اس

یں بھی وہی (PROBLEM PLAY) کا سارنگ ہے لیکن (PROBLEM) یا مسئلہ کوئی نہیں۔

ان ڈراموں میں "کیا میں اندر آ سکتا ہوں" نہایت سلجھی ہوئی اور ستھری ذہنی تخلیق ہے۔ اس میں نعیم ایک آزاد خیال اور تعلیم یافتہ نوجوان (جو حقیقت میں اس مہذب آدمی کی علامت ہے جو ہر قسم کی نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں سے آزاد ہے) مختلف جگہوں سے نکالا جاتا ہے۔ باغ میں بیٹھنا چاہتا ہے تو باغ کا حقِ ملکیت آڑے آتا ہے۔ ایک مجلس میں شریک ہونا چاہتا ہے تو دعوت نامے کی عدم موجودگی پریشان کرتی ہے۔ ایک کلب میں ایک لڑکی سے باتیں کرنا چاہتا ہے وہ اپنے پتا سے اجازت لینا چاہتی ہے۔ (یہ لڑکی آج کل کی وہ پڑھی لکھی شائستہ لڑکی ہے جو اپنے حسن، اپنی شائستگی اور اپنی تعلیم کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتی ہے۔ تعلیم کے لیے موٹر، حسن کے لیے کوٹھی اور شائستگی کے لیے سماج میں ایک اونچا مقام) آخر نعیم اپنے گھر پہنچتا ہے اور نوکر سے کہتا ہے کہ یہاں تو نہ آسمان میرا ہے، نہ زمین، نہ ہوا اور پانی۔ آخر وہ ایک طوائف کے ہاں پہنچتا ہے جس کے بالاخانے سے "پیا بن ناہیں آوت چین" کے بولوں کی آواز آتی ہے (یہ طوائف زندگی سے گریز کی علامت ہے۔ مامن ہے جہاں انسان پناہ لینا چاہتا ہے لیکن خود یہ طوائف اپنے پیا کی منتظر ہے) اس سارے کھیل میں مکالمات کا اختصار، کرداروں کا تشخص اور کرداروں کی علاقاتی اہمیت کی طرف اشارے، منٹو کی مہارت فن کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوصف، میرا خیال ہے کہ یہی چیز منٹو افسانے کی صورت میں لکھتا تو اس سے یقیناً بہتر لکھتا۔ آخری ڈرامہ "ہتک" منٹو کے اسی نام کے مشہور افسانہ پر مبنی ہے۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ طوائف کے اندر بھی ایک خوددار عورت مخفی ہوتی ہے اور اس کے منہ پر پوڈر کی کتنی تہیں کیوں نہ چڑھ جائیں لیکن نیچے رگوں میں خون حرکت کرتا ہے جو وقت آنے پر کھول بھی سکتا ہے۔ ڈرامے اور افسانے کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہو گا کہ جو نفاست اور جو فنکاری افسانے میں ہے وہ ڈرامے میں نہیں۔

منٹو کے افسانوں پر تبصرہ ایک نہایت مفصل مضمون کا تقاضا کرتا ہے۔ مجھے اس مضمون میں زیادہ "گنجے فرشتے" کے مطالب اور ان کی اہمیت سے بحث کرنا تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ منٹو کا ذکر ہو اور اس کے افسانوں کے متعلق کچھ نہ کہا جائے تو یہ عجیب و غریب بات ہو گی۔

منٹو کے افسانوں کے کردار زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دلال ہیں، مولوی ہیں، استاد ہیں، پہلوان ہیں، کالج کے لڑکے لڑکیاں ہیں۔ تقریب قریب ہر معاشری طبقے کے افراد منٹو کے افسانوں میں ملیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس معاشرت کو منٹو نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جس کے افراد کم و بیش، منٹو کے حمام میں سب ننگے ہیں۔ وہ متوسط الحال طبقہ ہے جو غریبوں اور امیروں کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح متحرک رہتا ہے۔ اس طبقے میں سے کچھ اوپر کے طبقے میں چلے جاتے ہیں اور نو دولتے کہلاتے ہیں۔ کچھ نیچے اترتے ہیں اور اس قسم کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں، مزدور، کسان، کلرک وغیرہ۔ منٹو کے افسانوں میں دو خصوصیات ایسی ہیں جو اسے اپنے معاصروں سے بالکل علیحدہ کر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کبھی ایسی چیز کو افسانے کا موضوع نہیں بناتا جس کے کیف و کم سے وہ بخوبی آگاہ نہ ہو۔ اس کی حیرت انگیز قوت مشاہدہ اس کے ذہن میں واقعات کا تحفظ، اس کی تیز بینی، یہ چیزیں اسی سلسلے میں نظر آتی ہیں۔ اس کی دوسری خصوصیت جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، یہ ہے کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں۔

ذہنی طور پر غالباً عصرِ حاضر کا سب سے زیادہ توانا اور صحت مند ادیب ہے ۔ اس لیے ذہنی بیماری، نفسیاتی اُلجھن کو وہ فوراً پہچانتا ہے ۔ یعنی ان چیزوں کو وہ اپنی ذات کی نسبت سے پہچانتا ہے ۔ اصطلاح میں یوں کہنا چاہیے کہ اس کی ذات ذہنی اُلجھنوں اور نفسیاتی بیماریوں کے لیے (SYSTEM OF REFERENCE) ہے۔ یعنی نظامِ نسبتی (ہم کسی چیز کے متعلق تبھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ متحرک ہے ۔ اگر ایک نظامِ نسبتی ایسا موجود ہو جس میں مسلمہ طور پر چیزیں ساکن بھی ہوں ۔ ورنہ یہ کہنا ناممکن ہے کہ فلاں چیز ساکن ہے اور وہ متحرک) ذہنی اُلجھن اور نفسیاتی امراض کا وجود تبھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک نظامِ نسبتی ان کے لیے بھی موجود ہو۔ منٹو کی اپنی ذات میں ایک مکمل نظامِ نسبتی تھا ۔ اس لیے جہاں کہیں وہ نفسیاتی اُلجھن یا مرض کا ذکر کرتا ہے ۔ نہایت ژرف نگاہی سے کرتا ہے ۔ جو عوارض اُسے اپنی ذات میں نظر نہیں آتے، انھیں وہ ناصحت مند کیفیات تصور کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ دل کے چور بڑی آسانی سے پکڑ لیتا ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ لکھتے وقت کوئی سماجی یا ثقافتی ممنوعات اس کے راستے میں کھڑی نہیں ہوتیں اُس کے ہاں (TABOOS) یعنی ممنوعاتِ ذہنی بالکل نہیں ہیں ۔ پڑھنے والوں کی جھنجھلاہٹ اور پیچ و تاب کا اصلی راز اسی خصوصیت میں مخفی ہے ۔ ان ممنوعات کو جب منٹو راستے سے ہٹاتا ہے تو جو لوگ ان کے سایے تلے یا ان کی دیواروں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، ان کو اپنی اس دُنیا کے ستون لرزتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ چھتیں کانپتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ۔ اور در و دیوار باہر کی طرف گر پڑتے ہیں ۔ اس طرح بعض لوگوں کو ننگے ہونے کا، بے آسرا ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔ اور وہ منٹو کو گالیاں دے کر اپنی شکست خوردگی کی خفت مٹاتے ہیں ۔ تہذیب و تمدن، معاشرہ، ثقافت یا سماج، جو چاہے کہہ لیجیے، اُن کے مفروضات، معتقدات، ظنیات اور توہمات کو منٹو از سرِ نو پرکھتا ہے ۔ اس طرح زندگی کی اقدار بھی پرکھی جاتی ہیں اور جو لوگ کچھ ظنیات اور ممنوعات کو ہی اقدار سمجھ کر تاریک حجروں میں رہتے تھے، ان کو میدان میں کھڑے ہو کر سورج کی روشنی میں اپنی طرف دیکھنا پڑتا ہے ۔ یہ بڑا تکلیف دہ عمل ہے ۔

یہ دو خصوصیات تو منٹو کی ایسی ہیں کہ ان میں غالباً اس کا کوئی شریک نہیں ہے ۔ ایک اور خصوصیت بھی اُس کے افسانوں میں ہے جو پچھلے سات آٹھ سال کے عرصے میں بنیادی ہوتی چلی جا رہی تھی ۔ اس کے افسانوں کے کردار اس طرح گفتگو کرتے ہیں، جسے اصطلاح میں (SPEAKING IN CHARACTER) کہتے ہیں ۔ مشرقی ادب میں یہ خصوصیت بلاغت کا ایک جزو ہے اور اس کے معنی ہیں کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا ۔ منٹو کے افسانوں میں پنجاب کے سکھ واقعی سکھ ہیں ۔ مراد آباد کے ظروف ساز نہیں ہیں ۔ منٹو کے افسانوں میں کوچوان واقعی گھوڑا ہانکتے ہیں، رئیسی نہیں فرماتے ۔ ان کی بات چیت سے گھٹیا بیڑیوں ادھ جلی ماچسوں کی، موم بتیوں کی، پسینے کی بُو آتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے بھی "صنم خانے" ہوتے ہیں اور وہ بھی بعضاً یہ شعر پڑھ کر چابک پھٹکارتے ہیں کہ ؎

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ذرا ٹھہرو
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

سیّد عابد علی عابدؔ علی

منٹو

منٹو بھی عجیب آدمی تھا اور اتنا ہی عجیب افسانہ نگار، شروع شروع میں مجھے منٹو کی شخصیت اور اس کے افسانوں دونوں میں سے کسی سے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوئی، شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ منٹو کے بعض افسانوں میں اس طرح کی گندگی تھی جس کا بظاہر کوئی مقصد نہ تھا، سوائے اس کے کہ منٹو نے اس میں اپنی مریضانہ ذہنیت کا اظہار کیا تھا اور یہ غلاظت محض جنسی قسم کی تھی اور مجھے اس اعتبار سے منٹو اور میرا جی ایک دوسرے سے بہت قریب آتے نظر آتے تھے، کبھی میں یہ سوچتا کہ میرا جی کے پاس جو تین گولے تھے اُن میں سے ایک گولہ خود منٹو تھا، اتنا ہی مبہم اور اتنا ہی دلچسپ۔

تقسیم کے بعد مجھے اکثر منٹو سے ملنے اور اس کے افسانے اسی کی زبانی سُننے کا موقع ملا، اسی قسم کی ایک صحبت میں منٹو نے ایک افسانہ پڑھا، افسانے میں ایک اُجڈ سپاہی کا کردار تھا جو بات بات پر گالی بکتا اور اکثر گالیاں خاصی مغلظات تھیں، لوگ منٹو پر برس پڑے، اس نے بار بار سمجھانے کی کوشش کی "گالی منٹو نے نہیں بکی، اس سپاہی نے بکی، یہ جہاں آپ کو ہاتھ لگے آپ اس کی تواضع کریں، منٹو نے تو صرف اسے اپنے افسانے میں پیش کر دیا ہے۔ اس افسانے میں اور کئی باتیں بھی ہیں۔ آپ اس گالی کے پیچھے پڑ گئے۔ ان باتوں کو دیکھنے اور سننے کے لیے آمادہ نہیں، آپ کا جی چاہے آپ گالی دے دیں لیکن افسانے ضرور پڑھنے کی کوشش کریں"۔ میں سمجھتا ہوں منٹو نے ٹھیک کہا تھا، بلاشبہ اس کے بعض افسانوں کے موضوعات ایسے جنسی مسائل ہیں جو ہمارے ادب اور معاشرہ میں ابھی "ممنوعات" ہیں، یہ بھی درست ہے کہ بعض افسانوں میں محض لذت لینے کی خاطر ایسے مسائل کی تشریح، ایسی تشبیہیں، استعارے اور کنائے ملتے ہیں جن کا مقصد محض آتشِ شوق کو بھڑکانا اور بھڑکتے شعلوں سے اس آگ کو پھیلانا ہوتا ہے، کہیں وہ جزئیات نگاری میں ایسا عملِ جراحی کرنے لگتا ہے، جیسے کوئی سرجن ہو، لیکن یہ عمل جراحی کسی ہسپتال کے آپریشن تھیٹر میں ہو تو کوئی ہرج نہیں، منٹو اسے شارع عام پر کرنے لگتا ہے، کہیں منٹو علاج بالمثل اور کہیں علاج بالضد کا قائل معلوم ہوتا ہے۔ وہ زہر کا علاج زہر سے کرنا چاہتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ زہر سے زہر کا علاج نہ ہر طبیب کے بس کا ہے اور نہ ہر مرض پر آزمایا جا سکتا ہے اور منٹو جیسے شرابی کے لیے ان حدود کا لحاظ رکھنا ممکن نہ تھا، لیکن ان سب باتوں کے علاوہ منٹو کے یہاں کچھ اور بھی ہے اور اسی "کچھ اور" نے منٹو کو بحیثیت انسان نہ سہی، بحیثیت افسانہ نگار ایک مرتبہ بخشا ہے۔

اپنے افسانوں کے بارے میں منٹو نے ایک لکھا ہے "کہ زمانے کے جس دَور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے، اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ

ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے، میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا ایک نقص ہے — " اس بیان میں کچھ صداقت ضرور ہے کیونکہ منٹو کے علاوہ اور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں کی تحریروں کا جائزہ لیجیے تو یہ نقص اور بھی کہیں کہیں مل جائے گا۔ میراجی کی شاعری کا بڑا حصہ، راشد کی بعض چیزیں اسلام مچھلی شہری کی بعض نظمیں، عصمت چغتائی کے بعض افسانے اس طرح کے ہیں جو بہت سے لوگوں کے لیے قابلِ برداشت نہیں۔" یہ سچ ہے کہ ان میں ایک طرح کی فرسودگی اور مریضانہ ذہنیت پائی جاتی ہے لیکن اس صورتِ حال اور نفسیاتی کیفیات کے پیدا ہونے کی ذمہ داری اس ماحول پر ہے جن میں ان لوگوں کی نشوونما ہوئی۔ ان کی تہہ میں ایک طرح کی بھوک، ایک تشنگی اور محرومی جھلکتی ہے۔ اور جب ان چیزوں کی تسکین کے فطری ذرائع مسدود ہوتے یا ان کی راہوں میں روڑے اٹکتے ہیں تو یہ پھر اپنے لیے نئی راہیں تلاش کر لیتی ہیں۔ اور یہ آج ہی نہیں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اردو شاعری میں امرد پرستی، معاملہ بندی یا بقول میر چوما چاٹی اسی ذہنیت کی ترجمان ہے۔ نظیر جیسا شاعر جس کے یہاں فنی شعور کی معراج تک پہنچنے کے امکانات سب سے زیادہ تھے، اس کیچڑ میں پھسل پڑتا ہے اور آج تک اس کی سزا پا رہا ہے۔ تو ظاہر ہے آج کے زمانے میں جب شستہ کلامی، صحت اور نفاست پسندی ہمارے ماحول میں آبِ حیات کی طرح ظلمات کے ہزار پردوں میں چھپی ہیں، ان لوگوں کو کیسے آ سکتی تھیں۔

ایک بات آپ ضرور کہہ سکتے ہیں، وہ یہ کہ اس طرح کے لکھنے والے بیماریوں کی تشہیر کرتے ہیں۔ غلاظت کے ڈھیروں پر سے خس و خاشاک کے غلاف اتار کر پھینک دیتے ہیں لیکن ان بیماریوں کا علاج نہیں بتلاتے، اس غلاظت کو پیدا ہونے سے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے، یہ خامی ان میں البتہ ہے، یہ مجدد اور مصلح نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے ان کے پاس ساز و سامان نہیں۔

لیکن میں منٹو کے افسانوں کے اس پہلو پر زیادہ نہیں لکھ سکتا، کیونکہ اس کے لیے بعض بنیادی طویل بحثیں درکار ہیں، ہم کس چیز کو فحش کہتے ہیں، کیا فحش کا تصور کوئی بنیادی تصور ہے یا محض اضافی ہے کہ حالات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور جنس کے ساتھ فحش کا تصور کب اور کیوں وابستہ ہو گیا۔ ایک فطری فعل اور اس میں شریک بعض اعضا کی نمائش اور ان کا ذکر کب اور کیوں ایک گناہ سمجھا جانے لگا، یہ بحثیں ہمیں معاشرتی ارتقاء، مذہب اور اخلاق کی تاریخ اور نفسیات کی پُرپیچ راہوں پر لا ڈالیں گی جس کا یہاں موقع نہیں، شاید اس سے یہ بھی غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ میں منٹو کی فحش نگاری کی معذرت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس وقت میرا مقصد یہ نہیں۔ میں منٹو کے افسانوں کو صرف افسانوں کے فنی معیار سے دیکھنا چاہتا ہوں، ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جو فحش ہیں اور ایسے بھی جو فحش نہیں ہیں۔ اس بحث میں میرے سامنے منٹو کے تین مجموعے ہیں، 'منٹو کے افسانے'، 'دھواں' اور 'سرکنڈوں کے پیچھے'۔

'منٹو کے افسانے' میں پہلا افسانہ 'نیا قانون' ہے۔ منگو کوچوان جو سیاست داں اور لیڈر نہیں صرف ایک کوچوان ہے انگریزوں سے نفرت کرتا ہے، اس لیے نفرت کرتا ہے کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں، طرح طرح کے

ظلم ڈھاتے ہیں اور منگو کوچوان کو ستاتے ہیں، شرابی گوروں سے اس کا اکثر جھگڑا ہوتا ہے اور ایک روز منگو کوچوان کو خبر ملتی ہے کہ نیا قانون بننے والا ہے جس سے ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔ اُستاد منگو نے لینن اور کارل مارکس کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں لیکن وہ رُوس والے بادشاہ وہاں کے قانون اور دوسری نئی چیزوں کو بہت پسند کرتا تھا اور اس نے ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں کو روس والے بادشاہ کے تخیل سے وابستہ کر دیا، نئے قانون کے نفاذ کا دن آگیا اور استاد کے دل میں نئی امنگوں نے کروٹ لی۔ اب وہ گوروں سے نہیں ڈرے گا، استاد منگو کی ملاقات ایک شرابی گورے سے ہوئی جو پہلے ایک مرتبہ اس سے جھگڑا کر چکا تھا، آج بھی جھگڑا ہوا۔ لیکن نیا قانون بن چکا تھا، گورے کی بید کی پالش کی ہوئی چھڑی استاد منگو کی ران سے چھوئی اور اس کے جواب میں استاد منگو کا گھونسا گورے کے منہ پر جم گیا۔ وہ گورے کو پیٹ رہا تھا، وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے، اب نیا قانون ہے نیا قانون۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو — قانون وہی پُرانا ہے۔"

اور اُس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اس افسانے میں منٹو کا کوئی کمزور پہلو نہیں اُبھرتا، یہ ہماری سیاسی جدوجہد کے دَور کا آئینہ دار ہے جس میں ہماری آرزوئیں اور اُمنگیں، تمنائیں اور ناکامیاں جھلکتی ہیں اور فنی معیار سے بھی یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اچھے مختصر افسانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کا تانا بانا زیادہ نہ بکھرا ہو، بات سے بات نکل کر طوالت نہ پیدا ہو جائے، مرکزی خیال ایک رہے۔ کردار، واقعات اور مکالمات اسی ایک خیال کو اجاگر کرنے اور تاثر میں شدت پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں، یہ بات بھی یہاں پوری طرح حاصل ہوگئی ہے کہ کردار صرف ایک ہی ہے۔ استاد منگو، واقعات اور مکالمات مناظر اور پس منظر کا محور بھی ایک ہے یعنی نئے قانون کے نفاذ کا انتظار، لیکن اس ایک محور پر مشاہدہ اور مطالعہ کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً:-

"اُس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا، مگر اُسے ہر چیز پُرانی نظر آئی —— آسمان کی طرح پُرانی، اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پُرانی نظر آتی تھیں، یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔"

مختصر افسانہ میں جزئیات نگاری کا موقع نہیں ہوتا لیکن چابکدست افسانہ نگار مختصر اشاروں میں بھی جزئیات نگاری کا حق ادا کر دیتا ہے۔ استاد منگو کی ملاقات گورے شرابی سے ہوتی ہے اور وہ تانگہ ٹھہرا کر پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھتا ہے۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے۔"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا، صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اُوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھچ

گیا اور پاس ہی کے گال کے اس طرف، جو مدہم سی لکیر ناک کے نتھنے سے تھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آرہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہوگئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔"

اس طرح کی مثالیں اور افسانوں میں بھی ملتی ہیں:۔

"ساڑھیوں کی ریشمیں سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگیں، تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں، ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں، اونچی اونچی ایڑی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے سینے، پھڑکتی ہوئی رگیں اور پھر ان الھڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں ..... یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حُسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا ہے۔"

اسی مجموعے میں ایک اور افسانہ 'ہتک' ہے، اس میں بھی اس طرح کی جزئیات نگاری کی مثالیں موجود ہیں اور پھر یہ ایک ہی مجموعے پر منحصر نہیں، سارے مجموعوں میں بکھری پڑی ہیں۔

عام حالات میں اس تکنیک سے افسانہ نگار بڑا فائدہ اُٹھا سکتا ہے لیکن منٹو جہاں بعض اعضا اور اعمال و افعال، حرکات و سکنات کے بیان میں اسے استعمال کرتا ہے، وہاں قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ منٹو دراصل صرف مزے لے کر اسے لکھ رہا ہے۔ اس کا مقصد لذتیت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ دھواں، بلاؤز، کالی شلوار، مصری کی ڈلی، پھاہا، خوشیا اور مسز ڈی کرسٹا پڑھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے، یہ نفسیاتی مطالعہ ہے۔ ایسے اُردو میں یہ روایت نئی نہیں، مولوی نذیر احمد کے یہاں کم از کم توبۃ النصوح میں اس کی دو مثالیں نصوح اور کلیم کے کرداروں کی تخلیق میں موجود ہیں اور پھر یہ سلسلہ مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا سے ہوتا ہوا ہمارے زمانے تک پہنچتا ہے۔ مختصر افسانے میں یہاں بھی تفصیلات کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن اشاروں اور کنایوں میں کرداروں کی ذہنی کیفیات اور ان کے ردِ عمل کا جائزہ لے لیا جاتا ہے۔ منٹو کے کردار طرح طرح کے ہیں اور وہ ان سب کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ طبیب نہیں کہ نفسیاتی بیماریوں کا علاج تجویز کرے لیکن اس کی نظر ان بیماریوں پر ضرور ہے۔ اس طرح کی ایک مثال منٹو کے بدنام افسانے دھواں میں ملتی ہے۔ اس افسانے میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماں باپ کے تعلقات کا اثر نوجوان اولاد پر کس طرح ہوتا ہے۔ منٹو نے یہاں بات اشاروں میں کی ہے جس کا وہ کم عادی ہے لیکن بات صاف ہوگئی ہے:۔

"اِدھر اُدھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے، بارش اب رُک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالا اور صحن میں کھیلنا شروع کیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی، اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی، کون؟ جی میں ہوں مسعود، اندر سے آواز آئی کیا کر رہے ہو؟ جی کھیل رہا ہوں۔ کھیلو، پھر تھوڑے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا تمھاری ماں میرا سر دبا رہی ہے۔ زیادہ شور نہ مچانا۔"

ماں باپ کا سرو بارہی ہے ۔ وہ خود تھوڑی دیر پہلے اپنی بہن کی کمر دبا چکا تھا، اور دوسرے لمحے اس نے ایک اور عجیب منظر دیکھا، اس کی بہن کلثوم اور اس کی سہیلی بملا...... اس افسانے میں بلاشبہ نفسیاتِ فاسدہ کا مطالعہ ہے اور پڑھنے والے کو ایک جگہ تو کچھ گھن سی محسوس ہوتی ہے ۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک خاص ماحول کی وجہ سے ہمارے یہاں صحت مندانہ جنسی تعلیم کا امکان نہیں اور اسی لیے اس طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں ۔ 'پھاہا' بھی اسی طرح کا ایک افسانہ ہے اور 'مصری کی ڈلی' میں بھی تحت شعور میں یہی مسئلہ ہے ۔

طوائفوں اور عیاش عورتوں کے نفسیاتی مطالعے منٹو کو خاص طور پر بہت مرغوب تھے ۔ منٹو نے جس طرح کی زندگی خاص طور پر پونہ، دہلی اور بمبئی میں گزاری تھی اس نے منٹو کو ان طبقوں کے کرداروں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا تھا ۔ اس کی ایک مثال خوشیا میں ملتی ہے ۔ خوشیا ایک پیشہ ور دلال ہے، اسے علاقے کی چھوکریوں کا سارا حال معلوم ہے لیکن کانتا جب اس کے سامنے بالکل ننگی چلی آتی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے کیونکہ اس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر ننگا نہیں دیکھا تھا ۔ یہاں سے قصے کا تانا بانا شروع ہوتا ہے اور خوشیا کا کردار پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے ۔

نفسیاتی مطالعوں کے سلسلے میں نعرہ بھی ایک دلچسپ افسانہ ہے ۔ کیشو لال ایک سیٹھ کے مکان میں کرایہ دار ہے برسوں کرایہ ادا کرتا رہتا ہے ۔ اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا اور سیٹھ اُسے گالی دیتا ہے ۔ اس گالی کو سن کر کیشو لال پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا منٹو نے بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے اور بلاشبہ یہ افسانہ منٹو کے اس طرح کے دوسرے افسانوں کے عیوب سے پاک اور مثالی افسانہ کہا جا سکتا ہے ۔ تفصیل کا موقع نہیں، 'ہتک' اور 'کالی شلوار' بھی اسی طرح کے افسانے ہیں ۔

ایک اور عنصر جو منٹو کی تمام تحریروں میں جاری و ساری ہے طنز ہے ۔ ایسا بھرپور طنز جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا، جس میں تندی بھی ہوتی ہے اور تلخی بھی ۔ اس طنز میں ہی منٹو کبھی کبھی ننگا ہو جاتا ہے ۔ لیکن وہ کیا کرے، جن زخموں کو وہ دکھانا چاہتا ہے وہ ہمارے معاشرے کے جسم پر صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور رِس رِس کر ناسور بن چکے ہیں ۔ ہم ان کا علاج کرنے کے بجائے انھیں کپڑوں کی تہوں میں چھپانا چاہتے ہیں اور اس طرح خود فریبی کا شکار ہیں ۔ ہم نے اخلاق اور شرافت کا ایک معیار بنا رکھا ہے ۔ لیکن ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکا ہے اور ہم صرف کپڑوں اور نعروں کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں، جنھوں نے منٹو کا افسانہ 'ہتک' پڑھا ہے وہ اس زخم کو دیکھیں جو طوائف کہلاتی ہے ۔ اب یہ موضوع نیا نہیں رہا ۔ نذیر احمد کی ہریالی سے مرزا رسوا کی امراؤ جان اور قاضی عبدالغفار کی لیلیٰ تک ہم اپنے افسانوی ادب میں اس کے بہت سے روپ دیکھ چکے ہیں ۔ نذیر احمد بے چارے مولوی تھے، یہی کیا کم تھا کہ انھوں نے ایک طوائف کو ادب کے مقدس ایوان میں آنے کی اجازت دے دی ۔ یہ اور بات سہی کہ انھیں اپنے اس کردار سے آخر تک مولویانہ کد رہتی ہے

امراؤ جان آدا بڑی نستعلیق قسم کی طوائف ہے۔ اس کی شاعری، شستہ مذاقی، سخن فہمی سخن سنجی، فقرے بازیاں، اس کے ٹھاٹ باٹ سب کچھ لکھنؤ کے تعلقہ داری نظام کا ایک جزو معلوم ہوتے ہیں۔ امراؤ جان آدا آج کی طوائف نہیں۔ یہی حال قاضی عبدالغفار کی لیلیٰ کا ہے۔ اس میں رومان اور شاعری زیادہ ہے۔ لیکن منٹو کی طوائف کے ہاں رومان اور شاعری کی جگہ زندگی کی وہ تلخ حقیقت ہے جس سے دوچار ہے اور یہ تلخی منٹو کے افسانے "ہتک" میں سوگندھی کا کردار بن کر پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ سوگندھی ایک طوائف ہے لیکن ایک عورت بھی اور اس عورت کو طوائف بننے پر کس نے مجبور کیا؟ وہ عورت جو بہن بن سکتی ہے، ماں بن سکتی ہے، بیٹی بن سکتی ہے اس روپ میں کیسے آجاتی ہے؟ "ہتک" پڑھنے والا اسی سوال کو بار بار دہراتا رہتا ہے اور ڈرامہ "لوک" پڑھتے وقت بھی یہی طنز بار بار اُبھرتا ہے۔ "ماتی جیوان" کا قحبہ خانہ صرف منٹو کے ذہن کی تخلیق نہیں ہمارے آس پاس کہیں موجود ہے لیکن ہمارے دلوں میں چور ہے اس لیے ہم اس سے نظریں بچا کر گزر جاتے ہیں، اسی طرح کے کردار منٹو کے افسانے "ڈس روپے" میں موجود ہیں۔

منٹو کی کردار نگاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ سارے کردار محض اس کے تخیل کی پیداوار نہیں اس نے اپنے مطالعہ اور مشاہدے سے انھیں اچھے بُرے افسانوں کی اس بھیڑ میں سے چھانٹ لیا ہے جس میں ہم سب کھو جاتے ہیں۔ افسانہ نگار کا کام محض مطالعہ اور مشاہدہ نہیں، انتخاب بھی ہے اور منٹو انتخاب کے معاملے میں ایک ہوشیار فن کار ہے۔ اس کے کردار ناٹک کی اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کی طرح اپنے منہ پر نقلی چہرے چڑھائے نظر نہیں آتے، بلکہ وہ تو اپنے جسم پر سے لباس بھی اتار پھینکتے ہیں کہ ہم ان کے خط و خال، ان کے دلآویز خطوط اور اُبھار، یا پھر رستے ہوئے ناسور اور سڑتے ہوئے زخم بھی دیکھ لیں؛ ان کی گفتگو بھی ایسی ہی بے تکلف اور برجستہ ہوتی ہے۔ گالی بکنے والا کردار گالی ہی بکتا ہے، موقع بے موقع اقبال کا شعر نہیں پڑھ سکتا اور معلوم نہیں کیوں منٹو کو اپنے افسانوں میں شعر استعمال کرنے سے ایک طرح کی چڑ سی معلوم ہوتی ہے، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ منٹو کے کرداروں کی دنیا میں زندگی کے تلخ حقائق شعر و شاعری پر غالب آگئے ہیں۔

میں نے منٹو کے جن افسانوں اور کرداروں کا ذکر کیا ہے اُن سے منٹو کے افسانوں کے موضوعات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ موضوع آس پاس کی زندگی ہے۔ اس میں دیہات کی رومان پرور فضا کی جگہ وہ بارونق شہر ہیں جہاں منٹو نے زندگی کو گناہوں میں ڈھلتے دیکھا تھا اور اس طوفان میں اس کی حیثیت اس تماشائی کی سی نہیں تھی جو ساحل سے کھڑا طوفانی لہروں کا مشاہدہ کرتا ہو، وہ خود اس طوفان میں کود پڑا تھا، طوفانی موجوں اور بپھری ہوئی لہروں کا رُخ موڑنے کی طاقت اس کے کمزور جسم اور نحیف بازوؤں میں نہ تھی اس لیے وہ ان موجوں اور لہروں کے ساتھ بہتا چلا گیا اور بالآخر ایک بہت بڑی طوفانی موج نے اسے ایسے ساحل پر پہنچا دیا جہاں کے طوفانوں کا کسی کو پتہ نہیں۔

ابواللیث صدیقی

منٹو کی حقیقت نگاری

منٹو اردو کا سب سے بڑا نہیں، تو بہت بڑا افسانہ نگار ضرور ہے ——— اُس نے بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں اور بہت بُرے بھی۔ — اس کے یہاں بلندی اور پستی، روشنی اور تاریکی، سب سے بہ یک وقت دوچار ہونا پڑتا ہے ——— اس کیفیت کو مجموعی طور پر اس کی خامی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ پستی اور بلندی کا یہ تفاوت فکر و فن کو استواری سے محروم کر دیتا ہے ——— لیکن منٹو کے یہاں اس خامی میں ایک خوبی بھی نظر آتی ہے ——— اور وہ خوبی یہ ہے کہ منٹو نے زندگی کے بُرے اور بھلے، صاف اور کثیف، ہر پہلو کو دیکھا ہے اور اُن میں ہر ایک کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ اُس کے تمام اسرار و رموز کھل جاتے ہیں اور سارے نشیب و فراز آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں ——— منٹو کی خوبی یہ ہے کہ جو باتیں اس کے یہاں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہیں، ان میں بھی زندگی کی حقیقت کا کوئی نہ کوئی رُخ اور اس کی اصلیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے ——— زندگی کے مختلف حقائق تک اس کی نظریں بڑی بے باکی اور دراکی کے ساتھ پہنچتی ہیں اور ان کو پوری طرح نمایاں کر دیتی ہیں ——— منٹو اس اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا ——— اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس کے رنگا رنگ پہلوؤں کو شدت سے محسوس کیا ہے اور اسی لیے انسانی زندگی اور اس کے مختلف حقائق اپنے تمام تنوعات کے ساتھ اس کے افسانوں میں ملتے ہیں ——— اسی کو اُس کی حقیقت نگاری کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت نگاری کا ادبی تنقید میں آج جو صحیح مفہوم ہے وہ پوری طرح تو منٹو کے افسانوں میں نہیں اُبھرتا ——— کیونکہ زندگی کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر جس کو موجودہ دور میں حقیقت نگاری کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، وہ منٹو کے افسانوں میں نہیں ہے۔ منٹو نے زندگی کو دیکھا ضرور ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ان معیاروں اور قدروں کو اس نے اپنے پیش نظر نہیں رکھا ہے، جن کے ہاتھوں نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات کی تشکیل ہوتی ہے ——— اسی لیے منٹو کے افسانوں میں کوئی مخصوص فکر و فلسفہ نہیں ملتا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ زندگی کو کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس کو کس سانچے میں ڈھالنے اور کس شیشے میں اُتارنے کا خواہشمند ہے ——— اس کو منزل کا علم نہیں ہے۔ وہ تو صرف راستے کا ایک مسافر ہے اور سفر ہی کو اپنی منزل سمجھتا ہے ——— منزل سے بے نیازی اور صرف راستے پر گامزن رہنے کی خواہش نے منٹو کو اس کے تمام نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس کے سارے اسرار و رموز اس پر روشن ہو گئے ہیں ——— چنانچہ اس سفر میں زندگی کے اَن گنت پہلو اُس کے سامنے آئے ہیں ——— اس نے ان سب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور انھیں سے اپنے فن کی محفل سجائی ہے ——— زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل اور جزئیات موجودہ افسانہ نگاروں میں جیسی منٹو کے یہاں ملتی ہیں، کسی اور کے یہاں اس کی عشر عشیر بھی نظر نہیں آتیں ——— اسی لیے نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات نہ ہونے کے باوجود اور معیاروں اور قدروں کے نہ ہونے کے باوصف اس نے زندگی کے حقائق کو اس

نے زندگی کے حقائق کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے یہاں خود بخود زندگی پیدا ہوگئی ہے — اس کی زندگی میں جو کچھ بھی ہے، جو کچھ بھی ہو رہا ہے، جو کچھ بھی تھا، جو کچھ بھی ہوتا رہا ہے، منٹو اس تفصیل و جزئیات کو پیش کرنے کا فن کار ہے — یہی اس کی واقفیت ہے — یہی اس کی حقیقت نگاری ہے — یہ جانتے ہوئے بھی کہ حقیقت نگاری کا یہ تصور جدید نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جائے — کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے ماضی اور حال کے حقائق کی تفصیل و جزئیات موجود ہیں۔ مستقبل کا احساس بھی اس میں ہوتا تو اس کی تکمیل ہو جاتی لیکن منٹو نے ماضی اور حال کی مصوری میں جو کمال دکھایا ہے اور اس سلسلے میں جس طرح مختلف رنگوں کی آمیزش سے اپنی پیش کی ہوئی تصویروں میں زندگی کی بجلیاں بھری ہیں، وہ مستقبل کے خیال کو نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے — لیکن ماضی اور حال کے مختلف پہلوؤں سے زندگی کے بے شمار حقائق سامنے آتے ہیں — منٹو نے ان حقائق کو ایک فوٹوگرافر کی طرح پیش نہیں کیا، بلکہ ایک مصوّر کی طرح ان کی تصویریں بنائی ہیں اور مرقعے تیار کیے ہیں — اسی لیے حقیقت نگاری کے موجودہ مفہوم سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہونے کے باوجود منٹو کی یہ ترجمانی حقیقت نگاری معلوم ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جو ترجمانی کی ہے، اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کرنا ایک بہت بڑا دعویٰ ہے۔ بعض کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے — خصوصاً وہ اس سے ذرا بھی متفق نہیں ہو سکتے جو بعض اصول اور نظریات کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک تو زیادہ سے زیادہ ایک واقعیت نگار یا فطرت نگار (NATURALIST) کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بیشتر افسانے ایسے ہیں جن میں اس نے زندگی کو جس طرح دیکھا ہے، بس ہو بہو اسی طرح پیش کر دیا ہے — اپنی طرف سے کوئی خاص بات نہیں کہی ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو منٹو کے افسانوں کے بارے میں یہ خیال پوری طرح صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا خاص میدان واقعیت نگاری رہا ہے۔ زندگی جس روپ میں بھی اس کے سامنے آئی ہے، اس نے ہو بہو اس کو اسی طرح پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کو پیش کرتے ہوئے وہ کھل کر بہت کچھ نہ کہنے کے باوجود کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے — انسان اور انسانیت کی آواز جگہ جگہ۔ اس کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اس زندگی کے سماجی پہلو کا گہرا شعور نہیں رکھتا — اس لیے اس کے یہاں انسان اور انسانیت کی آواز بڑی حد تک صدائے بازگشت (MERE ECHOES) بن جاتی ہے۔ لیکن اس کا احساس اتنا شدید، اس کی نظر اتنی گہری اور اس کا تخیل اتنا بلند ہے کہ وہ اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے بھی زندگی کے سمندر سے حقائق کے موتی نکال ہی لاتا ہے — منٹو کے یہاں اس سلسلے میں بڑی صداقت نظر آتی ہے۔ بڑی ہی جذب و شوق کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ ایسا کرتے ہوئے ان حقائق کو بھی سامنے لاتا ہے جو عام طور پر نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی میں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں — منٹو کے یہاں حقیقت نگاری کا کوئی ایک مخصوص تصوّر نہیں ہے، بہت سے تصورات ہیں — کہیں وہ زندگی کے سماجی اور عمرانی پہلوؤں کو حقائق کے روپ میں دیکھتا ہے، کہیں انسانی زندگی سے عام واقفیت اس کے یہاں حقائق کو رونما کرتی ہے۔ غرض اس کے یہاں مختلف روپ ہیں — اس نے ان حقائق کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے —

مختلف پہلوؤں سے ان پر نظر دوڑاتی ہے ——لیکن ان سب کی تہہ میں انسانی زندگی سے دلچسپی کا ایک خیال ضرور کارفرما نظر آتا ہے۔ یہی انسانی زندگی منٹو کے فن میں حقیقت و واقعیت کا رنگ بھرتی ہے اور اسی کے سہارے اس کا فن حقیقت نگاری سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ منٹو کے افسانوں کا بنیادی محور عام انسانی زندگی ہے۔ اس کے تمام موضوعات اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے تمام خیالات کی بنیاد اسی انسانیت، انسانی زندگی پر استوار ہے۔ منٹو اس دائرے سے باہر نکل کر کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔ ہر حال میں وہ اسی کو اپنے سامنے رکھتا ہے —— انسانیت اس کے نزدیک ترقی سے عبارت ہے۔ اس لیے وہ ہر انسان کو ترقی پسند دیکھنا چاہتا ہے —— اس نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "ادب یا تو ادب ہے ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے، گدھا ہے، مکان ہے، میز ہے، یا کوئی اور چیز ہے۔ کہا جاتا ہے سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے —— یہ کیا بیہودگی ہے۔ سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی بُرائی کا ثبوت دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں یعنی وہ خود ترقی نہیں چاہتے —— میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہش مند رہا ہوں۔" اور ترقی سے اس کی مراد انسان اور انسانیت کی تکمیل ہے —— یہ جذبہ اس کے یہاں برابر کارفرما رہتا ہے —— البتہ اس جذبے کے اس کے یہاں مختلف روپ ہیں —— کہیں انسانیت کا سدھار ہے، کہیں انسانی جذبات کی تہذیب ہے، کہیں انسانی روابط کی اہمیت کا احساس ہے، کہیں انسانی رشتوں کی ضرورت کا خیال ہے —— کہیں انسانی زندگی کی کمزوریاں ہیں، کہیں اس کی خامیاں ہیں، کہیں اس کی بے راہروی ہے، کہیں بے عنوانی ہے —— کہیں اس کی بے بسی ہے، مجبوری ہے —— غرض انسانی زندگی کے ان گنت روپ منٹو نے اپنے افسانوں میں پیش کیے ہیں——

انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرنے میں منٹو کے یہاں جو رنگا رنگی ملتی ہے، وہ بدلتے ہوئے حالات کے شدید احساس کا نتیجہ ہے —— منٹو تبدیلی کے عمل کا قائل ہے۔ وہ تغیر کے قانون پر ایمان رکھتا ہے —— اس کے خیال میں حالات کی یہی تبدیلی ادب اور فن کو تغیرات سے ہمکنار کرتی ہے —— ایک دَور کا ادب دوسرے دَور کے ادب سے اسی لیے مختلف نظر آتا ہے —— اس کے خیال میں حالات کا اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ البالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آسکتی ہیں۔ وہ غنودگی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں جو اُس زمانے کے ادیبوں پر طاری تھی اس زمانے کا شاعر اپنے اصیل مُرغ کی جوانمرگی پر زوردار نظم لکھتا تھا اور بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی جوانمرگی کے نوحے لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اُس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا۔ آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے۔ اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی غیر مطمئن ہے۔ اُس کی بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اُسے ترقی پسندی کہتا ہے۔ کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی —— یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ رہے؟ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے؟ جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں —— عورتیں کبوتریوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور فکر خیز ہیں" —— اس لیے اس نے ان عورتوں کے بارے

میں بھی افسانے لکھے ہیں۔ اور عورت کی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کر دیا ہے — اس سلسلے میں اس کی حقیقت نگاری کا ثبوت یہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر وہ عورت سے متعلق محض جذباتی اور رومانی پہلوؤں ہی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا — اس سے ماورا ہو کر اس کی زندگی کے بڑے ہی تلخ پہلوؤں کی طرف بھی توجہ کرتا ہے — چنانچہ عورت اس کے یہاں طوائف کے روپ میں بھی آتی ہے لیکن یہ طوائف تعیش کا ذریعہ اور وسیلہ نہیں رہتی، ایک بھیانک صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ منٹو اس کی زندگی کے تلخ اور تاریک پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرتا ہے — بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان پہلوؤں پر اُن کی نظر زیادہ پڑتی ہے — اور نسبتاً زیادہ گہرائی کے ساتھ پڑتی ہے۔ منٹو سیدھی سادی باتوں پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کی نظریں دُور تک پہنچتی ہیں۔ اور وہ ٹیڑھی ٹیڑھی باتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی جدت پسند طبیعت چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اہم پہلو تلاش کر لیتی ہے — اس نے خود اس صورتِ حال کو واضح کیا ہے — لکھتا ہے "جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن (قلم) نکالتا ہوں، صرف اس غرض سے کہ لوگ اسے دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے — میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اُس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اُس کے لیے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب میرے پڑوس میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑ کر اور خودکشی کی دھمکی دے کر سینما چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے تک سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اُسے زکام کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا۔ مگر وہ لڑکا میری توجہ کو ضرور کھینچے گا جو ظاہر کرے کہ اس پر سینکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں، لیکن درحقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہے، جتنا بنگال کا فاقہ زدہ باشندہ — اس بظاہر کامیاب عاشق کی رنگین باتوں میں جو ٹریجڈی سسکیاں بھرتی ہوگی، اس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا اور دوسروں کو سناؤں گا — چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے، میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آیا ہے — اُس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اُچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غلاظت، اُس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن اس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں — میں ان کے متعلق لکھتا ہوں۔ اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں، ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں" — گویا انسان کیا ہوتا ہے، حالات اُسے کیا بنا دیتے ہیں، زندگی اُس سے کیا کیا کچھ کراتی ہے، اُسے زندگی کو بسر کرنے کے لیے کن کن راہوں سے گزرنا پڑتا ہے، منٹو کے یہاں ان سب کی طرف توجہ زیادہ ملتی ہے اور اس غیر معمولی توجہ کا سبب یہ ہے کہ وہ زندگی کے مذمومات پر کڑھتا ہے — اس کی ناسازگار حالت پر آنسو بہاتا ہے — اسی لیے زندگی کے اُن پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے اس کے یہاں نشتریت پیدا ہو جاتی ہے — اور اس نشتریت میں حالات کو سدھارنے اور اُن کو کسی نئے سانچے میں ڈھالنے کا ایک دبا ہوا احساس بھی کارفرما رہتا ہے — اور یہی کیفیت اس کے فن کو حقیقت نگاری سے قریب کرتی ہے۔

منٹو زندگی کی تلخیوں اور اس کی خون آشامیوں کا فن کار ہے — اس کی لذتوں اور مسرتوں کا احساس اس کے یہاں نہ

ہونے کے برابر ہے — زندگی کی ناسازگار حالت کے شدید احساس نے منٹو کو ان لذتوں اور مسرتوں کے احساس سے بڑی حد تک محروم کر دیا ہے — وہ مسرتوں کو دیکھتا ضرور ہے۔ لذتیں اُسے ضرور آتی ہیں لیکن زندگی کی بے عنوانیوں کا شدید احساس، ان لذتوں اور مسرتوں سے اُسے محظل نہیں ہونے دیتا — اسی لیے اُس کے افسانے بعض اوقات ناقابلِ برداشت معلوم ہونے لگتے ہیں — لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جن حالات کی ترجمانی اور جس ماحول کی عکاسی وہ کرتا ہے، وہ خود ناقابلِ برداشت ہیں — اس نے خود لکھا ہے "زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اُس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے — مجھ میں جو بُرائیاں ہیں وہ اس عہد کی بُرائیاں ہیں — میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے — میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اُتاروں گا جو ہے ہی ننگی — میں اُسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے" — منٹو نے سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کو ننگا دیکھا ہے — اور اسی لیے اُسے ننگا دکھایا بھی ہے — اسی لیے لوگ اُسے دیکھ کر سٹپٹا بھی جاتے ہیں۔ ان میں گھبراہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے — لیکن اس حقیقت کا وجود اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ سوسائٹی ننگی ہے، تہذیب و تمدن برہنہ ہے — اس کو کپڑے پہنانے کا کام بھی منٹو کو اپنے ذمے لینا چاہیے تھا۔ اس کام کو درزیوں کے سپرد کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے — بہرحال منٹو اس برہنگی کا فن کار ہے — اس لیے زندگی کے مذمومات پر اس کی نظریں بڑی گہری پڑتی ہیں — وہ اس سلسلے کی تمام حقیقتوں کو معلوم کر لیتا ہے — اور اسی کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے یہاں رومانیت نام کو بھی نہیں ہے — اس نے زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کو اپنا مزاج بنا لیا ہے۔ شاید جدید افسانہ نگاروں میں وہ واحد فن کار ہے جس کے مزاج میں رومانیت کا اثر نہیں ملتا — اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو تخیل پرست نہیں ہے وہ جو کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے، اُسی کو اپنے فن کا موضوع بناتا ہے — خارجی حالات کو دیکھ کر جو باتیں اس کے ذہن میں آتی ہیں انھیں کی تفصیل و جزئیات کو پیش کرتا ہے — منٹو نے اپنی طرف سے خیالی دنیائیں قائم نہیں کی ہیں — اپنی طرف سے اس نے بہت کم باتیں کہی ہیں — جو کچھ اُس کی آنکھوں نے دیکھا ہے، وہ اُس کے لبوں پر آ گیا ہے اور اس کی تفصیل اس کے قلم سے افسانوں کی شکل میں ٹپک پڑی ہے — اسی لیے رومانی پہلو اس کے یہاں ذرا بھی نمایاں نہیں ہوتا — وہ شروع سے آخر تک زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کا ترجمان اور عکاس ہی رہتا ہے۔

یہ صورتِ حال منٹو کی بڑائی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ جس وقت اس نے لکھنا شروع کیا ہے، اس کے آس پاس اور گرد و پیش رومانیت کی روایت خاصی مستحکم صورت میں موجود تھی۔ ہر چند کہ اس وقت تک جذباتی رومانیت کی اس تحریک کا خاتمہ ہو چکا تھا جس نے ایک زمانے تک ماورائیت کے گیت گائے تھے۔ لیکن اس کے بعد واقعیت کا جو نیا رجحان پیدا ہوا تھا، اس میں بھی رومانیت کا رنگ خاصا گہرا تھا۔ انقلاب کے تصورات تک اس زمانے میں جذباتی اور رومانی تھے — اس میں لکھنے والوں کے رومانی مزاج اور جذباتی افتادِ طبع کو بڑا دخل تھا۔ اس کے نتیجے میں ان کی واقعیت اور حقیقت بھی رومانیت سے ملی جلی معلوم ہوتی تھی۔ افسانے میں اس رومانیت کے اثرات کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے — پریم چند نے اس رومانی روایت کے بُت کو توڑا تھا لیکن ان کی یہ بُت شکنی بتکدوں کا خاتمہ نہ کر سکی تھی۔

اس زمانے میں بھی رومانیت کی یہ روایت روپ بدل بدل کر اپنے آپ کو مختلف افسانہ نگاروں کے یہاں رونما کر رہی تھی۔ کرشن چندر اور عصمت اس زمانے کے چوٹی کے فن کار تھے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی طرف قدم بڑھایا ضرور ہے لیکن چونکہ رومانیت اُن کے ضمیر میں داخل تھی، اس لیے ان کا فن بھی اس سے اپنا دامن بچا نہیں سکا تھا ——— غرض رومانیت کے اثرات اس وقت تک موجود تھے۔ منٹو نے اس رومانیت کے بُت کو پوری طرح توڑا۔ اس کے مزاج میں رومانیت نہیں تھی ——— اس لیے اس کے اثرات اس کے افسانوں میں بھی نظر نہیں آتے ——— منٹو کا کمال یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بڑے ہی نازک جذباتی معاملات کو پیش کرتے ہوئے بھی وہ جذباتی نہیں ہوتا اس کے یہاں جذبات کی اہمیت کا احساس تو ہے لیکن جذباتیت نہیں ہے ——— اُسے محض تخیل کے دھارے پر بہنا نہیں آتا۔ اسی لیے اس کے یہاں رومانیت کا اثر نہیں ملتا ——— وہ اپنی ذات کو شامل کیے بغیر زندگی میں اُس حقیقت کو دیکھتا ہے جو ایک خارجی وجود رکھتی ہے ——— اسی لیے منٹو کے یہاں حقیقت کا ادراک ہے لیکن اس میں محسوسات کو دخل نہیں ہے ——— برخلاف اس کے گہرا شعور ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ حقیقت منٹو کے یہاں ایک خارجی وجود رکھتی ہے اور وہ حقیقتوں کو اسی طرح دیکھتا ہے۔ اسی لیے اس کے فن میں حقیقت نگاری کے خط و خال اس درجہ نمایاں ہیں۔

منٹو کی حقیقت نگاری کچھ تو زندگی کے شدید احساس اور صحیح شعور کا نتیجہ ہے ——— اور کچھ فرانس اور روس کے بعض حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے گہرے اثرات بھی اس میں شامل ہیں۔ منٹو زندگی اور اُس کے مختلف شعبوں سے قریب رہا ہے۔ اُس نے ان میں سے ہر ایک میں گہری دلچسپی لی ہے ——— اس کی ایک ایک بات کو اس نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ ایک ایک پہلو کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ——— اور اس طرح زندگی کی تمام حقیقتیں اس پر بے نقاب ہو گئی ہیں ——— زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے حقائق سے وابستگی نے منٹو کو بعض اہم حقیقت پسند افسانہ نگاروں کا گرویدہ بنایا ہے ——— اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں منٹو نے روس اور فرانس کے افسانہ نگاروں سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے افسانہ نگاروں کے یہاں اُسے زندگی اور اُس کی حقیقتیں اپنے اصل روپ میں بے نقاب ملی ہیں ——— چیخوف، ترجنیف، ٹالسٹائی، موپاساں، بالزاک اور فلوبیر وغیرہ کے اثرات اس پر بہت گہرے ہیں۔ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کو بہت غور سے پڑھا ہے ——— ایک زمانہ اس پر ایسا گزرا ہے کہ جب اس نے ان افسانہ نگاروں کے بہت اچھے ترجمے بھی کیے ہیں ——— اس لیے ان کی حقیقت نگاری نے منٹو کو براہِ راست متاثر کیا ہے ——— اور جب آگے چل کر اس نے خود افسانے لکھے ہیں تو ان افسانہ نگاروں کے رنگوں کی جھلک خود اس کے فن میں پیدا ہو گئی ہے ——— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کی تقلید کی ہے ——— اس کے یہاں اس سلسلے میں تقلید نہیں بلکہ اجتہاد ہے ——— اس نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنا ایک مخصوص انداز پیدا کیا ہے ——— اس لیے اس کی حقیقت نگاری ترجنیف، چیخوف، موپساں اور بالزاک سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ ان سب کے یہاں حقیقت کی ترجمانی میں ایک دھیما پن ملتا ہے، منٹو کے یہاں اس کے برخلاف ایک تیزی، تندی اور تیکھا پن ہے۔ جس کے اثرات اس کے فن میں ہر جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں ——— منٹو کی حقیقت نگاری اسی تیزی، تندی اور تیکھے پن سے پہچانی جاتی ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں سے ہر ایک نے اپنے فن کے لیے ایک مخصوص میدان تلاش کیا ہے، ایک مخصوص راہ نکالی ہے

منٹو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے افسانوں کا بھی ایک مخصوص میدان ہے۔ اس نے بھی اپنے فن کے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ منٹو کا یہ میدان دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح محدود نہیں ہے —— موضوعات کے تنوع سے اس نے اس میدان میں وسعت پیدا کی ہے۔ منٹو زندگی کا فن کار ہے اور زندگی تنوع سے عبارت ہے —— اس لیے اس کے افسانوں کے موضوعات میں زندگی ہی کی طرح تنوع نظر آتا ہے —— منٹو نے زندگی کے سماجی اور عمرانی معاملات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ عام انسانی مسائل کو سلجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ نفسیاتی حقائق پر روشنی بھی ڈالی ہے —— غرض اس کے یہاں زندگی کے تمام پہلو اپنی ساری رنگا رنگی کے ساتھ بے نقاب نظر آتے ہیں —— منٹو نے ان سب کی تفصیل و جزئیات کو گہرے مشاہدے کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان سب کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ اس کا زاویۂ نظر انسانی رہا ہے۔ منٹو کے یہاں اس انسانی زاویۂ نظر کے مختلف روپ ہیں۔ اور اس کے ہر افسانے میں اس کا کوئی نہ کوئی روپ ضرور دکھائی دیتا ہے —— منٹو نے اپنے افسانوں کے مختلف اور متنوع موضوعات کی بنیادیں اسی انسانی زاویۂ نظر پر استوار کی ہیں —— یہ انسانی زاویۂ نظر منٹو کے یہاں زندگی کے عام حقائق کی ترجمانی اور عکاسی میں ممد و معاون ہوتا ہے اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری اس کو اپنے وجود کے لیے ایک سہارا بنا لیتی ہے۔

یہ بات کسی قدر عجیب ضرور ہے کہ منٹو کے فن نے سیاسی انتشار اور معاشی افراتفری کی آغوش میں آنکھ کھولنے کے باوجود، ان معاملات کی طرف ایسی کچھ زیادہ توجہ نہیں کی —— وہ سیاسی اور سماجی اقدار کی ناہمواری کا احساس رکھتے ہوئے بھی ان معاملات سے متعلق کوئی بڑی گہری باتیں نہیں کہہ سکا ہے —— صرف جگہ جگہ چند تاثرات کا اظہار ہے —— ان تاثرات میں کسی قسم کی کوئی گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ ماحول کی ایک تصویر ضرور سامنے آجاتی ہے۔ حالات کا ایک نقشہ ضرور آنکھوں میں پھر جاتا ہے —— جستہ جستہ تو یہ کیفیت منٹو کے بہت سے افسانوں میں مل جاتی ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں اس کے افسانے "نیا قانون" اور "نعرہ" ایک نمایاں حیثیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ ان میں گہرا سیاسی اور سماجی شعور تو نہیں ہے۔ لیکن ان کو پڑھنے کے بعد یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اپنے زمانے کے بعض حالات نے منٹو کو متاثر ضرور کیا ہے —— انھیں تاثرات کا اظہار ان افسانوں میں ملتا ہے —— اور یہ تاثرات محض بعض حالات کی عکاسی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں —— اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔

"نیا قانون" یوں دیکھیے تو ایک کوچوان اُستاد منگو کے بعض خیالات اور چند حرکات و سکنات سے متعلق ایک کہانی ہے، لیکن ان سب کو پیش کرتے ہوئے منٹو نے اس زمانے کی سیاسی حالت کی ایک تصویر بھی بنائی ہے —— اور سیاسی حالت نے جس کشمکش کو پیدا کیا ہے اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس سے اس کشمکش کا کوئی حل بھی نکل سکے —— منٹو کی پرواز اس حد تک نہیں ہے۔ اس کی نظر تو صرف کشمکش میں کھو کر رہ جاتی ہے —— لیکن ویسے اس کیفیت کی ترجمانی اُس نے بڑی ہی چابکدستی سے کی ہے۔ دراصل وہ دکھانا یہ چاہتا ہے کہ اُستاد منگو جس کو سب نہایت عقلمند آدمی سمجھتے ہیں، ایک ہونے والی سیاسی تبدیلی کو سمجھتا نہیں۔ اس کا فریب کھاتا ہے —— یہ نہیں جانتا کہ حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اُسے جیل خانے کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ اُستاد منگو کا یہ خیال تھا کہ پہلی اپریل کو جو نیا قانون نافذ ہونے والا ہے اور زندگی کے انداز کو بدل دے گا۔ اس لیے وہ خوش تھا کہ "نیا قانون" اُسے انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا دے گا —— کیونکہ اُستاد منگو کو انگریزوں سے

بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب وہ یہ تبلایا کرتا تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکّہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اُس کے تنفّر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے ——— اسی لیے وہ اکثر کہتا "قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آگیا ہوں ——— جب کبھی اُن منحوس چہرہ دیکھتا ہوں، رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے" ——— نئے قانون کے ساتھ استاد منگو کے دل میں صرف غلامی سے چھٹکارے ہی کا خیال نہیں آیا، یہ لہر بھی اُٹھی کہ مارواڑیوں اور ان کے سود پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ اور اس کے بعد وہ غریبوں کا خون نہیں چوس سکیں گے غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ——— نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہو گا ——— اور پھر یہ بات بھی اس کے ذہن میں آئی کہ اس کے بعد روس کا بادشاہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرکے رہے گا ——— اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سُنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا۔ اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا ——— نئے قانون کی اہمیت اس کے دل میں اور بھی بڑھ گئی جب اُس نے دو گریجویٹ طالب علموں کی زبانی یہ سُنا کہ جو بیکار گریجویٹ مارے مارے پھر رہے ہیں، ان میں کچھ تو کمی ہو گی ——— لیکن پہلی اپریل کو ہوا یہ کہ نیا قانون تو نافذ ہو گیا لیکن زندگی نہ بدل سکی، نظام تبدیل نہ ہو سکا اور اُستاد منگو کو اس حقیقت کا احساس اس وقت ہوا جب چھاؤنی میں ایک گورے کو پیٹنے کے سلسلے میں اُسے جیل خانے کی ہوا کھانی پڑی ——— وہ سمجھتا تھا کہ نئے قانون کے تحت حالات بدل چکے ہیں اس لیے اپنے دل کی بھڑاس نکالی جا سکتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ پولیس آئی تو وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہا لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور اُس کو حوالات میں بند کر دیا ——— اس مختصر سی کہانی میں کئی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ ہندوستانی عوام کی انگریز سے نفرت، تبدیلی کی خواہش، آزاد ہونے کا خیال، سرمایہ داروں کی دست درازی، اشتراکی نظام کی استواری، تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری۔ سب اپنی اپنی جگہ پر حقیقتیں ہیں ——— منٹو نے ان کی ترجمانی خوبی سے کی ہے ——— ہر چند کہ ان حقیقتوں کے پیش کرنے میں کوئی بہت واضح سیاسی نقطۂ نظر نہیں ہے لیکن جو حالات ہیں ان کی عکاسی ہی نے اس کو حقیقت نگاری کی سرحدوں میں داخل کر دیا ہے۔

منٹو سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ معاشی اقتدار کی ناہمواری کے باعث پیدا ہونے والی اُلجھنوں اور پریشانیوں کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے ——— بہت سے افسانوں میں اس کی طرف اشارے ہیں ——— لیکن "نعرہ" میں اس نے اس صورتِ حال کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ "نعرہ" ایک ایسے شخص کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کی کہانی ہے جو افلاس کا شکار ہے اور جس کو موجودہ سماجی نظام اقتدار میں مفلسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی راہ نکلتی ہوئی نظر نہیں آتی ——— کیشو لال کی مفلسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی کھولی کا کرایہ تک ادا نہیں کر سکتا، اور جب اس کھولی کا مالک اس سے دو مہینے کا بقایا کرایہ طلب کرتا ہے تو اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ وہ گھبرا جاتا ہے پریشان ہو جاتا ہے اور زمانے نے مختلف اوقات میں اس کے دل پر جو زخم لگائے ہیں وہ سب کے سب ہرے ہو جاتے ہیں ——— کل کے تمام دُکھ درد اُس کے لیے آج کی تکلیفیں بن جاتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیتا ہے ——— وہ سوچنے لگتا ہے اور تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ سوچتا ہے ——— اور اس کی نظریں اپنے گھر کے اندھے لیمپ کو کئی بار بجلی کے اس

بلب سے ٹکراتے ہوئے دیکھتی ہیں جو مالک مکان کے گنجے سر پر مسکرا رہا تھا۔ کبھی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اُس کے میلے بدن پر چمٹ جاتے ہیں جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔ کبھی بار اُسے ان داتا بھگوان کا خیال آتا ہے جو بہت دُور نہ جانے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے ۔ اسی حالت میں مکان دار اُسے گالی دیتا ہے —— اور یہ گالی اس کے دل میں کچھ اور بھی ہنگامہ برپا کر دیتی ہے —— وہ اسے پی جاتا ہے لیکن اُس کے جی میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریاں بھرے چہرے پر تھوک دے۔ مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اُس کا غرور تو بارہ فٹ پاتھ پر پڑا ہے —— غرض اس کا دماغ ان گنت خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے —— وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ غریب ہے، اسی لیے اُسے گالی دی گئی ہے اور اسی لیے اُسے یہ گالی سُننا پڑی ہے —— اگر اس کا راج ہوتا تو وہ اس سیٹھ کو مزہ چکھا دیتا جو اُسے اُوپر تلے دو گالیاں سُنا کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گدّے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر باہر پھینک دیے ہیں —— سچ مچ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ بلبلا اُٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھر کر ہنسو، اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دُکھنے لگتا —— پر اس وقت اُسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی —— کیوں؟ —— وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپا مار سکتا تھا۔ اُسے کس بات کی رکاوٹ تھی؟ —— رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سُن کر خاموش رہا —— لیکن اس کے سوچنے کے عمل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکی اور اس نے کہیں تڑتڑ گولیاں چلتی ہوئی دیکھیں، کہیں اُسے آگ کا ایک چکر نظر آیا جو گھومتے گھومتے شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گئی جو اُس کے آگے آگے زمین پر اُچھلنے کودنے لگی —— وہ سڑک پر چلتا رہا —— اور سڑک پر چلتے ہوئے اُسے انتقام کا خیال بھی آیا —— انتقام کا خیال آتے ہی اُسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور اُس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی —— لہو —— لہو —— اُسے آسمان زمین سب لہو میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے —— لہو —— اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں سے بھی لہو نچوڑ سکتا تھا —— لیکن انتقام اس کے بس میں نہیں تھا۔ اُس کی اس ذہنی کیفیت نے بہت سے حقائق اس پر روشن کیے —— اپولو بندر اور گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے جب اُس نے بہت سی موٹریں قطار اندر قطار کھڑی دیکھیں تو اُس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گِدھ، پَر جوڑے کسی لاش کے اِرد گِرد بیٹھے ہیں" —— ان حقائق پر غور کرتا ہوا انتہائی کرب کے عالم میں وہ ایک عالیشان ہوٹل تک پہنچا —— اور وہاں پہنچ کر بے اختیار اس کے حلق سے ایک نعرہ نکلا —— کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم لاوے کی مانند نکلا —— ہیئت تیری —— اسے یقین تھا کہ اس نعرے سے ہوٹل کی عمارت زمین پر آجائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ایک شخص جس نے اس نعرے کو سُنا اپنی بیوی سے کہنے لگا —— "پگلا ہے" —— منٹو نے اس افسانے میں مفلسوں کی زبوں حالی اور اس زبوں حالی کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی حقیقت سے بڑی بھرپور تصویر بنائی ہے۔ منٹو اس نظام میں ایک فرد کی بے بسی کو بڑے غور سے دیکھتا ہے اور اس بے بسی کو پیش کر کے اس نظام کے تضاد کو واضح کرتا ہے۔ جگہ جگہ اس میں عمل کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں —— انقلاب کا خیال بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ایک نئے نظام کی تمنا بھی اپنے آپ کو کہیں کہیں رونما کرتی ہے لیکن ان سب باتوں کی تان ایک احساسِ شکست ہی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ منٹو اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے، کیونکہ موجودہ

نظام کے ہاتھوں یہی بات ایک حقیقت بن گئی ہے —— اسی لیے منٹو کے یہاں ان معاملات کو پیش کرتے ہوئے کوئی جارحانہ انداز پیدا نہیں ہوتا —— اس کے کردار عمل اور انقلاب کے بارے میں سوچتے ضرور ہیں لیکن کچھ کر نہیں پاتے —— حالات نے انھیں بے بس بنا دیا ہے —— منٹو اسی لیے زندگی کے ان پہلوؤں کا صرف عکاس بن کر رہ جاتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھتا —— لیکن اس کی یہ عکاسی بے مقصد نہیں ہوتی —— اس عکاسی میں قدم قدم پر وہ کچھ کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زندگی کو سدھارنے کا پیام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے —— اور اسی خصوصیت کا سہارا لے کر حقیقت نگاری اس کے فن میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔

روسی افسانے میں حقیقت نگاری کے جو مختلف روپ ملتے ہیں، ان کے اثرات منٹو کے فن پر گہرے ہیں —— چیخوف اور گورکی سے خاص طور پر وہ متاثر ہوا ہے۔ گورکی کے یہاں زندگی کے نظام اقدار کا جو واضح اور گہرا شعور ملتا ہے، وہ منٹو کے یہاں نسبتاً کم ہے۔ اسی لیے وہ گورکی کے مقابلے میں چیخوف کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ گورکی کے یہاں زندگی کا تجزیہ ہے، چیخوف کے یہاں اس کی عکاسی ہے۔ منٹو کا ایک افسانہ "شغل" ہے جو میکسم گورکی کی یاد میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں منٹو نے گورکی کے مشہور افسانے (TWENTY SIX MEN AND A GIRL) کی تکنیک استعمال کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں گورکی کی حقیقت نگاری کا انداز پیدا نہیں ہوتا —— اس کا موضوع بھی بہت پامال ہے —— کچھ مزدور ہیں جو صبح سے شام تک ایک پہاڑی سڑک پر کام کرتے رہتے ہیں —— روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتے رہنا ان کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسی طرح وہ اپنا پیٹ پال سکتے ہیں۔ ایک دن اس سڑک پر ایک موٹر آئی۔ اس میں سے ایک نوجوان نکلا —— اور وہ سنتو چمار کی لڑکی رام دئی کو لے کر گم ہو گیا —— بعض مزدور اس واقعے کی تہہ تک پہنچ گئے۔ بعضوں نے اس سے چشم پوشی کی۔ وہ پنڈت جس نے رام دئی کو اس نوجوان کے ساتھ بٹھا دیا تھا۔ اُس نے مزدوروں کے اضطراب کو دیکھ کر صرف یہ بات بتائی کہ میں نے ان سے دریافت کیا ہے کوئی بات نہیں۔ وہ لڑکی کو ذرا مری کی سیر کرانا چاہتے تھے۔ انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں —— تھوڑی دُور لے جا کر چھوڑ دیں گے —— امیر آدمی ہیں، ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں —— یہ سُن کر یہ کام کرنے والے دیر تک خدا معلوم کن باتوں میں غرق رہے کہ دفعتہً فضل کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔ دو مرتبہ زور سے تھوک کر اُس نے اپنے ہاتھوں کو گیلا کیا اور بیلچے کو سنگریزوں کے ڈھیر میں گاڑتے ہوئے کہا۔ "اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کا اللہ بیلی ہے" جیسا کہ اس افسانے سے ظاہر ہے یہ سپاٹ ہے۔ اس میں ایک سماجی بدحالی کا تذکرہ ضرور ہے لیکن کسی گہرائی کے ساتھ اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اسی لیے اس میں وہ تیکھا پن پیدا نہیں ہو سکا ہے جو منٹو کے بعض دوسرے افسانوں میں ملتا ہے —— لیکن بہرحال اس افسانے کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایسی باتیں ایک غلط سماجی نظام میں عجیب نہیں ہیں۔ منٹو اس افسانے میں اسی حقیقت کو پیش کرنا چاہتا ہے —— اس کے اظہار میں نشتریت نہ سہی لیکن سماجی زندگی کے ایک تاریک پہلو کا اظہار تو ہے —— اسی لیے اس حقیقت کے اظہار میں گورکی سے کہیں زیادہ چیخوف کی آواز سنائی دیتی ہے —— اس میں وہ سادگی اور دھیما پن ہے جو چیخوف کے ساتھ مخصوص ہے —— وہ گہرائی، نشتریت اور تیکھا پن نہیں جس سے گورکی کی حقیقت نگاری پہچانی جاتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منٹو کی سماجی حقیقت نگاری، نشتریت اور تیکھے پن سے یکسر خالی ہے۔ ایسا نہیں ہے — منٹو کے یہاں گہرائی کا احساس البتہ کم ہوتا ہے، لیکن نشتریت اور تیکھا پن اس کی سماجی حقیقت نگاری میں جگہ جگہ اپنا اثر دکھاتے ہیں اور یہ صورتِ حال اس وقت اس کے افسانوں میں خاص طور پر پیدا ہوتی ہے جب وہ انسانی زندگی کے حد درجہ تاریک پہلوؤں کی پردہ دری کرتا ہے۔ جب وہ انسانیت کے جسم پر سڑتے ہوئے زخموں کو بڑی بے رحمی سے کریدتا ہے۔ اس خیال سے کہ افراد کو ان زخموں کی اصلی حالت کا صحیح اندازہ ہو — اور منٹو کی حقیقت نگاری کے جوہر یہیں کھلتے ہیں — یہاں وہ اصل حقیقت کو دکھلانے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کہتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے — اس سلسلے میں اس کے سب سے اچھے افسانے وہ ہیں جو اُس نے طوائفوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لکھے ہیں — اور جن میں اس نے ان حقیقتوں کو واضح کیا ہے کہ طوائف انسانی زندگی کے خوشنما چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔ وہ ایک ایسا ناسور ہے جو سالہا سال سے رِس رہا ہے — اس ناسور کو دکھاتے ہوئے منٹو نے طوائف کو ایک انسانی مخلوق کی طرح دیکھا ہے۔ اسی لیے وہ اس کی مسرتوں، اس کے غموں، اس کی حسرتوں، اس کی ناکامیوں اور اس کی مایوسیوں کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے۔ منٹو کے ایسے افسانوں کو پڑھ کر طوائف سے ہمدردی اور غلط نظامِ اقدار سے گھن اور نفرت کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہیں سے منٹو کی کامیابی کی حد شروع ہوتی ہے — اس موضوع پر منٹو نے یوں تو بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن ہتک، ہوشیار، کالی شلوار اور پہچان اس رجحان کے سب سے اچھے نمونے ہیں — منٹو نے ان افسانوں میں اپنی مخصوص حقیقت نگاری کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔

'ہتک' سوگندھی کی کہانی ہے — وہ سوگندھی جو ایک طوائف بھی ہے اور ایک عورت بھی — بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جو طوائف ہوتے ہوئے بھی ایک عورت ہے جس کو عورت بننے کی تمنا ہے لیکن حالات جس کو طوائف ہی رہنے دیتے ہیں اور وہ ہمیشہ ایک طوائف ہی رہتی ہے — سوگندھی دس روپے میں اپنا جسم بیچتی تھی جس میں سے ڈھائی روپے اُسے رام لال دلال کو دینے پڑتے تھے — سوگندھی اپنے کام میں بڑی ہوشیار تھی — اُسے بے شمار گر یاد تھے — عام طور پر وہ یہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی — "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اُس سے خوب شرارتیں کرو، اَن گنت باتیں کرو، اُسے چھیڑو، ستاؤ، اُس کے گدگدی کرو۔ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اُس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو، پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ — اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے — وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی — ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہوں، بڑے خطرناک ہوتے ہیں — ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے" — غرض اس میں طوائف کی تمام خصوصیات موجود تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک جذباتی عورت بھی تھی اُسے بے شمار گُر مردوں کے ٹھیک کرنے کے لیے یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت باقی رہ جایا کرتی تھی۔ ہر روز اس کا پُرانا یا نیا ملاقاتی اُس سے کہا کرتا تھا۔ سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں — اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اُس سے پریم کیا

جارہا ہے —— پریم کتنا سندر بول ہے —— یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے —— اس نے چار مردوں سے اس پریم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا —— اور ان کی تصویریں اپنے سامنے لٹکا لی تھیں۔ لیکن یہ مرد اس کے نہ ہو سکے۔ انھوں نے سوگندھی کو ایک طوائف ہی سمجھا —— ایک زمانے میں مادھو کی باتوں نے اس پر بڑا اثر کیا تھا —— مادھو پونا میں حوالدار تھا —— اور اس حوالدار کی میٹھی باتیں سُن سُن کر وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی —— مادھو ہر ہفتے پونا سے آتا اور میٹھی میٹھی باتیں کرکے اُسے خوب سہانے سپنے دکھایا کرتا —— لیکن کبھی بھی وہ سوگندھی کے کام نہ آیا۔ اس سے کچھ نہ کچھ لے مرتا تھا —— اور وہ دے دیتی تھی —— ایک دن مادھو نے سوگندھی سے پچاس روپے طلب کیے۔ اس بہانے سے کہ اس پر کوئی کیس ہوگیا ہے اور یہ رقم اُسے داروغہ کو دینی ہے —— سوگندھی کا کاروبار جاری تھا لیکن اب اس کی گرم بازاری نہیں تھی —— چند روز ہوئے ایک سیٹھ بڑی مشکل سے اُس کے پاس آیا تھا اور ٹارچ کی روشنی میں اُس کے چہرے کو دیکھ کر اُسے ناپسند کرکے رخصت ہوگیا تھا، گویا اس نے سوگندھی کی ہتک کی تھی —— سوگندھی پر اس واقعے کا گہرا اثر تھا —— چنانچہ جب مادھو نے پچاس روپے کا سوال کیا تو اسے کچھ اس بات کا احساس ہوا کہ مادھو اُسے بیوقوف بنا رہا ہے —— چنانچہ اُس نے اُسے خوب آڑے ہاتھوں لیا —— کھری کھری سنائیں۔ اور اس کے خارش زدہ کتے نے مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا —— اور جب مادھو چلا گیا تو سوگندھی نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اُٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اُسے پہلو میں لٹا کر سوگئی ——"

منٹو نے اس کہانی میں طوائفوں کے ماحول کی ہو بہو تصویر کھینچی ہے اور اُس کی نفسیات کا زندگی سے جو بھرپور نقشہ بنایا ہے، اس میں قدم قدم پر حقیقتوں کے پیکر اُبھرتے ہیں —— طوائف بہرحال ایک عورت ہوتی ہے لیکن طوائف کو عورت ہونے کے باوصف ایک طوائف ہونا پڑتا ہے —— حالات اُسے ایسا کرنے کے لیے مجبور کرتے ہیں —— اس سے بڑی حقیقت اور کیا ہوسکتی ہے؟ —— اس کہانی میں سوگندھی کی زندگی، اس کے جذبات و احساسات، رام لال دلال سے اس کے روابط، اپنی ہم پیشہ عورتوں سے اس کی ہمدردی، سیٹھ کے ہاتھوں ہونے والی اس کی ہتک، ایک چھوڑ چار مردوں کے بارے میں اس کی غلط فہمی، لیکن اس حقیقت کو معلوم کرنے کے بعد مادھو سے اُس کی سخت کلامی، ان سب باتوں میں حقیقت کی جھلکیاں موجود ہیں —— منٹو نے اس میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کیا ہے —— صرف حالات، فضا اور ماحول کے بعض ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا ہے جن سے اس کی زندگی کی بعض بڑی ہی اہم حقیقتیں ذہن نشین ہوتی ہیں —— منٹو نے اپنی حقیقت نگاری کا ہیولا بڑی حد تک انھیں حقیقتوں سے تیار کیا ہے۔

خوشیا کا موضوع ہتک سے ذرا مختلف ہے لیکن ماحول یہی ہے، اور منٹو نے اس افسانے میں بھی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے جو حقیقت پر مبنی ہیں —— کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ کانتا پیشہ کرتی تھی اور خوشیا اس کا دلال تھا —— ایک دن خوشیا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے کانتا کی کھولی میں داخل ہوکر اُسے بالکل برہنہ دیکھا۔ وہ اس پر گھبرا گیا لیکن کانتا نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اور یہ کہہ کر اس کی حیرت کو دُور کرنے کی کوشش کی "جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا حرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو......" —— اس بات نے خوشیا کی حیرت کو تو کسی حد تک دُور کر دیا لیکن

اس فقرے میں اس نے بہت سے مطلب کریدنے شروع کر دیے۔ لیکن وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اور اس کو ایک اُلجھن سی رہی۔ دس برس کی دلاّلی کے عرصے میں وہ ایسے واقعے سے کبھی بھی دوچار نہیں ہوا تھا — اس لیے اس ننگی عورت کو دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہے۔ اس کے جذبات میں ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی — اور کانتا کے جسم کے خطوط نے اس کے دل میں اس خیال کو بیدار کیا کہ کانتا دس روپے میں مہنگی نہیں ہے — انھیں خیالات میں محو وہ گھر پہنچا اور اپنے آپ کو خوب سجایا بنایا، نئی دھوتی پہنی، بالوں میں کنگھی کی، داڑھی منڈوائی — اور پھر ایک ٹیکسی لی — ٹیکسی لے کر وہ ایک اور دلاّل کے ساتھ کانتا کے گھر پہنچا — دلاّلی معاملہ طے کر کے کانتا کو ٹیکسی میں لے آیا — اور جب وہ ٹیکسی میں داخل ہوئی تو سامنے خوشیا کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے کہا "خوشیا تم" — خوشیا نے جواب دیا "ہاں میں — لیکن تمھیں روپے مل گئے ہیں نا؟ — خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی۔ "دیکھو ڈرائیور — جوہو لے چلو" — اس واقعے کے بعد خوشیا پھر اس بازار میں نظر نہ آیا — اس افسانے میں منٹو نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مرد بھی ہر حال میں مرد ہوتا ہے — دلاّل تک اس سے مستثنےٰ نہیں ہوتے۔ خوشیا کے کردار میں اس نے ایک ایسے مرد کو دیکھا ہے جس کے جذبات دس سال کی دلاّلی کے بعد بھی سرد نہیں ہوئے ہیں۔ اور جو ایک زمانے تک کانتا کی دلاّلی کرنے کے بعد خود اس کی نسائیت کا شکار ہو جاتا ہے — زندگی کی اس بنیادی حقیقت سے کس کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے؟

منٹو کی ایک اور کہانی "پہچان" بھی طوائفوں سے متعلق ہے لیکن اس میں ایسی طوائفوں کا ذکر ہے جو بازار میں نہیں اپنے گھروں میں پیشہ کرتی ہیں۔ منٹو نے ان پیشہ ور عورتوں کی زندگی کی ساری زبوں حالی اور اس کے سارے کرب کو اس افسانے میں مجسّم کر دیا ہے — چار دوست شراب سے سرشار ہو کر یوں تو تفریح کی غرض سے عورت کی تلاش میں نکلتے ہیں لیکن چار جگہ جانے کے بعد بھی انھیں تفریح کی جگہ تنغض حاصل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تانگے والا انھیں "میموں" کے یہاں لے جاتا ہے — ایک ایسی جگہ جہاں کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا — اور جہاں انھیں دو کالی بھجنگی انتہائی بدصورت عورتیں نظر آئیں اور جن کو دیکھ کر ان دوستوں میں سے ایک نے کہا "کیا لذیذ ٹافیاں ہیں!" — یہ بات سن کر میموں میں سے ایک جس کا سیاہ چہرہ سُرخی لگانے کے باعث زیادہ پکی ہوئی اینٹ کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا، ہنسی — یہ لوگ بھی ہنس دیے — اور ان دوستوں میں سے ایک نے پوچھا "کیا نام ہے آپ کا؟

بولی — "لُوسی"۔

دوسرے دوست نے آگے بڑھ کر پوچھا — "آپ کا"۔

اُس نے جواب دیا "میری"۔

تیسرا بھی آگے بڑھ آیا — "کیوں صاحب آپ کیا کام کرتی ہیں؟"

دونوں لجا گئیں — ایک نے ادا سے کہا — "کیسا بات کرتا ہے تم؟"

دوسری نے کہا — "چلو جلدی کرو — رہنا مانگتا ہے یا نہیں۔ ہمیں روٹی پکانا ہے"۔

اور ان لوگوں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ گیلے آٹے سے بھرے ہوئے تھے اور وہ اس کی مروڑیاں بنا رہی تھی۔

—— تانگے والا قطعی طور پر غلط سمجھ کر انھیں یہاں لے آیا تھا۔ مروڑیاں اُس عورت کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اُس کے آنسو ہیں —— اس منظر سے تنگ آ کر وہ لوگ وہاں سے چل دیے۔ اور اس کے بعد تانگے والا انھیں ایک پنجابن گلزار کے یہاں لے گیا جو بڑی ہی خوفناک عورت تھی —— وہاں سے یہ لوگ اُلٹے پاؤں واپس ہوئے —— اور پھر انھیں تانگے والا ایک میلے کچیلے گھر میں لے گیا جہاں ایک بڑھیا چولہا جھونک رہی تھی —— یہ سب اس مکان میں اندر جا کر بیٹھ گئے۔ اور وہاں انھیں ایک ٹھنگنی سی کم عمر لڑکی نظر آئی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چلی ہوئی گاڑی ہے جو اب ایک دم رک گئی ہے۔ اس کے پہیّوں میں بہ یک لگ گئے ہیں اور وہیں کھڑے کھڑے اُس کا سارا رنگ روغن دھوپ اور بارش میں اُڑ گیا ہے۔ اس عمر میں بھدّی سے بھدّی لڑکی کے جسم میں جو ایک قسم کی شوخ جاذبیت ہوتی ہے، اُس میں بالکل نہیں تھی —— کپڑوں کے باوجود وہ ننگی دکھائی تھی —— بہت ہی بیہودہ اور نامناسب طریقے پر ننگی —— اس کے جسم کا نچلا حصّہ قطعی طور پر غیر نسوانی تھا —— یہاں سے بھی یہ لوگ جان چھڑا کے بھاگے —— تانگے والے نے یہی کہا "بابوجی آپ کو پہچان نہیں" —— اور یہ کہہ کر اس نے کرایے کے روپے جیب میں ڈالے اور —— 'ساون کے نظارے ہیں' گاتا ہوا چلا گیا —— اس افسانے میں زندگی کے متضاد پہلوؤں کو دکھا کر منٹو نے حقیقت کو واضح کیا ہے —— ایک طرف تفریح اور عیاشی کا خیال اور اس کی جستجو و تلاش ہے لیکن اس کا حصول بے معنی ہے کیونکہ جس ماحول میں اس کو تلاش کیا جا رہا ہے، اس میں ایک کرب کی سی کیفیت ہے —— جہاں بھی یہ لوگ پہنچتے ہیں وہاں منٹو کی نظریں گندگی اور ناپاکی کو دیکھتی ہیں، لالٹینوں کی اندھی روشنی میں بڑی مشکل سے انھیں راستہ ملتا ہے —— ساتھ ہی ہر جگہ آٹا گندھا ہوا اور روٹی پکتی ہوئی نظر آتی ہے —— کہ اسی کے لیے یہ سارا کاروبار چلتا ہے —— منٹو اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے —— اور اسی لیے کالی عیسائی عورت کے ہاتھوں سے آٹے کی جو مروڑیاں کچے فرش پر گرتی ہیں، ان کو دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اُس کے آنسو ہیں۔

اسی طرح کالی شلوار میں بھی اس نے زندگی کے انھیں پہلوؤں میں سے ایک پہلو کی تصویر کشی کی ہے —— 'کالی شلوار'، سوگندھی اور کاننا ہی کی طرح ایک طوائف سلطانہ کی کہانی ہے۔ سلطانہ پہلے انبالے میں پیشہ کرتی تھی۔ وہاں اس کے دلّال خدا بخش نے چند گوروں کو اس کا مستقل گاہک بنا لیا تھا لیکن پھر نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اُس نے سلطانہ سمیت دلّی منتقل ہونے کا ارادہ کر لیا سلطانہ تیار ہو گئی اور وہ دونوں دلّی آ گئے۔ لیکن دلّی میں ان کا کاروبار نہ چلا —— سلطانہ کی چوڑیاں تک بک گئیں۔ پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔ محرم کا مہینہ آیا تو سلطانہ کو ایک کالی شلوار بنانے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ اس کی پڑوسنوں میں انوری اور مختار نے بھی محرم کے موقع پر کالے کپڑے پہننے کا اہتمام کیا تھا —— خدا بخش اس سلسلے میں کوئی مدد نہ کر سکا —— ایک شخص شنکر نامی ایک دن سلطانہ کے یہاں آیا۔ اس کو دیکھ کر سلطانہ کی باچھیں کھل گئیں لیکن وہ اچھا گاہک ثابت نہ ہوا —— دوسری دفعہ جب وہ آیا تو سلطانہ نے اس سے کالی شلوار لانے کی فرمائش کر دی۔ شنکر نے کہا کہ وہ کوشش کرے گا اور چلتے وقت سلطانہ کے بُندے مانگے جو اس نے اتار کر اُسے دیے —— محرم کی پہلی تاریخ کو شنکر آیا اور ایک اخبار میں لپٹی ہوئی اس کے پاس کالی شلوار تھی —— شنکر نے کہا "یہ ساٹن کی شلوار ہے دیکھ لینا لمبی نہ ہو۔ اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا —— سلطانہ نے اخبار ہٹا کر دیکھا تو اُسے ساٹن کی شلوار نظر آئی۔ ایسی ہی شلوار جو اس نے

انوری کے پاس دیکھی تھی —— محرم کے موقع پر سلطانہ نے یہ شلوار پہنی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور انوری داخل ہوئی —— اور اس نے کہا کہ شلوار تو بالکل نئی معلوم ہوتی ہے —— اس پر سلطانہ نے جواب دیا۔ "آج ہی درزی لایا ہے" —— یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں "یہ بُندے تم نے کہاں سے لیے۔" انوری نے جواب دیا۔ "آج ہی منگوائے ہیں" —— دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا —— اس کہانی میں بھی منٹو نے طوائف کی زندگی کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے۔ اس کی کس مپرسی اور زبوں حالی کی پوری تصویر اس کہانی سے آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے —— اس کی ہر بات اور ہر پہلو میں زندگی کی سنگین اور مخصوص حقیقتوں کا احساس ہوتا ہے۔

منٹو نے ان موضوعات پر اور بھی افسانے لکھے ہیں لیکن حقیقت نگاری کا جو کمال ان چار افسانوں میں ملتا ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آتا۔ ان افسانوں میں طوائف کے ذکر کے ساتھ کسی قسم کی لذت، کسی طرح کی جنسی تسکین یا جسمانی آسودگی کا خیال نہیں پیدا ہوتا —— اسی لیے طوائف منٹو کے یہاں دلچسپی کا سامان باقی نہیں رہتی۔ برخلاف اس کے انسانیت کے جسم پر ایک ناسور کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ منٹو طوائف کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لیے اس کے یہاں طوائف کی زندگی سے متعلق تاریک پہلو نسبتاً زیادہ نظر آتے ہیں —— منٹو ان پہلوؤں کی وضاحت بہت تفصیل سے کرتا ہے۔ یہ تفصیل ایک طرف تو گھن کا احساس پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف اس سے ہمدردی کا خیال بیدار ہوتا ہے —— گھن تو اس ماحول سے پیدا ہوتی ہے، جس میں گندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور ہمدردی کے خیال کو وہ حسرتیں اور مایوسیاں بیدار کرتی ہیں، جن کا اس ماحول کے افراد کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ —— منٹو کی حقیقت بین نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ طوائف پیٹ کی خاطر انسانیت کی سطح سے نیچے گرنے کے باوجود اپنا پیٹ نہیں پال سکتی۔ اس کی زندگی معاشی بدحالی میں گزرتی ہے —— اس کی ساری زندگی جذباتی اعتبار سے ناآسودگی کے عالم میں رہنا پڑتا ہے۔ —— "ہتک" کی سوگندھی، "خوشیا" کی کانتا، اور "کالی شلوار" کی سلطانہ سب معاشی اعتبار سے بدحال اور جذباتی اعتبار سے ناآسودہ ہیں۔ منٹو نے ان طوائفوں کی نفسیات کے ہر پہلو کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے، اور جس ماحول میں یہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس ماحول کی زندگی سے بڑی بھرپور تصویریں کھینچی ہیں —— منٹو جب ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے تو گویا ایک غلط سماجی نظامِ اقدار کے خلاف احتجاج کرتا ہے، جس نے صدیوں سے طوائف کو باقی رکھا ہے —— وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا لیکن جن حالات کی تصویر کشی کرتا ہے، ان سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ منٹو اس غلط سماجی نظام کا جانی دشمن ہے —— وہ اس نظامِ اقدار کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا کوئی واضح لائحہ عمل پیش نہیں کرتا لیکن اس کے خلاف نفرت کے جذبات کو ضرور اُبھار دیتا ہے۔ لیکن یہ نفرت محض نفرت نہیں رہتی۔ کیونکہ اس کی حدیں انسانی ہمدردی سے ملی ہوتی ہیں —— طوائف کے ماحول اور اس کے معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کا عنصر منٹو کے یہاں ہر جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے —— اور انسانی ہمدردی کی یہی خصوصیت اس کی حقیقت نگاری میں جان ڈال دیتی ہے۔

یہ بات بظاہر تو عجیب ہے کہ منٹو نے جذباتی رومانی موضوعات پر افسانے نہیں لکھے ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بات اتنی عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ منٹو فطرتاً جذباتی اور رومانی نہیں ہے —— اس کے یہاں جب کبھی یہ پہلو نمایاں بھی ہوتے ہیں

توان میں سے بھی کوئی نہ کوئی حقیقت اُبھرتی ہے۔ زندگی کا کوئی نہ کوئی اہم رمز سامنے آتا ہے —— اس لیے اس کی جذباتیت اور رومانیت اپنے آپ کو کہیں رونما نہیں کرتی —— اس پر اگر کبھی اس کا دَورہ پڑتا بھی ہے تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے —— "مَیں نے ازراہِ مذاق اُس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اس وقت فضا ایسی دلفریب تھی کہ اگر کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں۔ نیم تاریکی میں بجلی کے قمقمے قطار اندر قطار آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں ہوامیں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کے پاس ہونے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے —— ایک ایسی ضرورت جس کا احساس تحت شعور ہی میں چھپا رہتا ہے" —— اور یہ ایک حقیقت ہے —— پُرکیف اور دلآویز فضا میں عورت کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے —— منٹو اس سلسلے میں کسی رومانی فضا کو پیدا نہیں ہونے دیتا۔ موسم اور فضا میں تھوڑی سی رومانیت کا رنگ وہ ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تان زندگی کی ایک بڑی ہی اہم حقیقت پر جا کر ٹوٹتی ہے —— یوں تو بعض افسانے جذباتی رومانی موضوعات پر منٹو کے یہاں مل ضرور جاتے ہیں لیکن ان افسانوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ خود منٹو نے ان افسانوں کو اہمیت نہیں دی ہے اور اسی لیے انھیں دماغی عیاشی کی پیداوار بتایا ہے —— ایک جگہ اس نے لکھا ہے —— "مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں —— میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں —— وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لیے —— میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے، اسی لیے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا —— ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں، مگر وہ رومان نہیں ہیں" —— وہ کسی نہ کسی حقیقت کے گرد گھومتے ہیں —— منٹو کی طبیعت کا رجحان ہی رومان کی طرف نہیں ہے —— یہاں تک کہ جب محبت کا تذکرہ ہو تب بھی وہ اپنے گرد رومانیت کا حصار نہیں کھینچتا۔ اس کی نگاہیں یہاں بھی حقیقت پر جمی رہتی ہیں —— محبت کے ساتھ اُسے یہ خیال آتا ہے کہ "محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت خواہ ملتان میں پیدا ہو یا سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں، سردیوں میں پیدا ہو یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں —— محبت خوبصورت کریں یا بدصورت، بدکردار کرے یا نیکوکار، محبت محبت ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ایک سی چلی آ رہی ہے، اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے، یہ جُدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچہ جنے اور رواج کماری جنگل میں —— غلام محمد کے دل میں بھنگن محبت پیدا کرے اور نٹور لال کے دل میں کوئی رانی۔ جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے۔ بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح عورتوں کا حمل گر جاتا ہے، اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے۔ بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے —— اِدھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے بانجھ ہیں —— اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش ان کے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے، یا اُن کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا، نہیں، یہ

خواہش ان کے دل میں موجود ہوتی ہے مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی، اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے —— محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے" —— جو شخص محبت کا ذکر ایسے غیر شاعرانہ انداز میں کرے اس کے یہاں رومان بھلا کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ —— منٹو کے یہاں محبت بھی حقیقت پسندانہ انداز میں سامنے آتی ہے —— اسی لیے اگر کہیں رومان پیدا بھی ہوتا ہے تو حقیقت پسندی کی اس فضا میں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے —— اور دیکھتے دیکھتے اس کی ہستی دم توڑ دیتی ہے۔

ویسے منٹو نے بعض افسانے محبت اور عشق کے موضوع پر لکھے ضرور ہیں لیکن وہ رومانیت اور خصوصاً جذباتی رومانیت سے محروم ہیں۔ ان میں شروع سے آخر تک حقیقت واقعیت کی ایک فضا ملتی ہے —— بانجھ، اگرچہ محبت سے متعلق ایک کہانی ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی اس کہانی میں رومانی ماحول پیدا نہیں ہوتا —— کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ خاصی دیر تک اس بات کا علم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا موضوع محبت ہے —— نعیم ایک لاابالی زخم خوردہ انسان کی طرح سامنے آتا ہے —— کئی ملاقاتوں کے بعد وہ ایک دن کھلتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس نے اپنے ایک دولت مند مالک کی لڑکی زہرہ سے محبت کی ہے —— وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو کر لکھنؤ سے باہر چلے جاتے ہیں اور اطمینان سے رہنے لگتے ہیں لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ زہرہ مر جاتی ہے اور نعیم اس دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے —— نعیم بیان کرنے کو تو یہ واقعہ بیان کر دیتا ہے لیکن آخر میں اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ حقیقت افسانہ ہی رہے —— چنانچہ وہ خط میں یہ عبارت لکھتا ہے —— "آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستانِ عشق سنائی تھی —— وہ محض افسانہ تھا، ایک جھوٹا افسانہ —— نہ کوئی زہرہ ہے نہ کوئی نعیم —— میں ویسے موجود تو ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جس نے زہرہ سے محبت کی تھی" —— کہانی میں اگرچہ موٹر ڈرائیور اپنے مالک کی لڑکی سے عشق کرتا ہے لیکن اس کے باوجود کہانی میں کہیں رومان پیدا نہیں ہوتا۔ زہرہ اور نعیم دونوں حقیقت پسند ہیں —— وہ جو کچھ کرتے ہیں، سوچ سمجھ کر کرتے ہیں —— زندگی ان کا ساتھ نہیں دیتی —— اور بہت تھوڑے عرصے میں ان کی ساری آرزوؤں کا خون ہو جاتا ہے —— اور بس یہ حقیقت رہ جاتی ہے کہ انسان بے بس ہے —— خدا کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے جو بڑی حاسد ہے، جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی —— منٹو نے اس کہانی میں کسی بہت بڑے موضوع کو نہیں اپنایا ہے —— صرف ایک کردار کی ذہنی کیفیت کی تصویر کشی کی ہے اور اس طرح زندگی کی بعض اہم اور بنیادی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے —— اسی لیے اس کا موضوع رومانیت سے قریب ہوتے ہوئے بھی رومانیت سے کوسوں دور ہے —— غرض منٹو نے محبت اور رومان کے موضوعات پر جو گنتی کی چند کہانیاں لکھی ہیں ان میں سطحیت اور سستا پن نہیں ہے —— وہ کسی بڑے اہم بنیادی خیال کے گرد گھومتی ہیں —— کیونکہ منٹو زندگی کے جذباتی اور رومانی پہلوؤں سے کہیں زیادہ ان بے شمار حقیقتوں پر نظر رکھتا ہے جو مرتے دم تک انسان کے دم کے ساتھ رہتی ہیں۔

منٹو انسانی نفسیات کا گہرا نباض ہے۔ اس کی ہر کہانی کو یہی نفسیاتی شعور حقیقت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس شعور کے سہارے رومانی موضوعات تک اس کے یہاں حقیقت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں —— زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی میں اس نے کسی نہ کسی اہم نفسیاتی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے —— بعض افسانے تو اس نے ایسے لکھے ہیں جن کی بنیاد کسی نہ کسی نفسیاتی حقیقت پر استوار ہے لیکن

جو افسانے نفسیاتی حقائق کو بنیاد بنا کر نہیں لکھے گئے ہیں ان میں بھی قدم قدم پر نفسیاتی حقائق کی ترجمانی نظر آتی ہے + زندگی کے معاملات اور کرداروں کی حرکات و سکنات کو پیش کرتے ہوئے یہ نفسیاتی شعور اپنے شباب پر دکھائی دیتا ہے ـــ "ٹھنڈا گوشت" میں ایک نوجوان لڑکی سے اچانک مڈبھیڑ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے "میں نے پھر نیلی ساڑھی کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایکا ایکی اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ کچھ اس طور پر کہ اس کو دھکا سا لگا۔ وہ سنبھلی اور فوراً ہی منہ سے لال جیب نکال کر میرا منہ چڑایا۔ اپنی سہیلی سے کان میں کچھ کہا ـــ اس سہیلی نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ میرے ماتھے پر پسینہ آگیا" ـــ خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی کسی عورت کو یوں اچانک طور پر برہنہ نہیں دیکھا تھا، جب اچانک کانتا ننگی ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے تو وہ ٹھٹکا سا جاتا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہے۔ اس کی نظریں جو ایک دم عُریانی سے دوچار ہوگئی تھیں۔ اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں ـــ اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا جاؤ ـــ جاؤ، تم نہا لو ـــ پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی ـــ اندر سے کہہ دیا ہوتا، میں پھر آجاتا ـــ لیکن جاؤ ـــ تم نہا لو ـــ کانتا مسکرائی۔ جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو" ـــ پھر خوشیا یہ سوچنے لگتا ہے اور دل میں کہتا ہے "بھئی بے ایمان نہیں ہے تو کیا ہے ـــ یعنی ایک چھوکری ننگ دھڑنگ تمہارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے ـــ تم خوشیا ہی تو ہو ـــ خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلّا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے" ـــ اور یہ بات خوشیا پر ایک خوشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک رات وہ دلّال سے ایک گاہک بن جاتا ہے ـــ اور کانتا اس کے پہلو میں ہوتی ہے ـــ ایک مرد کی نفسیات کی تصویر کشی یہاں حقیقت سے کتنی بھرپور کھینچی گئی ہے ـــ اسی طرح "نعرہ" میں کیشو لال جب سیٹھ سے گالیاں سنتا ہے تو اُسے بہت بُرا لگتا ہے لیکن پھر اس کے دل میں اس طرح کے خیالات بھی آنے لگتے ہیں ـــ "اماں ہٹاؤ، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سُنیں جیسے میٹھی میٹھی بولیاں تھیں ـــ میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔ بڑے مزے دار گھونٹ تھے، چلو یوں ہی سہی ـــ اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ سچ کہتا ہوں، دیوانہ ہو جاؤں گا ـــ یہ لوگ جو بڑے آرام سے اِدھر اُدھر چل پھر رہے ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا۔ بھگوان کی قسم اب مجھے زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا ـــ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا کر مر جاؤں گا ـــ مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا" ـــ یہ جملے نفسیات شکست کو آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کر دیتے ہیں ـــ پھر "ہتک" کی سوگندھی کو دیکھیے۔ اس پر جو کیفیات طاری ہوتی ہیں وہ حقیقت سے کتنی قریب ہیں ـــ "سوگندھی دماغ دار عورت تھی لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات، کوئی کومل بول، اُس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصّوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اُس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اُس کے بُری طرح قائل تھے۔ وہ تھکن چاہتے تھے ـــ ایسی تھکن جو انھیں جھنجھوڑ کر ـــ انھیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے ـــ ایسی نیند جو تھک کر چُور چُور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے ـــ وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے کتنا آنند دیتی ہے!" ـــ سوگندھی ایک طوائف ہے لیکن وہ عورت بھی ہے۔ چنانچہ جب بھی وہ کسی شخص سے محبت کا سلسلہ

سنتی ہے تو موم ہو جاتی ہے ——— یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب فریب ہے، جھوٹ ہے، مکاری ہے ——"ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔ سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں ——— اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی ——— اور ایسا محسوس کرتی تھی، جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے ——— پریم، کتنا سندر بول ہے ——— وہ چاہتی تھی اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگ پر مل لے، اُس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے ——— یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے، سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو اور اُوپر سے ڈھکنا بند کر دے" ——— غرض اسی طرح انسانی نفسیات کے اَن گنت حقائق منٹو نے اپنے افسانوں میں پیش کیے ہیں ——— منٹو کا کمال یہ ہے کہ وہ ان حقیقتوں کو نئے زاویوں سے دیکھتا ہے ——— اس کی نگاہیں اس سلسلے میں اس جگہ جا پہنچتی ہیں جہاں عام افراد کی نظروں کا پہنچنا آسان نہیں ہوتا ——— منٹو انسانی نفسیات کو انسانی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لیے اس میں حقیقت کے بے شمار پہلو رونما ہوتے ہیں ——— اس کی دُور بین نگاہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی انسانی زندگی کی بڑی اہم حقیقتیں بنا دیتی ہے ——— اس کے انسانوں کے یہ پہلو بھی اس کی حقیقت نگاری کو سہارا دیتے ہیں ———

یہ نفسیاتی شعوریوں تو منٹو کے ہر افسانے میں ملتا ہے لیکن بعض افسانے اس نے ایسے بھی لکھے ہیں جن کا بنیادی موضوع ہی کوئی نہ کوئی اہم نفسیاتی حقیقت ہے ——— ان میں سے بیشتر انسانی زندگی کے جنسی پہلوؤں سے متعلق ہیں ——— لیکن ان جنسی پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے منٹو نے انسانی نفسیات کے بہت سے اسرار و رموز کی حقیقت واضح کی ہے ——— 'شو شو'، 'بلاؤز'، 'پھاہا' اور اسی طرح کے بعض اور افسانے اسی نفسیات جنسی کے مختلف حقائق کو پیش کرتے ہیں ——— "شو شو" ایک نوجوان لڑکی کی کہانی ہے جو کسی شادی میں شرکت کی غرض سے آئی ہے اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ رات گزار رہی ہے ——— وہ آپس میں دلہنوں کے متعلق بے شمار باتیں کرتی ہیں ——— جن سے ان کے جنسی دباؤ کا اندازہ ہوتا ہے ——— شو شو یہ باتیں کرتے ہوئے بالآخر اپنی سہیلی عفت کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جما دیتی ہے لیکن عفت معترض نہیں ہوتی، خاموش بیٹھی رہتی ہے ——— اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر سو جاتی ہیں ——— منٹو نے یہاں نوجوان لڑکیوں کے جنسی جذبات کی حقیقت سے بھرپور ترجمانی کی ہے ——— بلاؤز، مومن، شکیلہ اور رضیہ کی کہانی ہے جو بلوغ کی منزلوں سے گزر رہے ہیں ——— شکیلہ ساٹن کی ایک بلاؤز پہنتی ہے اور رضیہ کو دکھاتی ہے ——— مومن کے دماغ میں یہ بلاؤز عجیب و غریب خیالات پیدا کرتا ہے ——— اِدھر ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا۔ اُدھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانکے اُدھڑ رہے تھے ——— جب اُسے کمرے میں بُلایا جاتا اور اُس کی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اُسے دیکھے ——— صرف چھو کر ہی نہیں ——— بلکہ اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے ——— اپنے کھردرے ہاتھ ——— اس میں بھی ایک نفسیاتی حقیقت پنہاں ہے ——— 'پھاہا' بھی کم و بیش اسی طرح کی کہانی ہے۔ گوپال کی ران پر پھوڑا نکل آتا ہے ——— وہ اور اس کی بہن اس پر پھاہا لگاتے ہیں ——— لیکن آخر میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نرملا تنہائی میں اپنے لیے بھی ایک پھاہا تراشتی ہے ——— اور پھر جو کچھ ہوتا ہے اُس کو منٹو ہی کے الفاظ میں سُنیے ——— "پھاہا کاٹنے کے بعد اُس نے تھوڑا سا

مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹکلی پر چھوٹا سا نامکمل بلبلہ اٹکا ہوا ہے —— نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اسے ننھے سے اُبھار پر جما دیا"——

اس افسانے میں بھی منٹو نے بلوغ کی نفسیات کو واضح کیا ہے —— غرض اس طرح اس نے بہت سے افسانے اس موضوع پر لکھے ہیں —— ان افسانوں کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے —— لیکن یہ زندگی کے بعض بنیادی نفسیاتی حقائق کو ضرور پیش کرتے ہیں —— دوسرے ان حقیقتوں پر پردہ ڈالتے ہیں —— منٹو ان حقیقتوں کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس لیے ان افسانوں میں بھی اس کی حقیقت نگاری اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

منٹو نے خالص جنسی موضوعات پر جو چند افسانے لکھے ہیں، اور جن پر خاصا ہنگامہ ہوا ہے، وہ بھی نفسیاتی حقائق کی ترجمانی کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہیں —— اس میں شک نہیں کہ ان افسانوں میں سے اکثر کے موضوعات بڑی حد تک مہمل ہیں لیکن ان میں جگہ جگہ فرد کی نفسیات کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے —— اور اس نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی جو ترجمانی منٹو نے کی ہے، اس کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا —— "دھواں" اور "ٹھنڈا گوشت" منٹو کے ایسے ہی افسانے ہیں —— "دھواں" کا کوئی خاص اہم موضوع نہیں ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ مسعود ایک اسکول کا لڑکا ایک قصائی کو گوشت لے جاتے ہوئے دیکھتا ہے —— اس گوشت میں سے اُسے دھواں سا اُٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے دل میں اس گوشت کو چھونے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اُسے انگلی سے چھوتا ہے اور گوشت کی گرمی اُسے اچھی معلوم ہوتی ہے —— یہ رُوداد وہ اپنی ماں اور بہن کلثوم کو سناتا ہے —— اس کی بہن پر یہ روداد سن کر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ مسعود سے یہ کہتی ہے کہ اس کی کمر میں شدید درد ہو رہا ہے اور وہ مسعود سے کمر دبوانا چاہتی ہے —— چنانچہ وہ دبا دیتا ہے —— پھر اس کی بہن کلثوم اپنی سہیلی بملا کے ساتھ ایک پلنگ پر دیکھی جاتی ہے —— یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں اس افسانے کا موضوع ہیں۔ اس کے موضوع کے سستے پن سے قطع نظر اس میں جگہ جگہ ایسے مقامات آتے ہیں جہاں گہرے نفسیاتی حقائق کا پتہ چلتا ہے —— مسعود اور کلثوم کی گفتگو اور کلثوم اور بملا کی حرکات میں ان حقائق کا پتہ چلتا ہے —— "ٹھنڈا گوشت" کا جو موضوع ہے اس کا بھی کم و بیش یہی حال ہے —— موضوع اس کا بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ نفسیاتی حقائق اس میں بھی جگہ جگہ ملتے ہیں —— منٹو نے ان باتوں کو اپنے گہرے نفسیاتی شعور سے کام لے کر حقیقت کا روپ ضرور دے دیا ہے —— اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری میں یہ باتیں معاون ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے ——

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ منٹو کے یہاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں اس نے زندگی کی حقیقتوں کو دیکھا ہے —— ان حقیقتوں کی تلاش میں وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ٹٹولتا ہے —— اس کی ساری تفصیل او جزئیات کو دیکھتا ہے —— یہ جزئیات حقیقتوں کو اُبھارنے میں بڑا کام کرتی ہے —— اور اس پر منٹو کا مشاہدہ سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے چنانچہ اس کی نگاہیں ان جزئیات میں ایسے پہلوؤں کو بھی دیکھ لیتی ہیں جن کو دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی —— اسی لیے منٹو کے یہاں جزئیات کی حقیقت اور حقیقت کی جزئیات بہ یک وقت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ مشاہدہ کی تیزی کے سہارے جزئیات کی حقیقت اور

حقیقت کی جزئیات جس طرح منٹو کے یہاں نمایاں ہوتی ہے۔ شاید ہی اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں اس طرح نمایاں ہوتی ہو لیکن اس میں منٹو کے تخیل کو بہت کم دخل ہوتا ہے —— منٹو صرف دیکھتا ہے اور دیکھتے ہوئے اس کی نظریں خارجی مظاہر کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچتی ہیں اور جب وہ ان کی تفصیل بیان کرتا ہے تو اس میں بے شمار حقیقتیں نمایاں ہوتی ہیں —— اصل میں حقیقتوں کی تلاش ہی منٹو کو خارجی مظاہر کی تفصیل و جزئیات کی طرف متوجہ کرتی ہے —— اور وہ اس کی جستجو اور تلاش میں بہت دُور نکل جاتا ہے —— لیکن اس کے باوجود رہتا ہے اسی دنیا میں —— منٹو کے یہاں خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اسی دُنیا کی باتیں ہیں —— اسی ماحول کی باتیں ہیں۔ اسی فضا کی باتیں ہیں —— منٹو ان باتوں کو بہت نمایاں کرکے پیش کرتا ہے —— اور ان باتوں کو نمایاں کرکے پیش کرنے ہی میں اس کے یہاں حقیقت کی جزئیات اور جزئیات کی حقیقت اپنے آپ کو رونما کرتی ہے —— گوپال جس کی ران پر پھوڑا نکلا تھا، اس کے باپ کے کردار کی تفصیل یہ ہے کہ اس کے پتاجی لالہ پرشوتم داس تھانیدار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور یہ بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب آم پڑے تھے جو انھوں نے ایک ٹھیلے والے سے اس کا چالان کاٹ کر حاصل کیے تھے۔ گوپال باپ کی پیٹھ مل رہا تھا اور میل کی مرُوڑیاں بنا رہا تھا۔ جب اس نے ہاتھ صاف کرنے کے لیے بالٹی میں ڈالے تھے اور چپکے سے ایک آم اُڑانا چاہا تھا تو لالہ جی نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوٹے سے آم کو مونچھوں سمیت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا "بے شرم تجھے بڑوں کا لحاظ کرنا جانے کب آئے گا" —— اور نتھو کے کردار کی جزئیات ان جملوں میں موجود ہے نتھو کو گاؤں کے ہر جھونپڑے اور اس کے اندر رہنے والے کا حال معلوم تھا۔ مثال کے طور پر اُسے معلوم تھا کہ چوہدری کی گائے نے صبح سویرے ایک بچھڑا دیا ہے اور مادھو کے لنگڑے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی ہے۔ گاما حلوائی اپنی مونچھوں کے بال چنوا رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا۔ اور ایک سیر دُودھ کم بیسے نائی کو بطور قیمت دینا پڑے —— اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ دو اُپلوں پر پرسرام اور گنگو کی پیچ بہر بخ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی اور سالک رام نے اپنے بچوں کو پاپڑ بھون کر کھلائے تھے۔ حالانکہ ویدجی نے منع کیا تھا کہ ان کو مرچوں والی کوئی شے نہ دی جائے" —— اور ایک فلم کمپنی کے ماحول کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے —— باپوں کی گٹھڑی کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی۔ رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اَپ کے لیے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹریس سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور کرسیوں پر اُونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی تپائی کے اُوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دُور کرنے کے لیے ان ایکٹرسوں نے پی تھیں۔ ان پیالیوں پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سُن کر کسی نو وارد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے" —— اور سوگندھی کے ماحول کی تصویر اس طرح بنائی ہے۔ "دروازے پر دستک ہوئی —— رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی —— وہ ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیسدار تھا۔ دھوتی کے پلّو سے اُس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جُھک کر اُس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اُس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر مُنہ رکھے سو رہا تھا۔"

اور" شوشو" میں حسن و شباب کے طوفان، رنگ و بو کی مصوری اس طرح کی ہے۔ "ساڑھیوں کی ریشمیں سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں، ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں، اونچی ایڑی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں دھڑکتے ہوئے لہجے۔ بچھتی ہوئی نگاہیں اور پھر ان الھڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں! ——— یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا ہے۔" ——— منٹو کے افسانے اس طرح کی تفصیل و جزئیات سے بھرے پڑے ہیں۔ اس تفصیل و جزئیات سے اس فضا اور ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے جس میں حقیقتیں پرورش پاتی ہیں۔ اسی لیے منٹو کی یہ تفصیل و جزئیات زندگی کی ان گنت حقیقتوں کو ظاہر کرنے کا ایک وسیلہ اور ذریعہ بن جاتی ہے ——— اور اس میں شک نہیں کہ منٹو نے اپنے ہر افسانے میں تفصیل و جزئیات سے یہی کام لیا ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا منٹو کے یہاں محض خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اس نے حقیقتوں کو اجاگر کرنے کی بنیاد تخیل پر نہیں رکھی ہے ان کو ہو بہو اور من و عن پیش کر دیا ہے۔ لیکن جگہ جگہ حقیقتوں کو واضح کرنے میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے، اس میں تخیل کی رنگ آمیزی ضرور نظر آتی ہے۔ اس رنگ آمیزی سے منٹو نے حقیقتوں کو نمایاں طور پر پیش کرنے میں بڑا کام لیا ہے ——— اس کے افسانوں میں تخیل کی رنگ آمیزی کا مقصد صرف اسلوب کی پرکاری ہی نہیں، بعض بنیادی معاملات کی توضیح و تشریح ہے ——— اسی لیے تخیل کی رنگ آمیزی منٹو کے یہاں مقصد نہیں ذریعہ بن جاتی ہے ——— اور اس ذریعے سے مختلف حقیقتوں کو واضح کرنے کا جو مقصد ہے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں ایسے ہی مقامات پر حقیقت کا حسن بھی نمایاں ہوتا ہے اور حسن کی حقیقت بھی ——— بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو حقیقت حسن بن جاتی ہے اور حسن حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا ہے منٹو کے ہر افسانے میں ایسے مقامات آتے ہیں اور ان کے بنیادی موضوعات میں جو مختلف حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں، ان پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں ——— یہ جملے تخیل کی رنگین کاری کے باعث کتنے حسین لیکن حقیقت سے کتنے بھرپور ہیں:۔

"پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔" (کالی شلوار)

"شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی گھلی ہوئی تھی۔ جوان کنوارے آدمیوں کے دل میں ایسی اداسی ضرور موجود ہوتی ہے جو پھیل کر ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتی ہے۔ میرے بدن پر ایک کپکپی طاری ہو گئی۔ جب میں نے جوہو کے سمندری کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو نم آلود ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے بھاری بھاری ریشمی ساڑھیاں پہن کر عورتیں چلتی ہیں۔" (پریشانی کا سبب)

"ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ایسی ہی

کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔" (دھواں)

"وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے۔" (مصری کی ڈلی)

"اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دُم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی —— اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا —— ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا —— اُسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے —— جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اُتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔" (ہتک)

"لاجو کی ماں کھڑکی کے ساتھ لگی، خاموش اور نیم روشن سڑک پر پھیلی ہوئی کیچڑ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے اُس طرف لوہے کے کھمبے پر ایک لالٹین دسمبر کی سردی میں مجبور سنتری کی طرح اونگھ رہی تھی۔ سامنے بھٹیارے کی بند دوکان کے باہر چبوترے پر انگیٹھی میں سے کوئلوں کی چنگاریاں ضدی بچوں کی طرح مچل مچل کر نیچے گر رہی تھیں۔" (موم بتی کے آنسو)

"میرے دائیں ہاتھ کو ایک اونچا ٹیلہ تھا جس کے ڈھلوانوں میں گندم کے ہرے پودے نہایت ہی مدھم سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ یہ سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں بند کر لو تو یہ معلوم ہوتا کہ تصوّر کے گدگدے قالینوں پر کئی کنواریاں ریشمی ساڑھی پہنے چل پھر رہی تھی۔" (موسم کی شرارت)

"جہاں بیٹھا تھا وہاں دو یا تو نی، ایک گجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب کے جمے ہوئے تھے۔ دونوں گجراتی بولتے تھے، مگر مختلف لب و لہجہ سے۔ پارسی کی آواز میں دو سُر تھے کبھی باریک سُر میں بات کرتا تھا، کبھی موٹے سُر میں۔ جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے۔" (بانجھ)

"شوشو میں بانجھ کے تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنکار سی پائی جاتی ہے۔ آپ یہ نام پکاریئے تو ایسا معلوم ہو گا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر زور سے گز پھیر دیا ہے۔" (شوشو)

"اُس بازار کا راستہ ہم جانتے تھے، جہاں عورتیں مل سکتی ہیں —— کالی، نیلی، پیلی، لال اور

جامنی رنگ کی عورتیں، پیڑوں کی طرح ان کے مکان ایک قطار میں دُور تک دوڑتے چلے گئے
ہیں یہ رنگ برنگی عورتیں ان میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے
ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں۔" (پہچان)

ان اقتباسات میں تخیل کی رنگ آمیزی اپنے شباب پر ہے، اور اس رنگ آمیزی نے ان میں بلا کا حُسن پیدا کر دیا ہے لیکن یہاں تخیل کی رنگ آمیزی بذاتِ خود اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی کہ وہ حقیقتیں جن کو منٹو پیش کرنا چاہتا ہے — اسی لیے ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ نظر آتا ہے — ان کا حُسن برائے حُسن نہیں ہے بلکہ حسن برائے حقیقت ہے اور اسی لیے ان میں بہ یک وقت حقیقت کا حُسن بھی نظر آتا ہے اور حُسن کی حقیقت بھی!

منٹو اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے — اس میں اُس کا کوئی ثانی نہیں!

اب تک منٹو کی حقیقت نگاری پر جو بحث ہوئی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منٹو کے یہاں حقیقت نگاری کا میدان محدود نہیں ہے۔ اس کے فن میں اس حقیقت نگاری کے بے شمار پہلو ہیں۔ اَن گنت روپ ہیں۔ اور اس کی حقیقت کو دیکھنے والی نگاہیں ان تمام متنوع پہلوؤں کو دیکھتی ہیں — یہ سارے مختلف روپ اُس کے سامنے آتے ہیں۔ اس نے عام انسان کی زندگی کے حقائق کو بھی دیکھا ہے، سماجی زندگی کے معاملات و مسائل کی حقیقتیں بھی اس کے سامنے آئی ہیں — انسانی نفسیات کے نارمل اور ایب نارمل دونوں پہلوؤں کے حقائق اس کی نظروں کے سامنے رہے ہیں — لیکن ان سب کو پیش کرنے میں وہ خود نارمل رہا ہے — کہیں کہیں ایب نارمل نفسیات کو پیش کرتے ہوئے تھوڑی سی انتہا پسندی اس کے یہاں ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی وہ عام انسانی سطح سے نیچے نہیں گرتا — برخلاف اس کے ایسے مقامات پر تو اُس کی حقیقت نگاری اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے — 'بابو گوپی ناتھ'، 'ممّی' اور 'موذیل' اس کے ایسے ہی شاہکار افسانے ہیں — بظاہر یہ تینوں کردار دیکھنے میں عجیب معلوم ہوتے ہیں، لیکن عجیب دکھانے کے باوجود منٹو انھیں انسانوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے — اور اسی لیے ان کی تمام حرکات و سکنات حقیقت سے اتنی قریب نظر آتی ہے۔ منٹو نے ان سب کو حقیقت کے روپ میں دیکھا ہے یا ان میں اُسے حقیقت کے مختلف روپ نظر آئے ہیں — ان حقیقتوں کو کہیں کہیں اس نے حالات و واقعات اور معاملات و مسائل میں بھی تلاش کیا ہے — اور اسی لیے اس کے یہاں فضا اور ماحول کے بھی بعض بہت اچھے افسانے ملتے ہیں لیکن حقیقتوں کو دیکھنے کا جو ملکہ اُسے کرداروں میں حاصل ہے، اس کی مثال سارے اُردو افسانے میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اسی لیے اس کے بہترین افسانے کرداروں کے مطالعے پر مشتمل ہیں — اور ان افسانوں میں حقیقت نگاری کا کمال نظر آتا ہے — بہرحال منٹو کے یہاں تنوعات کی حقیقت نگاری اور حقیقت نگاری کے تنوعات ہیں — لیکن ان میں ہر چیز مشترک ہے — اور وہ ہے ایک انسانی زاویۂ نظر!

یہ انسانی زاویۂ نظر منٹو کی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے — اور اسی زاویۂ نظر کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے تمام افسانوں میں انسانیت اور انسان دوستی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے — وہ بنیادی طور پر ایک انسان دوست (HUMANIST)

ہے اوراس انسان دوستی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ انسانی زندگی اوراس کے مختلف مظاہر سے گہری دلچسپی رکھتا ہے —— انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے، جو کچھ بھی سوچتا ہے، منٹو ان سب کو دیکھنے کا شیدائی ہے —— اسی لیے اس کے یہاں عام انسانوں کے جذبات و احساسات، واردات و کیفیات، ان کی آرزوئیں اور تمنائیں، ان کی حسرتیں اور مایوسیاں سب کی حقیقت سے بھرپور تصویریں موجود ہیں —— اس سلسلے کے کسی پہلو کو بھی منٹو نے چھوڑا نہیں ہے۔ ہر پہلو کی ترجمانی کی ہے —— لیکن منٹو کی انسانیت اور انسان دوستی صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے —— وہ سماجی معاملات سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے منٹو کے یہاں اس حقیقت کا گہرا شعور ہے کہ انسانی زندگی میں فرد ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سماجی معاملات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ فرد بہرحال سماج کا ایک جزو ہوتا ہے اور سماجی حالات اس کو ہر اعتبار سے متاثر کرتے ہیں —— چنانچہ سماجی زندگی کے ایسے معاملات کی ترجمانی جن سے افراد کی زندگی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوتی ہے۔ منٹو نے بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ان مظالم کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا ہے جو زندگی کے غلط نظام اقدار نے تاریخ کے مختلف ادوار میں افراد پر روا رکھے ہیں اور جن کی وجہ سے انسانیت کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے —— زندگی کو جس سانچے میں ڈھلنا چاہیے تھا نہیں ڈھل سکی ہے —— اور اس کی رفتارِ ارتقا کا جو اندازہ ہونا چاہیے تھا، وہ اُسے میسر نہیں آسکا ہے —— اس میں گندگی اور تاریکی ہے —— اور منٹو اس گندگی اور تاریکی پر کڑھتا ہے۔ اس پر خون کے آنسو بہاتا ہے —— اس طرح اس کے تمام پہلو افراد پر روشن ہو جاتے ہیں، لیکن خود منٹو ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا —— ان حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل منٹو کے یہاں موجود نہیں ہے —— وہ ان کو دیکھتا اور دکھاتا ہے —— اُسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ان حالات کو ٹھیک کس طرح کیا جائے —— بہتر کس طرح بنایا جائے —— لیکن اس کی تحریروں میں ان حالات سے بیزاری ضرور محسوس ہوتی ہے —— وہ ان سے باہر نکلنے کا احساس دلاتا ہوا ضرور معلوم ہوتا ہے —— منٹو کے یہاں ان حالات کی تنقید نہیں ہے —— عکاسی ہی عکاسی ہے، ترجمانی ہی ترجمانی ہے —— اس عکاسی اور ترجمانی میں کہیں کہیں نشتریت کا احساس ضرور ہوتا ہے —— اور اس نشتریت سے کسی حد تک تنقید کی کمی پوری ہو جاتی ہے —— زندگی کی ترجمانی اور عکاسی میں دو چیزیں منٹو کا دامن کبھی نہیں چھوڑتیں —— ایک تو عقلی زاویۂ نظر اور دوسرے عام انسانی ہمدردی —— منٹو انسانی ارتقا کا قائل ہے۔ اسی لیے انسانی زندگی اور اس کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ ایک عقلی زاویۂ نظر اختیار کرتا ہے —— اُسے جذبات کے دھارے پر بہنا نہیں آتا —— اسی لیے اس کے یہاں جذباتیت نام کو بھی پیدا نہیں ہوتی —— عقل و شعور ہر جگہ کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں —— اور ان سب کی تان انسانی ہمدردی پر جا کر ٹوٹتی ہے —— یہی باتیں اُسے انسان دوست بناتی ہیں —— اس انسان دوستی نے اس کی حقیقت نگاری کو زندگی بخشنے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور انسان دوستی سے بڑی حقیقت اس زندگی میں اور کوئی نہیں ——

منٹو اشتراکی نہیں ہے۔ اسی لیے اس کے یہاں اشتراکی حقیقت نگاری کا وہ تصور نہیں اُبھرتا جس کی بنیاد سماجی زندگی کے طبقاتی اور جدلیاتی شعور پر استوار ہوتی ہے —— منٹو کے یہاں یہ شعور نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے محدود شعور کی روشنی میں زندگی کی مختلف اور متنوع حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کے یہاں اشتراکی اور تنقیدی حقیقت نگاری نہ سہی

لیکن جن حقیقتوں کو اس نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ ہماری عام زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں — اس نے اپنے زمانے کی بدلتی ہوئی زندگی کے بدلتے ہوئے معاملات و مسائل سے موضوعات منتخب کیے ہیں اور اس سلسلے میں اس کا زاویۂ نظر ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے — اس کے افسانوں میں جو حقیقتیں نظر آتی ہیں وہ اس کے تخیل کی پیداوار نہیں ہیں — ان میں سے ہر ایک اپنا مستقل وجود رکھتی ہے — منٹو نے خارجی طور پر انھیں سماجی زندگی میں دیکھا ہے — اُسے ان کی تلاش و جستجو میں کوئی بڑی کاوش نہیں کرنی پڑی ہے — زندگی کے شدید احساس اور حالات کے گہرے شعور نے انھیں اس کے سامنے لاکھڑا کر دیا ہے — اس کی دُور رس اور دُور بین نظریں ان سب پر حاوی معلوم ہوتی ہیں — اسی لیے اس نے ان حقیقتوں کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کے یہاں جگہ جگہ ان میں سے بعض نئی حقیقتوں کے پیکر اُبھرتے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں۔

اور یہی اس کی حقیقت نگاری ہے۔[۱]

عبادت بریلوی

سعادت حسن منٹو کی یادیں

چونکہ منٹو کا تعلق کسی خاص ادبی فرقے (SECT) سے نہ تھا اس لیے اس بات کا خدشہ محسوس کیا جاتا تھا کہ کہیں ان کی لاش پر لاہور کے مختلف ادبی فرقوں کے درمیان لڑائی نہ ہو لیکن خوش قسمتی سے منٹو کی اس وقت موت آئی جبکہ "ادب میں جمود تھا" اور سیاسی فضا کسی قسم کے ہنگامے کے لیے سازگار نہ تھی۔ پھر بھی سُنا ہے کہ جب ان کے انتقال کی خبر، انتقال کیوں موت کی خبر لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی جہاں سے ان کے ڈرامے نشر نہیں ہو پاتے تھے، تو کچھ فرقہ پرست قسم کے لوگ مرحوم کے گھر پر اس نیت سے بھی گئے لیکن وہ لوگ اتنی دیر میں پہنچے کہ ان کی لاش پر قبضہ کیا جا چکا تھا۔ یہ قبضہ نہ تو ادیبوں کے کسی فرقے نے کیا تھا اور نہ شہر کے رؤسا اور عمائد نے اور نہ حکومت نے بلکہ اس انبوہِ کثیر نے جس میں اکثر و بیشتر کیریکٹر "سوسائٹی" کی نگاہ میں مشتبہ تھے۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا تھا جس کا تعلق دولت کی پیداوار سے براہِ راست رہا ہو، ورنہ وہ سب کے سب دولت اڑانے والوں کے لیے سامانِ تفریح بہم پہنچانے والوں میں سے تھے۔

اکثریت یقیناً انہی لوگوں کی تھی لیکن ان میں جا بجا ادیبوں کو چھوڑ کر غیر مشتبہ کیریکٹر کے لوگ بھی تھے۔ انہی میں ایک مولوی صاحب اور کچھ سکھ لوگ بھی تھے جو اپنے مخصوص حلیے کی وجہ سے خواہ مخواہ نمایاں معلوم ہو رہے تھے۔ چونکہ مرحوم مولوی اور سکھ دونوں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے اس لیے ان کی موجودگی پر مشتبہ کیریکٹر کے لوگوں کے درمیان کھسر پھسر بھی رہی جو جلد ہی دب گئی۔ کیونکہ اتنی سی بات پر وہ ان سے مخالفت مول لے کر اپنا بزنس قربان کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی یہ کاروباری رواداری کس قدر سطحی تھی اور وہ اپنے عقائد میں کس قدر ہیئت پرست واقع ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جبکہ مولوی صاحب نے نماز جنازہ کی تیاری میں اپنی داڑھی اور پٹکا اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ وہی گروہ جو چند منٹ پہلے بزنس کا خیال کر کے خاموش ہو رہا تھا احتجاج پر اُتر آیا۔ مولوی صاحب نے اعتراض کی نوعیت کو بھانپ لیا اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا: "حضرات میں نے جو یہ داڑھی اور پٹکا اتار کر رکھ دیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مرحوم بالخصوص میری ذات سے متعلق اسے مکر و فریب کا آلۂ کار تصور کرتے تھے۔ وہ مذہب کی اسپرٹ یعنی خدمت خلق اور اس قسم کے دوسرے اصول حسنہ کے مخالف نہ تھے لیکن ان حلیوں اور اداروں کے ضرور مخالف تھے جن کی کمین گاہ سے انسان کو شکار کیا جاتا ہے۔ مرحوم کی ایک کہانی "صاحب کرامات" تو آپ حضرات نے پڑھی ہی ہوگی۔ میں ہی اس کہانی کا ہیرو یا ویلین ہوں اور یہ داڑھی اور پٹکا جس کے اتارنے پر اتنا احتجاج ہو رہا ہے وہی ہے جسے ایک بار میں مرحوم کے گھر چھوڑ آیا تھا۔" مولوی کے اس "اعتراف" پر مشتبہ کیریکٹر کے لوگوں کے درمیان اور بھی زیادہ احتجاج بڑھا۔ وہ علانیہ کہنے لگے "ہم کبھی بھی ایسے مولوی کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے تیار نہیں جو بدباطن جوان ہے۔" اعتراض کی عجیب و غریب نوعیت مولوی صاحب کے لیے سخت پریشان کن تھی۔ چنانچہ انھوں نے مجمع کو

ایک بار پھر مخاطب کیا ”حضرات ہمارا تعلق قومِ یہود سے نہیں کہ ہر نیک کام کے افتتاح کے لیے کسی معصوم ہستی کو تلاش کریں اور نہ مرحوم نے کبھی ایسی تلاش کو جائز سمجھا۔ وہ تو سب سے زیادہ گنہگار آدمی کو سب سے زیادہ نیک کام کا اہل سمجھتے تھے اور یہ بات حق پر مبنی ہے جیسا کہ آپ کو اپنے ذاتی تجربے سے بھی علم ہوگا کہ نیکی کا ردِ عمل صرف گنہگار آدمیوں ہی پر ہوتا ہے ورنہ نیک آدمیوں کو تو بُرائی ہی کی طرف جھکتے پایا ہے۔“ مولوی صاحب کے اس جملے پر (“NO PERSONAL REMARK”) کا ایک زبردست شور اُٹھا لیکن مولوی صاحب کی آواز اسپرنگ بنا کر آگے بڑھ چکی تھی ”آپ کے ذہن میں میری ذات سے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہیں جو غالباً فقہ کی ناواقفیت سے پیدا ہوئی ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا اس کا جواز فقہ میں موجود ہے، کسی بھی مطلوقہ کو اس کا طلاق دینے والا شوہر اس وقت تک عقدِ ثانی میں نہیں لا سکتا ہے جب تک وہ مطلوقہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے اور وہ دوسرا مرد اسے طلاق نہ دے دے۔ فرض کیجیے، اگر موجو کی مطلوقہ عورت یعنی پھاتاں کو میں اپنے نکاح میں نہ لاتا اور دوسرے ہی دن صبح اپنی مرضی سے اُسے طلاق نہ دے دیتا تو پھر موجو کی شادی دوبارہ پھاتاں سے کیونکر ہوتی۔ کیونکہ اس کا امکان بھی پایا جاتا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ پھاتاں کو طلاق بھی نہ دیتا۔ میں نے جو کچھ کیا موجو اور پھاتاں کی بھلائی کے لیے کیا۔ اس میں بظاہر میری بزرگی ہے نہ کہ جوانی۔“ اس پر مجمع خاموش ہو گیا۔ حالانکہ اعتراض بدباطن پر تھا۔ اور ایسی خاموشی چھا گئی کہ پھر کسی بھی بدعت پر لوگوں نے اعتراض نہیں کیا۔

جب نمازِ جنازہ ختم ہو چکی اور پھر مرحوم کی لاش کو قبر میں اتارنے کا وقت آیا تو بابو گوپی ناتھ، مس موزیل، ممی اور ٹوبا سنگھ نے خاص طور سے حصہ لیا۔ گو اور گرد اور لوگ بھی تھے اور جب یہ رسم پوری ہو چکی اور مرحوم کی لاش مٹی کے حوالے کی جا چکی تو مولوی صاحب نے ادیبوں سے درخواست کی کہ وہ مرحوم کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ کوئی شخص مرحوم کے الفاظ میں اپنا حرفِ مطلب ”تلاش“ نہ کرے۔ اس پر ناقدین حضرات پیچھے ہٹ گئے اور صرف افسانہ نگار حضرات آگے بڑھے۔

اُردو کے ایک مشہور افسانہ نگار جنھوں نے اپنی زندگی کے کئی سال منٹو کے ساتھ گزارے تھے، ان کی شخصیت کو آئینہ دکھانا چاہا۔ لیکن وہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ ایک ہی آدھے جملے کے بعد یہ کہہ کر رونے لگے ”یار منٹو بڑا پیارا دوست تھا“ افسانہ نگار کے اس ایک جملے نے وہ کام کیا جو غالباً کسی لمبی چوڑی تقریر سے ممکن نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور مرحوم کی شخصیت، فراخدلی، راست گوئی اور دردمندی کی تصویر بن کر چھا گئی۔ اب ان کی جگہ ایک دوسرے مشہور افسانہ نگار تشریف لائے، جنھوں نے شخصیت سے ہٹ کر ان کی افسانہ نگاری کو اپنا موضوع بنایا۔

”حضرات! منٹو کی افسانہ نگاری اس کی شخصیت کا آئینہ ہے اور شخصیت کا بالیقین خواہ غلط ہو یا صحیح ہم لوگ بالعموم آدمی کے مزاج سے کیا کرتے ہیں۔ حکیم جالینوس کا خیال ہے کہ آدمی کے مزاج میں سودا، صفرا، بلغم اور خون ان چار جزوں کے مختلف النوع تناسب کو دخل ہوتا ہے لیکن مرحوم نے اپنی شخصیت سے اس حکم کو جھٹلا دیا۔ ان کے مزاج میں سودا، صفرا اور خون تو تھا لیکن بلغم بالکل نہ تھا۔ وہ نہ تو غبی واقع ہوئے تھے اور نہ ہنسوڑ۔ ان کے افسانوں میں تلخی اور ترشی ہے نہ کہ سٹھیا پن یا حمق۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے افسانوں میں تلخی اس وجہ سے ہے کہ وہ افسانہ لکھنے سے پہلے کوئی کڑوا گھونٹ اتار لیتے تھے لیکن میں اسے بالکل ہی غلط سمجھتا ہوں۔ آزما کر دیکھ چکا ہوں۔ نہ تو تلخی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور نہ اس وجہ سے کہ کسی کے ایام تلخ ہیں،

یہ بھی آزما کر دیکھ چکا ہوں۔ حضرات اس کے افسانوں کے تلخ اور ترش ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ ہم لوگوں سے زیادہ حساس اور زیادہ ذہین واقع ہوا تھا۔ اس کا ردِ عمل اور اس کی گرفت دونوں ہی ہم لوگوں سے زیادہ تیز اور چست تھیں۔ وہ جس قسم کے سماج میں رہ رہا تھا اس میں صرف عفونت اور سڑاند ہی نہ تھی بلکہ شدید قسم کی جسمانی اور ذہنی بے حسی بھی تھی۔ بڑے سے بڑے حادثات اس طرح پاس سے گزر جاتے جیسے وہ کسی ہوائی بندوق کے دہانے سے نکلے ہوں۔ منٹو ہماری اسی بے حسی سے اُکتا کر کبھی کبھی اصلی بندوق چلا دیا کرتا اور بالکل ہی سنجیدہ رہتا۔ کیونکہ نہ تو وہ رونے کے لیے ہنساتا اور نہ ہنسنے کے لیے رُلاتا۔ وہ جو کچھ کرتا وہی اس کا مقصد ہوتا۔ اس کا مقصد سوسائٹی کی روٹین کو مسترد کر دینے، یعنی ڈھرّے پر چلنے والے پہیے کو روک دینے کا تھا۔ ایسا آدمی یقیناً باغی ہی کہلائے گا۔ لیکن اس کی بغاوت میں   نہیں ہے بلکہ "بالٹ" بولنے والا انداز ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے آرٹ کی طرف وہی آتے ہیں جن پر بقولِ افلاطون بھوت سوار رہتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑے گا کہ آرٹ سے عہدہ برآ بھی وہی ہوتے ہیں جو اپنے بھوت کو بھگا دیتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی خوبی یہی ہے کہ آسیب زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے بھوت کو بھگا دیا تھا۔ وہ صدیوں تک عوام کے توہمات پر زندہ رہنے والے سچ بولنے کے بجائے منکشف جھوٹ بولتا۔ زندگی کے ان تجربات کے ذریعے نہیں جن کا سہارا لے کر ہم سو جاتے ہیں، بلکہ ان تجربات کے ذریعے جو ہمیں خواب میں بیدار رکھتے ہیں۔ چونکہ فکشن کے لیے اس قسم کا میٹریل ذرا مشکل سے ملتا ہے اس لیے کہ اس کی کم مقداری پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور یہ اسی قناعت کا نتیجہ ہے کہ فن کار اپنے آپ کو دُہرایا بھی کرتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی اپنے آپ کو دُہرایا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ہم اسے پکڑ لیں۔ وہ ہر بار اپنے تجربات کے پہلو بدل دیا کرتا۔ منٹو کے اس منکشف جھوٹ کی بنیاد صرف اتنی سی بات پر ہے کہ اگر دنیا کے سارے انسانوں کی کھال یکساں ہے یہ اعتبار ردِ عمل تو ان کی رُوح بھی یکساں ہے" جیسی روح ویسے فرشتے" سے وہ گرگوں کا تراشا ہوا اصول بتلاتے۔ اگر کھال راحت اور تکلیف کے اصول کی پابند ہے تو رُوح بھی یکساں طور پر نیک و بد کی تمیز کی پابند ہے۔ کیونکہ توریت میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اس وقت باغِ عدن سے نکالا جبکہ ان میں نیک و بد کی تمیز پیدا ہو گئی تھی چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ایک زندہ آدمی کو اس کی زندگی میں انہی دو اصولوں کی کار فرمائی سے پہچانا جا سکتا ہے وہ اپنے سماج کو مخاطب کر کے پوچھتے "آخر یہ کس قسم کا کلچر ہے، یہ کون سی تجارت ہے جس میں اگر کھال راحت و تکلیف کی جواب دہی سے بے نیاز ہو جاتی ہے تو رُوح نیک و بد کی تمیز ضائع کر دیتی ہے" "کالی شلوار" سے لے کر "کھول دو" تک میں جہاں انسان کی رُوح پرواز کر جاتی ہے اور صرف شلوار رہ جاتی ہے اسی تمدن اور کلچر پر طنز ہے، ایٹمی طنز ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ منٹو کسی خاص نظام کا نام نہیں لیتا ہے لیکن کہانی کا پس منظر نظام کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے۔ منٹو کی کہانیاں اسباب کی طرف نہیں بلکہ اثرات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر سڈیشن کا مقدمہ نہیں چلایا گیا بلکہ اس بات کا کہ وہ سسٹم یا اثرات پیش کرتا ہے اس سے ہمارے کلچر اور تمدن کا مریض ہونا لازمی ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں آدمی کو آدمی کے خلاف نہیں بلکہ آدمی کو خود اس کی ذات کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اور چونکہ مرحوم کا آدمی ناخواندہ تھا جیسا کہ ہم آپ ہیں اس لیے وہ سیدھا اس کے حواس کہے جاتا۔ اس سے بہت سے لوگ چڑ جاتے۔ لیکن چڑنے کا اصلی سبب یہ نہ تھا کہ جو جنسی اشارے اور کنائے سے بتلانے کی جا سے

وہ ہماری ناک میں کیوں ٹھونسے دیتا ہے بلکہ یہ تھا کہ کیوں نہیں وہ خیرِ محض کی باتیں کرتا ہے، کیوں خیر کی بقا کے لیے شر کی ماہیت کو بھی بے نقاب کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس سے خیر کا اکلوتا پن جاتا رہتا ہے۔ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں ہی جڑواں بچے ہیں ایک کی پیٹھ دوسرے سے لگی ہوئی ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا کہتے

اگر خدا کہنے میں بھی شرم کا ایک پہلو ہے تو پھر بندگی کی خواہش کیوں کی جائے لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم صرف اپنی بندگی ہی پر فخر کرتے ہیں قصہ یہ ہے کہ یہ آدمی جس کو فلسفیوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں بڑا فلسفہ ساز بھی ہے۔ اگر ایک طرف وہ آدمی کو شکار کرنے والا فلسفہ گھڑتا ہے تو دوسری طرف شکاری کو صید کرنے والا فلسفہ بھی وہی گھڑ کر لاتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں مرحوم کے پاس کوئی فلسفہ السفہ تھا یا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کی ہر کہانی میں شکاری کے لیے اشتعال اور سوچنے والے کے لیے تحریک ہوتی۔ اس ایک گر کے علاوہ ان کے پاس لڑنے بھڑنے کا کوئی اور داؤ پیچ نہ تھا۔ نہ تو وہ اپنے افسانوں میں ہمارے شعرا کی طرح نیزہ لچکاتے، رجز پڑھتے یمین و یسار کو آواز دیتے اور نہ ہمارے جادوگر نثاروں کی طرح ہم وزن فقروں کے گنبد نقرہ ہی اچھالتے اور نہ ہمارے کرتب باز طنزیہ اور مزاحیہ مضمون نگاروں کی طرح لفظ سے لفظ اور جملے سے جملے کی پخ نکالتے جاتے۔ وہ اس قدر براہ راست قسم کے آدمی تھے کہ وہ ان چیزوں کو بھی فراڈ سمجھتے وہ تو صرف آرٹسٹ تھے۔ لفظوں کے انبار کو چیر کر مقصد تک پہنچنا جانتے تھے۔ ان کی تشبیہات و استعاروں میں الفاظ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ ہمارے بعض نازک مزاج شرفا کو ان کے اس کمال سے بھی چڑ تھی۔"

فاضل افسانہ نگار کی یہ تقریر اس قدر بے مغز ہو چلی تھی کہ سامعین کے درمیان سخت قسم کی کسمساہٹ پیدا ہو گئی لیکن چونکہ مقرر ہوشیار تھا جیسا کہ بتلایا جاتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری چھوڑ کر مزاحیہ کالم لکھنے لگا ہے اس لیے اس نے اپنی تقریر کا رُخ موڑ دیا۔

"حضرات! آپ گھبرائیں نہیں ابھی میں مرحوم کی زندگی سے متعلق مزے دار باتیں سناؤں گا۔ مرحوم نے ایک بار اُردو کے مشہور افسانہ نگار دیوندر ستیارتھی کی داڑھی کو شراب سے رنگ دیا اور یہ مصرع پڑھا۔

ع این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ"

اس پر مجمع اور بھی برافروختہ ہو گیا اور انھیں بیٹھ جانا پڑا۔ ان کا بیٹھنا تھا کہ جیب کترے صاحب جنھیں ساری دُنیا جیب کترا ہی کہتی، کھڑے ہو گئے اور بغیر مولوی صاحب کی اجازت کے تقریر کرنے لگے:

"حضرات! منٹو صاحب کے آرٹ اور زندگی پر بولنے کا حق جیسا مجھے ہے کسی کو نہیں ہے کیونکہ میں انھیں اندر سے جانتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ میں اُن کے آرٹ اور زندگی پر روشنی ڈالوں، میں اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ میں جیب کترا ہوں جس نے ایک "جھوٹی کہانی" میں بیگم میرزمان کے ہینڈ بیگ سے ان کا (LOVE LETTER) اُڑا دیا تھا اور میں نے ہی ایک ریڈیائی ڈرامے میں بملا کو اس کا ہینڈ بیگ واپس کیا تھا۔ میرا نام نہ تو کانشی ہے اور نہ گھانسی، نام اس کو دیا جاتا ہے جس کی کوئی انفرادیت ہوتی ہے اور چونکہ میں اپنے خالق کے ہاتھوں اس صفت سے محروم رہا ہوں اس لیے وہ مجھے صرف جیب کترا کہہ کر یاد کرتے اور

شارٹ فارم میں صرف جیک (TACKE) کہہ کر بلایا کرتے۔ جہاں کسی (HYPOCRITE) ملمع پوش کو جاتے دیکھا، بولے جیک اس کا چور پاکٹ مار دے۔ گویا چور دوسرا ہوتا نہ کہ میں، چنانچہ مجھے دوسرے کا چور کہا جائے کیونکہ مجھ میں اپنی انفرادیت تو ہے ہی نہیں تو یہ نام غیر مناسب نہ ہوگا۔ منٹو صاحب نے میرے وجود کی اس کمزوری سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ جب کبھی انھیں اپنے طنزیات کے لیے کوئی دوسرا نہ ملتا تو مجھے بلا لیتے، اور یہ بات تو آپ حضرات جانتے ہی ہیں کہ طنز نہ صرف منفی ہوتا ہے بلکہ اصلی تناسب سے بھی عاری ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کی کمزوریاں سامنے آجاتی ہیں اور وہ خود بیک گراؤنڈ میں چلا جاتا ہے۔ ایک طنز نگار کو برداشت کرنے کے لیے بہت ہی مہذب قسم کی سوسائٹی کی ضرورت ہے جسے آئینہ توڑنا آتا ہی نہ ہو، منٹو صاحب اصل میں اسی پیشے کے آدمی تھے اور اس کی اخلاقیات کو سختی سے برتتے، جس میں آدمی کے دشمن پر طنز کیا جاتا ہے نہ کہ اپنے دشمن پر۔ چنانچہ وہ غالب کو بہت پسند کرتے۔ ایک بار یونہی میں نے پوچھ لیا۔ "میں نے آپ کی زبان سے کبھی اکبر الہ آبادی کا کوئی مصرع نہیں سُنا۔" بولے جیک میں فرسٹ کلاس آدمی کو پسند کرتا ہوں، فرسٹ کلاس آدمی کے پاس کوئی تعصب، کوئی چور پاکٹ نہیں ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کی شیروانی کے استر میں بائیں جانب زپ لگا ہوا چور پاکٹ تھا جہاں سے اکثر ایک ملا بھی بولتا رہتا۔ غالب کے فرغل میں اس قسم کا کوئی بھی چور پاکٹ نہ تھا۔" اس پر میں نے پوچھا "آخر آپ (HYPOCRITE) سے اس قدر کیوں خفا رہتے ہیں؟" بولے۔ تو نہیں جانتا ہے، ہپوکرٹ اسٹیج کے ایکٹر کو کہتے ہیں جو زندگی میں اپنا رول نہیں بلکہ دوسروں کا رول ادا کرتا رہتا ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی بلکہ دوسروں کی بھی اپیج اور اخلاقی جرأت ماری جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا عیب دوسروں کو لگتا رہتا ہے۔ بُرا آدمی مریض ہوتا ہے نہ کہ بُرا۔" چنانچہ یہ سب اسی کا ردِ عمل تھا۔

حضرات! وہ آپ لوگوں کے درمیان جاتے یعنی اچھے آدمیوں کے درمیان جاتے جو اپنے پیشے میں ہر چند درمیانی سہی، یعنی دونوں پارٹیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنی ذات سے بالکل تندرست ہیں، کیونکہ وہ اپنے پیشے کو نہ چھپانے پر مجبور ہیں (کہیں کہیں سے تالی کی آواز سنائی دیتی ہے) منٹو صاحب حقیقت تک پہنچنے اور سوسائٹی سے اس کے مرض کو خارج کرنے کا جو راستہ اختیار کرتے اس پر ان کے بعض دوستوں سے بڑی بحث رہتی۔ وہ کہتے منظوم مسئلے کو کیوں اخلاقی سرے سے پکڑتے ہو۔ کیوں نہیں سیاسی، اقتصادی سرے سے پکڑتے ہو، کیوں نہیں طبقات، اسٹیٹ اندر سٹیٹ، ارتقا اور انقلاب کی منطق میں سوچتے ہو؟ اس کے جواب میں منٹو صاحب کہتے "تم لوگ بعض اوقات فوری مقاصد پر اتنا زور دیتے ہو کہ دور کا نصب العین نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، بعض اوقات نظام پر اتنا زور دیتے ہو کہ آدمی گم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات راستوں پر اتنا زور دیتے ہو کہ مقصد کھو بیٹھتے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم لوگ مجھے سکھانے کے بجائے میرے آرٹ کی اسپرٹ کو دیکھ سکو، اگر ایک طرف میرے لیے فرد، فرد کے مجرد یونیورسل تصوّر سے زیادہ اہم ہے اور میں اپنے افسانوں میں وہ سب پیش کرتا ہوں جو کچھ کہ انسان کرتے ہیں نہ کہ وہ سب تا ہید جو کہ انھیں کرنا چاہیے تو دوسری طرف مجھ میں ایک اخلاقی حس (SENSE) بھی ہے جو ان کے اعمال کے تانے بانے میں نیکی کے دھاگے کو ڈھونڈھ بھی نکالتی ہے، یہی میرے آرٹ کا وہ اخلاقی پہلو ہے جو کہ "ہونا چاہیے" میں پایا جاتا ہے:"

حضرات! منٹو صاحب نے اپنے آرٹ میں "ہے" کو "ہونے" سے کچھ ایسا ملا دیا ہے کہ ان کا پروپیگنڈا یا ایجی ٹیشن آرٹ بن گیا

ہے نہ کہ ان کا آرٹ پروپیگنڈا یا ایجی ٹیشن ہو کر رہ گیا ہے۔ منٹو صاحب ایک مورلسٹ اور ریلسٹ دونوں ہی ہیں جیسا کہ دنیا کے تمام بڑے فنکار گزرے ہیں۔ بدنصیب تاجر کے کلچر پر جس نے اپنی زر اندوزی اور نفع اندوزی کی دھن میں ہمیں کیا کچھ نہیں دیا، حتیٰ کہ ایٹم بم بھی دیا آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے حملہ کیا جا رہا ہے اور یہ حملہ اس کے کلچر پر ما سبق کی تمام صدیوں میں اخلاقی پہلو ہی سے کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ سیاست کا پہلو اس سے ہرگز نہیں کھاتا، کیونکہ ایسا ناممکن ہے۔ منٹو صاحب اسی گرانڈ اولڈ ٹریڈیشن کے آدمی تھے۔ وہ بالزک، گوگول، زولا، موپساں، ٹالسٹائی، چیخوف، گورکی اور پریم چند کی روایت کے آدمی تھے، گو یہ صحیح ہے کہ وہ روایت پرست نہ تھے۔

حضرات! انسانی مسائل کو دیکھنے کے یہی دو طریقے ہیں، یا تو انھیں سیاسیات اور اقتصادیات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے یا پھر اخلاقیات کی روشنی میں، ہمارے ادبا ان دونوں طریقِ کار کی اثر آفرینی اور زود رسی پر بحث و تمحیص کر سکتے ہیں۔ لیکن جو چیز بحث میں لانے کی نہیں ہے وہ یہ کہ ان میں سے کوئی بھی طریقِ کار واحد طور پر کسی فن کار کے آرٹ کو بلند نہیں کر سکتا ہے۔ یہاں لفظ واحد بہت ہی اہم ہے، اس کے لیے کچھ اور چیزیں بھی چاہئیں جن پر ہمارے ناقدین برابر روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ آرٹ وہی بلند ہوگا جو زندہ ہوگا، نہ کہ ٹھس اور جامد۔ منٹو صاحب کے آرٹ میں وہ جان موجود ہے جو کہانی کو ایک داخلی وحدت اور سالمیت میں ڈھالنے اور امیجز یا تصورات کو حواس سے مخاطب کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اس لحاظ سے منٹو صاحب ایک بڑے فن کار تھے جو کہ ان کے ہم عصر افسانہ نگار نہیں ہیں خواہ وہ اُردو میں لکھتے ہوں، ہندی میں لکھتے ہوں یا انگریزی میں، منٹو صاحب کو موپساں کے ساتھ ہی تُلانا ہوگا۔ لیکن یہ بات ادھوری رہ جائے گی اگر اس میں خلافِ موقع میں ان کی افسانہ نگاری کی کچھ تنقید نہ شامل کر دوں منٹو صاحب کی تنقید تجارتی کلچر پر (INFERENTIAL) ہے نہ کہ سمبالک یا براہِ راست، وہ آدمی پر زیادہ اور اس کے گلے میں جو پھندا ہے اس پر کم توجہ دیتے ہیں (یہاں کم کا لفظ بھی کافی اہم ہے) ان کی زیادہ تر توجہ اسی بات پر رہتی ہے کہ دیکھو اس شعلہ زور گار اس اوباش، اس نکھٹو اور بھڑوے کو یہ تجارتی کلچر کے کولھو میں پھنس کر بھی انسان ہے، اس میں نیکی کا جوہر —— ہمدردی اور قربانی کا جذبہ زندہ ہے، منٹو کا یہ رجحان جو ان کی انسان دوستی کا نشان ہے رومانٹک ہے۔ اس لیے نہیں کہ ایسا نہیں ہوتا ہے ایسا تو اکثر ہی ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ اس سے آدمی کو کولھو سے نکلنے میں مدد نہیں ملتی ہے۔ یوں تو مرحوم کو نہ تو آنٹے سے دلچسپی ہے (معلوم نہیں یہ کون سا فلسفی ہے) اور نہ کانٹ سے اور نہ کارل مارکس سے اور نہ فرائیڈ سے لیکن ان کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کونس برگ کے چینا مین (CHINAMAN) کی طرح وہ بھی اسی کو ٹھیک سمجھتے تھے کہ انسان میں اخلاقی حس (SENSE) فطری ہوتی ہے، اب یہ بات دوسری ہے کہ مرحوم اس (METAPHYSICS) کو ڈھونڈنے وہاں جاتے جہاں اس کی توقع وہ چینا مین بھی نہ کرتا۔ مرحوم کی کہانیوں میں جو ڈرامائیت ہے ان کی اسی نرالی ادا سے متعین ہوتی ہے وہ ہر کام غیر متوقع کرتے تھے، لیکن وہ اپنی اس ڈرامائیت میں اس قدر زیادہ پھنس گئے تھے کہ وہ عنصری ذہانت سے زیادہ اور اکتسابی ذہانت سے کم کام لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابھی ہمارے یہاں پڑھے لکھے اور ناخواندہ لوگوں میں کم ہی فرق ہے، کیونکہ اگر ایک علم سے بے بہرہ ہے تو دوسرا اضافی حیثیت سے علم کے تخلیقی جوہر اور تطبیق سے بے بہرہ ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ

علم کا میکانکی پتلا ہمارے لیے بالکل ہی بے کار ہے۔ کیونکہ ہمیں اپنے سماج کی ہیئت کو بھی دیکھنا ہوگا۔ ہمارے یہاں صدیوں سے کتاب انسان کے عمل سے علیحدہ رہی ہے۔ ہم بقراط، ارسطو اور اقلیدس کو اس زمانے میں بھی پڑھتے رہے ہیں جبکہ ان کی کتابوں پر خطِ تنسیخ کھینچا جا چکا تھا۔ ہمیں کچھ دنوں تک موٹی موٹی کتاب پڑھنے والے، چشمہ لگانے والے، دوسروں کے قول اقوال پیش کرنے والے، گھٹے ملاؤں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انہی کی غلط باتوں سے ہمیں صحیح باتوں کا علم ہوگا۔ لیکن مرحوم اس قسم کے ملا کی سماجی اور نفسیاتی باریکیوں میں نہ جاتے، وہ جہاں کہیں کسی آدمی کو دوسرے کا قول پیش کرتے سنتے اسے ڈِفر کر دیتے۔ ممکن ہے یہ سب اس وجہ سے رہا ہو کہ کچھ لوگ انھیں غلط طور سے پڑھنے سے پہلے چند دیو قسم کے منکرین کا نام لے لیا کرتے تھے چنانچہ ایک بار کسی شخص نے فرائڈ کے نام سے بسم اللہ کہہ کر یہ لکھ دیا کہ منٹو کی عورت "مزے دار" ہے۔ اس پر وہ سخت خفا ہوئے، بولے: جیک تو تو جانتا ہی ہے منٹو کی عورت کتنی کرکری ہے، وہ تو مرد کا بھوت بھگا دیتی ہے بھلا وہ مزے دار کیا ہوگی۔ لیکن میں نے ان کے اس وقتی ردِ عمل پر زیادہ توجہ نہ دی کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں دوسروں کی بات کو رد کر دینے کی بھی عادت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی عورت، میری مراد ان کے مؤنث کردار سے ہے، نہ تو مزے دار ہے اور نہ کرکری بلکہ وہی ہے جو ان کی ایک کہانی "سڑک کے کنارے" میں ہے۔ "عورت اور مرد دونوں ہی مل کر ایک نقطہ بناتے ہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہے۔" منٹو صاحب پوچھتے ہیں کہ "اس کائنات میں ایک رُوح کبھی کبھی گھائل چھوڑ دی جاتی ہے، کیا اس قصور پر کہ اس نے دوسری رُوح کو اس نکتے پہ پہنچنے میں مدد کی تھی؟" لیکن نا انصافی کے اس زخم کے باوجود اس کی مامتا سرد ہونے نہیں پاتی ہے وہ چھنتی رہتی ہے "میرے بھرے ہوئے درد" کے برتن کو اوندھا نہ کر دو۔" منٹو صاحب نے اپنی زندگی میں بس یہی ایک لیرک (LYRIC) لکھی ہے۔ اس لیے نہیں کہ ان میں لیریزم کسی سے کم ہے بایں کہ ان کے منہ کا مزا کڑوا رہتا جیسا کہ بعض نقادوں کے کہنے کا انداز ہے بلکہ اس لیے کہ ان کے سینے میں بہت سی گولیاں پیوست تھیں جس سے ان میں انتقام کا جذبہ اُبھر آیا تھا۔ وہ کوئی سیاسی آدمی نہ تھے۔ لیکن جب اپنی گوشہ نشینی کے باوجود دوسروں کی سیاست سے مجروح ہو جاتے تو وہ گریباں پھاڑ کر باہر نکل آتے۔ پہلی دفعہ جب انھیں جلیانوالہ باغ میں زخمی کیا گیا تو انھوں دو کہانیاں لکھیں۔ "نیا قانون" اسی کا ردِ عمل تھا۔ دوسری دفعہ جب ۴۷ء میں انھیں خود اپنے شہر میں زخمی کیا گیا تو وہ سچ مچ بہت زیادہ زخمی ہو گئے تھے۔ ایک دن بہت ہی رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔ "کیا آدمی کو اس وقت تک بہتر کایا جا سکتا ہے، جب تک کہ اس میں بھڑکنے کا مادہ نہ ہو؟" میں نے کہا "اُستاد ناممکن"۔ اس پر انھوں نے پوچھا۔ "تو اچھا یہ بتاؤ یہ مادہ کیونکر نکلے گا؟" میں نے کہا "ایک طرف سے بند کر دیتے ہیں اور دوسری طرف سے کھول دیتے ہیں۔" انھوں نے فٹ پنجابی محاورے میں کہا۔ "تو یزید کا بچہ نہیں بلکہ مجموعہ ہے۔" تقریباً ایک سال تک وہ اسی یزید کو پلٹتے رہے کہ ایک گولی ان کے سینے میں پھر پیوست ہوئی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے کسی سادہ لوح نے ان سے چچا سام کی طرف سے کہانی لکھنے کی پیشکش کر دی، ناشر لوگوں سے وہ اپنی کہانی کا برابر پیسہ لیتے اور کبھی کبھار ایڈوانس بھی لے لیتے لیکن معلوم نہیں اس پیشکش میں کیا تھا کہ وہ سخت بوکھلا گئے۔ پوچھنے لگے۔ "آخر اسے اس بات کی ہمت کیونکر ہوئی؟" میں نے کہا، دیکھیے مجھ سے تجاہلِ عارفانہ تو برتیے نہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری روح کی محافظت کے لیے جو حصار کھینچا جا رہا ہے اس میں فحش لٹریچر اور فحش تصویریں

کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ "حضرات امورلسٹ تو وہ تھے ہی، اس پوائنٹ (POINT) پر بالکل چت ہوگئے۔ پہلے تو یہ سمجھے کہ شاید میں نے ان پر کوئی حملہ کیا ہے، لیکن انھوں نے غور و فکر سے کام لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ میں نے ایک معمولی مشاہدے کی بات کہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے وہ جو دو خطوط چچا سام کو لکھے سب اسی کا ردِ عمل تھا۔ یقیناً ہالی وڈ کی ایکٹریس کو طلب کرنا کوئی پسندیدہ بات نہ تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی یہ جھنجھلاہٹ کس چیز کا نتیجہ تھی، وہ سوسائٹی میں جائز بچوں کو پسند کرتے نہ کہ فطری بچوں کو جو کہ اس وقت جرمنی اور جاپان میں ٹہل رہے ہیں۔ وہ جس قدر پکے نیشنلسٹ اور ڈیموکریٹ جمہوریت پسند تھے اتنے ہی پکے مورلسٹ تھے۔" یہ کہنے کے بعد جیب کترے نے اپنی انگلیوں کے درمیان سے ایک رقعہ نکالا اور ہوا میں لہرا کر بولا۔ "حضرات! یہ میری آخری کارستانی ہے، میں نے یہ رقعہ مرحوم کے جیبِ کفن سے اڑا دیا ہے۔ سنیے وہ اس میں کیا تحریر کرتے ہیں۔ میں آج بہت افسردہ ہوں۔ پہلے مجھے ترقی پسند تسلیم کیا جاتا تھا بعد میں یکدم مجھے رجعت پسند بنا دیا گیا ہے اور اب فتوٰی دینے والے سوچ رہے ہیں اور پھر یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں اور فتووں پر اپنا فتوٰی دینے والی سرکار مجھے "ترقی پسند" یقین کرتی ہے۔ یعنی ایک سرخا ایک کمیونسٹ، کبھی کبھی جھنجھلا کر مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگا دیتی ہے اور مقدمہ چلا دیتی ہے۔ دوسری طرف یہی سرکار اپنی مطبوعات میں اشتہار دیتی ہے کہ سعادت حسن منٹو ہمارے ملک کا بہت بڑا ادیب اور افسانہ نگار ہے۔ اس کا قلم گذشتہ ہنگامی دور میں بھی رواں دواں رہا۔ میرا افسردہ دل لرزتا ہے کہ متلون مزاج سرکار خوش ہو کر ایک تمغہ میرے کفن سے ٹانگ دے گی جو میرے داغِ عشق کی بہت بڑی توہین ہوگی۔" (جیب کفن)

"حضرات!" جیب کترے نے رقعے کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم لوگ مرحوم کی افسردگی کے دونوں اسباب کو مٹا سکیں؟"

ممتاز حسین

میرا دوست، میرا دُشمن!

اڈلفی چیمبر کی چوبی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ جیسی کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملتے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہاں تو وہ "نیا آدمی" منٹو تھا جس سے میں پہلی بار ملنے جا رہی تھی میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا۔ "چلو واپس چلیں شاید منٹو گھر پر نہ ہو۔" مگر شاہد نے میری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"وہ شام کو گھر ہی پر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔"

یہ پیچھے میرے پر سو دُرّے ایک تو منٹو، اور وہ بھی پیتا ہوا منٹو۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا۔ ایسا بھی کیا۔ مجھے کھا تو نہیں جائے گا! ہونے دو جو اُس کی زبان کی نوک پر ڈنک ہے۔ میں بُلبلہ تو ہوں نہیں جو پھونک ماری تو بیٹھ جاؤں گی۔ چرچراتی گرد آلود سیڑھیاں طے کر کے ہم منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اُکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

"آیئے آیئے۔" بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا۔ لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھینچ کر اُس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا۔ اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا اُس کے جسم پر کھدر کا کُرتہ پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔

"ارے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کالی دُبلی، سوکھی، مریل سی ہوں گی۔" اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

"اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت وبنگ قسم کے گھمبیر چنگھاڑتے ہوتے پنجابی ہوں گے۔" میں نے سوچا رسید دیتے چلو کہیں یہ ایک دم نہ ہاپیٹے پر لے لے۔

اور دوسرے لمحہ ہم دونوں پوری تندہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے کہ جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے بڑا گھاٹا اُٹھایا ہو اور اُسے پورا کرنا ہو۔ دو تین بار بات اُلجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا، لہٰذا دوسری ملاقات کے لیے اُٹھا رکھی۔ کئی گھنٹے ہمارے جبڑے مشینوں کی طرح مختلف موضوعات پر جملے کترتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اُٹھتا ہے اور جو رہا سہا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک

دوسرے کو نہایت ادبی قسم کے لفظوں میں احمق جھکی اور کج بحث کہہ ڈالا۔

گھمسان کے بیچ میں میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشیوں کے پیچھے پلکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں جنھیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پَر یاد آ گئے۔ مور کے پَر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا مگر جب بھی میں نے اُن آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پَر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بیساختہ شگفتگی مجھے مور کے پَروں کی یاد دلاتی تھی۔ اُن آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انھیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قہقہہ لگاتے، سنجیدگی سے مسکراتے، طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم میں پتھراتے! وہی نازک نازک ہاتھ پیر، بمر بوٹو کر ابھر بال پچکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت۔ پیتے پیتے اچانک منٹو کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی۔ اسے تو میں نے بچپن سے سُنا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی نہ جانے کس بات پر میں نے کہا۔

"یہ بالکل غلط۔" اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

"آپ کج بحثی کر رہی ہیں۔"

"حماقت ہے یہ۔"

"دھاندلی ہے عصمت بہن۔"

"آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"بس یونہی۔ عموماً میں عورتوں کو بہن کم کہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا۔"

"تو پھر مجھے چڑانے کو کہہ رہے ہیں۔"

"نہیں تو وہ کیسے جانا آپ نے؟"

اُس لیے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے چڑاتے اور مارتے پیٹتے رہے یا پکڑ کر پٹواتے رہے۔" منٹو زور سے ہنسا۔

"تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا۔"

تو اتنا یاد رکھیے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟"

"علاج؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے تمھیں ٹی۔ بی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میں نے مر کر اُن کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا۔ اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں۔ ان سے تو مسمریزم اور جادو گری کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔"

"یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔"

"کون بزرگ!"

"میرے بھائی عظیم بیگ، نو من مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آئے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے۔ شاہد جو ہماری چھڑپیں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رہے تھے بھوک سے تنگ آ چکے تھے۔ ملاد پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا لہٰذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے روٹی لینے چلا گیا۔

"ذرا اُس برنی سے آچار نکال لیجیے۔ منٹو نے تیزی سے میز پر کھانا لگایا اور کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہی میز جو دم بھر پہلے ادبی کارگذاریوں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے "پہلے آپ" کہے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے بیچ میں گرما گرم مباحثہ چلتا رہا۔ گھوم پھر کر "لحاف" کے بخیہ ادھیڑنے لگتا جو ان دنوں میری دُکھتی رگ بنا ہوا تھا۔ میں نے بہت ٹالنا چاہا مگر وہ ڈھٹائی سے اڑا رہا اور اُس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا۔ اُسے بڑا دھکا لگا یہ سُن کر کہ مجھے "لحاف" لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب جلی کٹی سُنا ڈالیں اور مجھے نہایت بُزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔ میں "لحاف" کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مُصر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں "لحاف" سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت کھل کر۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بیہودہ سے بیہودہ بات دھڑ سے اس معقولیت اور بھولپن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں۔ اُس کی باتوں پر ہنسی آ جاتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔

چلتے وقت اُس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔

"صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔"

"آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

"بہت یاد آ رہی ہے۔ تو اُسے بلا کیوں نہیں لیتے۔" میں نے کہا۔

"ارے.... کیا سمجھتی اُس کے بغیر سو نہیں سکتا۔" وہ اپنی اصلیت پر اُترنے لگا۔

"نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔" میں نے بات ٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

"آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے؟" میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔

"محبت!" وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اُسے گالی دی ہو۔ مجھے اس سے قطعی محبت نہیں۔" اُس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں۔ "میں محبت کا قائل نہیں۔"

"ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا

"نہیں"۔

"اور آپ کے کبھی گلسوئے بھی نکلے۔ خسرہ بھی نہیں ہوئی۔ مگر کالی کھانسی تو ضرور ہوئی ہوگی۔" وہ ہنس پڑا۔

"محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے محبت ماں سے بھی ہوتی ہے، بہن اور بیٹی سے

بھی ...... بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ چپلوں اور بُوٹ جُوتے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کو اپنی کُتیا سے محبت ہے، ہاں مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔" وہ بیٹے کے خیال پر اُچک کر کرسی پر اُونچا ہو گیا۔ خدا کی قسم اتنا سا پیرُں چلتا تھا۔ بڑا شریر تھا۔ گھٹنوں چلتا تھا تو فرش کی درازوں میں سے مٹی نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا مانتا تھا۔" عام باپوں کی طرح منٹو نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

"آپ یقین کیجیے چھ سات دن کا تھا کہ میں اُسے اپنے پاس سلانے لگا۔ میں اُسے خود تیل مل کر نہلاتا۔ تین مہینے کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو بس پڑی سوئی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دُودھ پلوا لیتا۔ اُسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلوانے سے پہلے بوڑی کلون یا اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہیے۔ نہیں تو بچے کے منہ میں دانے ہو جاتے ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور میں حیرت سے اُسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مرد ہے جو بچے پالنے میں مشاق ہے۔

"مگر وہ مر گیا۔" منٹو نے مصنوعی مسرت چہرہ پر لا کر کہا ——"اچھا ہوا جی وہ مر گیا۔ مجھے تو اُس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اُس کے پوترے دھوتا ہوتا۔ نکما ہو کر رہ جاتا۔ مجھ سے کوئی کام تھوڑا ہوتا۔ سچ مچ عصمت بہن مجھے اس سے عشق تھا۔"

"چلتے چلتے اُس نے پھر کہا کہ صفیہ آنے والی ہے بس جی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے مل کر۔"

اور واقعی صفیہ سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔ منٹوں میں ہماری اتنی گھُٹ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں۔ جو صرف عورتیں ہی کہتی ہیں جو مردوں کے کانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفیہ کو یُوں سر جوڑے کھُسر پھُسر کرتے دیکھ کر منٹو جل گیا اور طعنے دینے لگا۔ اُس نے پچھلے کمرے کی چوبی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سُن لی تھیں۔ وہ شریر بچوں کی طرح بولا۔

توبہ توبہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی گندی باتیں کرتی ہیں۔"

صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔

اور آپ سے تو عصمت بہن مجھے قطعی اُمید نہ تھی کہ یوں محلے کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کریں گی۔ کب شادی ہوئی شادی کی رات کیسی گذری۔ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا۔ توبہ ہے۔" وہ چڑانے لگا۔

میں نے فوراً لگام لگائی۔ "حد ہے منٹو صاحب میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ ارے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندگی کیا ہے۔ بچہ کی پیدائش دُنیا کا حسین ترین حادثہ ہے اور یہ کانا پھُوسی ہی تو ہمارا ٹریننگ اسکول ہے کیا سمجھتے ہیں آپ کیا کالج میں مجھے بچے دینا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے بوڑھے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھوں چڑھا کر توبہ توبہ کہتے رہے۔ محلّے کی عورتوں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔

"یہ صفیہ سخت جاہل ہے۔ ادب ودب کچھ نہیں سمجھتی ہر بات پر تھو تھو کرتی ہے۔ آپ کی تحریروں سے سخت

خفا ہے۔ آپ کا جی نہیں گھبراتا۔ اس سے گھنٹوں باتیں کرکے۔ کہ قورمے میں کتنی ہلدی، اور کی دال کے دہی بڑے......

"اے منٹو صاحب قورمے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے۔" صفیہ نے ہیبت زدہ ہو کر کہا۔

اور منٹو اکھڑ پڑا۔ وہ بضد تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہیے اور جو نہیں پڑتی تو یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ "میرا ایک راجپوت دوست تھا وہ گھی اور ہلدی پی کر جاڑوں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ پورا پہلوان تھا۔" اور ہم مُصر تھے کہ آپ کا دوست گھی اور ہلدی چھوڑ کر کیچڑ پیتا تھا۔ ہم کسی شرط پر ہلدی ڈالنے کو تیار نہیں اور منٹو کو قائل ہونا پڑا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کرکے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے۔ اور بعض اوقات بحثیں اتنی طویل اور گھن دار ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سُوت کی پونیاں اُلجھ گئی ہیں اور واقعی سوچنے اور سمجھنے کی قوت پر جھاڑو پھر گئی۔ مگر دونوں بخشے جاتے، اُلجھے جاتے، بدمزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا۔ مگر منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا آنکھیں مور پنکھوں کی طرح تن کر پھیل جاتیں۔ نتھنے پھڑکنے لگتے، منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجلا کر اپنی حمایت میں شاہد کو پکارتا۔ اور جنگ، ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو بھنا کر چلا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑتے کہ "تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں، وہ بدتمیز آدمی ہے۔ کچھ کہہ بیٹھے گا تو میری اُس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔"

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی۔ ممکن ہے روٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے۔ بجواب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منٹو کی خودداری رعونت کی مرحلوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا۔ اور اگر ان دوستوں کے سامنے جن کو وہ مرعوب کر چکا ہو کوئی اُس کا مذاق بنا دے تو وہ بُری طرح چڑ جایا کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو پلے کے ہیں ایک دوسرے کو کہہ سُن سکتے ہیں مگر عام لوگوں کے سامنے ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔

لیکن صبح لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے ہی گھل مل کر باتیں ہوتیں۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے سے بڑے اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بولتے۔ ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے۔ مگر میرا جلد ہی اس تصنع سے دل اُکتا جاتا اور اُس کا بھی۔ اور پھر چلنے لگتی دونوں طرف سے آتش بازی۔ اور گویوں کی سی تندی آ جاتی۔ کبھی لوگ ہم دونوں کو یوں اُلجھا کر مزہ لینے لگتے اور ہم پھر جل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لیے نہ کہ اُن کے لیے بٹیر بن کر تکلف پیدا کرتے۔ منٹو کی یہی رائے تھی کہ گھر پر چاہے جتنی اُلٹی سیدھی بحث کریں مگر محفلوں میں ہمیں مورچہ بنا کر جانا چاہیے اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہوگا کہ لوگوں کے چھکے چھڑا دے گا۔ مگر مجھے عموماً مورچہ سے اپنی وفاداری کا احساس نہ رہتا اور مورچہ بھڑوں کے چھتے کی طرح پھنکارنے لگتا۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔ میں نے اُس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لُکنت

نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پیئے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں اور جان کو آجاتا تھا۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں عصمت بہن میں بالکل نشہ میں نہیں اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں ـ میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں آپ شرط لگائیے۔"

"میں شرط نہیں لگاؤں گی کیونکہ آپ ہار جائیں گے۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے...... اور آپ نشے میں ہیں۔"

کیسا کیسا منٹو ثبوت دیتا کہ وہ نشے میں نہیں اور اسی وقت پینا چھوڑ سکتا ہے۔ صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آ کر مجھے شرط لگانی پڑی اور منٹو شرط ہار گیا۔ میں جیت گئی۔ مگر کیا؟ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب منٹو کو بہت چڑھتی اور وہ شرط لگانے پر اڑ جاتا اور سوائے شرط لگانے کے گلو خلاصی نظر نہ آتی تو ہار کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

منٹو کو خود ستائی کی عادت تھی۔ مگر عموماً میرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا۔ اور اس وقت میرے اور اپنے سوا دُنیا میں کسی کو ادیب نہ مانتا۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیویندر ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا۔ اگر ان کی تعریف کرو تو سُلگ اُٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو جلی کٹی سنانے لگتا۔ ایک سرے سے ان کے وجود کو ہی سم قاتل سمجھتا خاص طور پر ادب کے لیے۔

"بکواس کرتے ہیں یہ لوگ۔" وہ جل کر کہتا۔ جو یہ کہتے جائیں بس اُس کا اُلٹا کرتے جاؤ۔ یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں چھُپ چھُپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور اُن سے کچھ سیکھنے کے بجائے لُطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اُس لطف کی یاد پر نادم ہو کر اول فول لکھتے ہیں۔ وہ کبھی اتنا چڑ جاتا کہ میں اُسے تسلّی دینے کو کہتی جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں۔ اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ لیجیے مگر رائے عامہ کو تو مطعون نہ کیجیے۔ مگر وہ بھنّاتا رہتا۔

ایک دن بڑی سنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

"مقدمہ دائر کریں گے۔"

میں نے کہا "کون۔"

کہنے لگے "ہم۔ یعنی میں اور آپ۔ اُس مردود نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یہ لکھ کر چھاپی ہے کہ یہ فحش ہے۔ ایسے ادب سے مُلک کو بچانا چاہیے اب اُس کمبخت سے پوچھو کہ کیسی اُلٹی بات کر رہا ہے۔ ایک تو وہ اُسے کتاب میں چھاپ کر مشتہر کر رہا ہے۔ دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے۔ اُس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں اسے نوٹس دلا رہا ہوں کہ ہرجانہ دے۔" پھر نہ جانے بھُول بھال گئے۔

منٹو اپنی ڈینگو سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شیخی بگھارا کرتا تھا۔ رفیق غزنوی سے کچھ عجب قسم کی محبت تھی جو سمجھ میں نہ آئی۔ جب اُس کا تذکرہ کیا یہی کہا "بڑا بدمعاش لفنگا ہے۔ ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں جس کی اُس نے اپنے جوُتے پر ناک نہ گھسوائی ہو۔"

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اُس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہا۔ میں نے کہا کیا کروں گی مل کر، آپ تو کہتے ہیں لفنگا ہے وہ۔

کہنے لگے ارے جب ہی تو ملا رہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش بُرا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے۔

میں نے کہا "منٹو صاحب لفنگا، شریف، بدمعاش یہ آخر کیسا آدمی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے جتنا ذہین اور تجربہ کار سمجھتے ہیں شاید ویسی نہیں"

"آپ بنتی ہیں" منٹو نے بُرا مان کر کہا۔ "تبھی تو آپ کو رفیق سے ملانا چاہتا ہوں ——— بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی"

"میں بھی تو عورت ہوں" میں نے فکرمند بن کر کہا۔ اور وہ کھسیانا ہو گیا۔

"میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں"

"مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے۔ منٹو نے قہقہہ لگایا۔

"ہو سکتی ہے! یہ خوب کہا۔ مگر منٹو کو ضد ہو گئی" "آپ کو اُس سے ملنا پڑے گا۔ دیکھیے تو سہی"

"میں اُسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کمبخت پر عاشق نہ ہونا پڑے"

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دُنیا کے ساتوں عیب کرنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مہذب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدمعاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی یہ منٹو کا میدان ہے وہ دنیا کے ٹھکرائی گھورے پہ پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چُن کر نکال لاتا ہے۔ گھورا کریدنے کا اُسے شوق ہے کیونکہ دُنیا کے سنوارنے والوں پر اسے بھروسہ نہیں۔ اُن کی عقل اور فیصلہ پہ بھروسہ نہیں۔ وہ اُن کی شریف اور پاکباز بیویوں کے دل کے چور پکڑ لیتا ہے اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈی کے دل کے تقدس سے اُس کا موازنہ کرتا ہے۔ عطر میں ڈوبی ہوئی عیش پسند دولہن سے میل اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھاٹن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔ "بو" میں حالانکہ جسم ہی جسم ہے۔ غور سے دیکھیے تو جسم کے اندر روح بھی ہے۔ عیش پرست طبقہ کی پھٹے ہوئے دُودھ کی طرح پھٹکیوں دار روح اور کچلے ہوئے طبقے کی تصنع سے دُور اصلیت۔ اگر طبقاتی تفرق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا اور وہ اُس بُت کو جس کی دُنیا پوجا کرے، زمین پر پٹخنے میں بڑی بہادری محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ سنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہہ دیا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے ان کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی آبروریزی کی اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے

لگا کہ یہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

"سب جھوٹ!" میں دھاندلی کرنے لگی۔

"ارے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بازار میں جو چاہے جا سکتا ہے۔"

"مگر ان لوگوں کی اتنی ہمت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جا سکیں۔ بہت کرتے ہوں گے گانا سُن کر چلے آتے ہوں گے۔"

"مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر۔"

"گانا سُننے۔" میں نے چڑایا۔

"جی نہیں، اپنے دام وصول کرنے اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے۔" پھر بھی میں نے کہا۔

"میں نہیں یقین کرتی۔"

"وہ کیوں؟" وہ اُٹھ کر بالکل میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"بس میری مرضی۔ آپ میرے اُوپر رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"بھئی خدا کی قسم میں کہتا ہوں میں گیا ہوں۔"

"خدا پر آپ کو یقین نہیں بیکار اُسے نہ گھسیٹیے۔"

"اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک بار نہیں بلکہ ......"

"مرحوم بچے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

اور منٹو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا کہ آج تو منوا کر رہوں گا کہ میں رنڈی باز ہوں۔ صفیہ کی گواہی دلوائی میں نے دو منٹ میں صفیہ کو چت کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ رنڈی کے یہاں جا رہے ہیں۔ اور اگر گئے بھی ہوں تو سلام کر کے چلے آئے ہوں گے۔

صفیہ چُپ سی ہو گئی۔ "اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آ گئے یا ......" وہ عجب گومگو میں رہ گئی۔

منٹو نے جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پی ڈالی اور بُری طرح لڑنے لگا کہ یہ تو آج منوا کر چھوڑوں گا کہ میں پکا رنڈی باز ہوں اور میں نے کہہ دیا آج اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے میں مان کے دوں گی نہیں۔

ایک تو نشہ دوسرے منٹو کے مزاج کی جبلی تلخی۔ اگر بس چلتا تو میرا منہ نوچ لیتا۔

صفیہ نے بسور کر کہا بہن مان جاؤ۔ شاہد نے کہا بس اب گھر چلو۔ مگر منٹو نے شاہد کی ٹانگ لینی شروع کی۔ اور کہہ دیا کہ بغیر قائل ہوئے جانے نہیں دوں گا۔ خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سنجیدگی سے منٹو نے شاہد سے کہا چلو رنڈی کے یہاں ابھی اسی وقت آج میں قائل نہ کر دوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں شُور کا دودھ پیا۔ مگر میں نے اور چڑایا۔

آپ جائیں وائیں گے نہیں یونہی بانکلا برج پر گھوم کر آ جائیں گے اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ۔"

اب تو منٹو کے سر میں لگی تو ایڑی میں جا کر شاید ہی بُجھی ہو۔ غصّہ ضبط کر کے پُوچھا۔

"پھر کیسے یقین دلایا جائے"۔

میں نے کہا۔ "ہمیں یعنی مجھے اور صفیہ کو بھی ساتھ لے چلیے"۔

"میں نہیں جاؤں گی" صفیہ بگڑی۔ "تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے تم ہی جاؤ"۔

"جائے گی کیسے نہیں" منٹو غرّایا۔

"چلو چلو"..... صفیہ کو ہم نے آنکھ ماری اور چاروں چلے۔ دروازے سے ہم دونوں تو نکل آئے۔ منٹو کو صفیہ نے نہ جانے کیسے قابو میں کیا۔ دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے خوب قہقہے لگائے اور پھر چپکے سے کہا "مگر اب تو مان جاؤ"۔

میں نے کہا "قطعی نہیں"۔

مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا یا جو کچھ اُس نے رنڈی کے بارے میں لکھا وہ اُس کے اپنے اصول اور یقین کی بنا پر ہے۔ کیونکہ اگر وہ رنڈی کے کوٹھے پر گیا بھی ہو گا تو وہاں رنڈی سے زیادہ اُس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہو گا جو باوجود دیکھ موری کا کیڑا ہے مگر زندگی کی قدروں کو پیار کرتی ہے۔ اچھے اور بُرے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انھیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے اُن کا اندازہ لگایا تھا۔ خوشیا جیسے ڈھیٹ اور نِکمّے انسان کی رگ حمیت بھی بھڑک سکتی ہے۔ گوپی ناتھ جیسا رقیق انسان بھی دیوتاؤں پر بازی لے جا سکتا ہے۔ بلند و جہان دیوتا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں۔ قومی رضا کار بدکار بھی ہو سکتے ہیں اور لاش سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہوتا کہ دوستی ٹوٹتی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اُتر آیا دانت پیس کر بولا۔

"آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹّے ہو جاتے"۔

"دل کا ارمان نکال لیجیے مروّت کی ضرورت نہیں" میں نے چڑایا۔

"اب جانے بھی دیجیے کوئی مرد ہوتا تو بتاتے"۔

"بتا بھی دیجیے۔ ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں نکال بھی دیجیے"۔

"آپ جھینپ جائیں گی"۔

"قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی"۔

"تو آپ عورت نہیں"۔

"کیوں کیا عورت کے لیے جھینپنا اشد ضروری ہے۔ چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے۔ بڑا افسوس ہے منٹو صاحب آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ اصول بناتے ہیں میں سمجھتی تھی آپ "عام لوگوں" کی سطح سے بلند ہیں" میں نے مسکہ لگایا۔

"قطعی نہیں..... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا"۔

"تو پھر کہیے نہ وہ جھینپا دینے والی بات۔"

"نہیں۔ اب غصہ اُتر گیا۔" وہ ہنس کر بولا۔

"اچھا دوستی ہی بس سہی بتایئے وہ کونسی خطرناک بات تھی۔"

"کچھ نہیں ...... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دے دیتا۔"

"بس؟" میں نے نااُمید ہو کر کہا۔

"یا شاید کس کے جھانپڑ مارتا۔" نادم ہو کر بولا

"مجھ پر کچھ اثر نہ ہوتا میں نے ایسی لحیم شحیم گالیاں سنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے تھپڑ بھی خاصے زور کے پڑ چکے ہیں۔ مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار۔" اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشان ہو کر میں نے سوچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کروں پھر واپس ملا دجاؤں۔ دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا جا کر دیکھا تو صفیہ منہ پھلائے لیٹی ہے۔ منٹو ہاتھ میں جھاڑو لیے سٹاسٹ پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے۔ اور ناک پر گرتے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں۔" میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

"کرکٹ کھیل رہا ہوں۔" منٹو نے بڑی بڑی مور پنکھ جیسی پتلیاں گھما کر جواب دیا۔

"یہ لیجیے! ہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لوگ روٹھے بیٹھے ہیں۔" میں نے واپس جانے کی دھمکی دی۔

"ارے! صفیہ اُٹھ بیٹھی۔ آؤ آؤ نہ۔"

"کا ہے کا جھگڑا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں میں نے کہا کھانا پکانا گرہستی وغیرہ مردوں کا کام نہیں۔ بس جیسے تم سے اُلجھتے ہیں مجھ سے بھی اُلجھ پڑے کہ کیوں نہیں مردوں کا کام میں ابھی جھاڑو دے سکتا ہوں میں نے بہت روکا تو اور لڑے، کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے۔" صفیہ نے بسور کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے بن کر کھانسنا شروع کیا۔ "صبح ہی صبح میونسپلٹی کے بھنگی نے صحن صاف کرنے کے بہانے دھول حلق میں جھونکی اب آپ ارمان نکال لیجیے۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے۔"

جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو ہوٹل سے برف لانے چلا گیا۔ صفیہ ہنڈیا بگھارنے چلی گئی۔ برف لا کر منٹو نے تولیہ دیوار پر مار مار کر توڑی اور پلیٹ میں بھر کر سامنے رکھ دی اور اکڑوں بیٹھ گیا۔

"اور سنایئے۔" اُس نے حسب عادت کہا۔ ہانڈی کے بگھار سے مجھے زور سے اُبکائی آئی۔

"اُوہ یہ صفیہ کیا مردہ جلا رہی ہے" میں نے ناک بند کر کے کہا۔ منٹو نے چونک کر مجھے دیکھا سر سے پیر تک بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں اور چھلانگ مار کر جھپٹا۔ باورچی خانے میں صفیہ چیختی رہی اور اُس نے پھر لوٹا پانی پتیلی میں جھونک دیا۔

واپس آ کر وہ سہما سہما رسان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا۔

میں بیوقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑبڑاتی آئی تو اُسے زور سے ڈانٹا پھر بڑے شرمیلے انداز سے بولا۔

"آپ کے پیٹ میں بچہ ہے" جیسے بچہ میرے نہیں خود ان کے پیٹ میں ہو" میں نے فوراً تاڑ لیا۔ جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اُسے بھی بگھارے اُبکائی آتی تھی"۔

"منٹو صاحب خدا کے لیے دائیوں جیسی باتیں نہ کرو"۔ میں نے چڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

"ارے واہ۔ اس میں کیا بُرائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں"۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کُرتے کے دامن میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں چھیل کر بڑی نفاست سے نمک مرچ لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"صفیہ ارے صفیہ"۔ وہ چلایا۔ صفیہ دھوئیں سے اُٹی آنکھیں آنچل سے پونچھتی ہوئی آئی۔ کیا ہے منٹو صاحب کتنا چلاتے ہو۔"

"ارے بیوقوف۔ ان کا پیر بھاری ہے"۔ اُس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"اُف گندگی کی انتہا ہے۔ جبھی تو آپ کو لوگ فحش نگار کہتے ہیں"۔ میرے اس بگڑنے پر منٹو خوب چہکا۔ اور بڑی بوڑھیوں جیسے مشورے دینے لگا۔

"پیٹ پر زیتون کے تیل کی مالش سے گھرونچے نہیں پڑیں گے"۔

"تمہارا منہ سیب کا مربہ کھانے سے اُبکائیاں نہیں آئیں"۔

"کھوپرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا"۔

"جاپے میں برف نہ چبائیے گا۔ نلے سوج جاتے ہیں۔ کیوں صفیہ؟"

"ہٹو منٹو صاحب کیسی باتیں کرتے ہو"۔ صفیہ کھسیا کر رہ گئی۔

اور جب سیما پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس بیٹھی کانپتی رہی۔ مگر بچی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا وہ دیر تک مجھے اُس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتا رہا۔ صفیہ کا دل پگھل گیا اور سال کے اندر اندر منٹو کی بڑی بیٹی پیدا ہو گئی۔ پونا سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا۔ میں فوراً گئی تو منٹو نے مکان بدل لیا تھا۔ ڈھونڈھ ڈھانڈ کر نئے مکان پہنچی تو دیکھا ڈرائنگ روم میں الگنی پر پوتڑے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا رہے ہیں۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور بغیر ہوا کا تھا۔ منٹو نے اس لیے بدل لیا کہ اُس کا فرش گندہ تھا بچی گھٹنوں چلتی تو چانس لگ جاتی۔ اور مٹی چاٹ جاتی۔ یہاں نکہت مزے سے فرش پر کھیل سکے گی۔ حالانکہ نکہت چند ہفتوں کی تھی۔

"مجھے بچے سخت ناپسند ہیں"۔ منٹو سنجیدگی سے کہتا۔ جان کو چمٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لیے ڈر لگتا ہے۔ ہر

وقت انھیں کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔" وہ دودھ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا۔ میری بھتیجی ملینو اُسے بڑی پیاری تھی گھنٹوں اس کے ساتھ گڑیوں اور ہنڈکلیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرانٹس پر کھڑکی سے بانس ڈال کر اُس کے لیے املیاں توڑ کر نیچے سے گرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا۔ سیما کو پاٹے پر بٹھا کر "شی شی" کرتا۔ اور بچوں کا بہت شائق تھا کیونکہ وہ اُن کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم ملاڈ میں رہتے تھے۔ رات کے کوئی ساڑھے بارہ ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی معلوم ہوا صفیہ سانس پھُولی ہوئی سی کھڑی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولی" میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیے مگر وہ کہاں سُنتے ہیں۔" منٹو مع نند آجی اور خورشید انور کے آ گئے۔

"یہ صفیہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی۔" ہاتھ میں بوتل اور گلاس لیے تینوں در آئے۔ شاہد نے پارٹی کو لبیک کہا طے ہوا بہت بھُوکے ہیں ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں، ریل کا وقت گذر گیا۔ کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھا لیں بس آٹا دال دے دو۔ خود باورچی خانے میں جا کر پکا لیں گے۔

صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانے پر چڑھائی کر دی۔ منٹو آٹا گوندھنے لگے۔ نند آجی انگیٹھی پر ٹوٹ پڑے اور خورشید انور کو آلو چھیلنے کو دے دیئے گئے جو چھیلنے سے زیادہ کچے کھانے پر مُصر تھے اور پھر پوری بھی باورچی خانے میں آگئی۔ لوگ پھسکڑا کر وہیں بیٹھ گئے اور کچے پکے پراٹھے پکاتے گئے کھاتے گئے۔ منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا اور بڑے سلیقے سے روٹی پکائی اور پھر جھٹ سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی۔ کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی برآمدے تک نہ گھسیٹا جاتا ـــــ

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ معقول آمدنی ہو، پینا پلانا ہو، قہقہے ہوں اور بے فکریاں۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اُسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ لاہور میں بھی لُطف آگیا۔ خوب دعوتیں اُڑائیں۔ اسی بہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری کے جُوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے۔ جیسے کنول کے پھُول۔ زری کے جُوتے بہت جچنے لگے۔

"میرے پیر بڑے بھدّے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جُوتے" میں نے کہا۔

"اور میرے پیر اتنے زنانے ہیں کہ مجھے اُن سے شرم آتی ہے۔" مگر ہم نے کئی جوڑے جُوتے خریدے۔

"آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں" میں نے کہا۔

"بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل لیں۔"

"بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں" میں نے رائے دی۔

"بخدا مجھے کوئی اعتراض نہیں" منٹو نے جھک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی جھڑپیں ہوئیں مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

"محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنے زری کے جُوتے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچوں بیوی سے محبت ہے۔"

"میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے۔"

"ہاں...... میں سمجھ گیا۔ منٹو نے دُور ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سوچتے ہوئے خود سے کہا کشمیر میں ایک چرواہی تھی۔"

"پھر؟" میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارہ دیا۔

"پھر کچھ نہیں۔" وہ ایک دم بچاؤ کے لیے تن گیا۔

"آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرما رہے ہیں۔"

"کون گدھا شرما رہا ہے۔" منٹو نے واقعی شرما کر کہا...... بڑی مشکل سے اس نے بتایا۔

"بس جب وہ مویشی ہانکنے کے لیے اپنی لکڑی اُوپر اُٹھاتی تھی تو اُس کی سفید کہنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بیمار تھا۔ روز ایک کمبل لے کر پہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور سانس روکے اس لمحے کا انتظار کرتا تھا جب وہ ہاتھ اُوپر کرے تو آستین سرک جائے اور مجھے اُس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے۔"

"کہنی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں...... میں نے سوائے کہنی کے اُس کے جسم کا اور کوئی حصّہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کے لیے لپکتی تھیں۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک دن میں کمبل پر لیٹا تھا وہ مجھ سے تھوڑی دُور آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ مجھے دکھاؤ تو شرم سے اُس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اور بولی کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ رُہانسی ہو گئی مگر میں بھی ضد پر اَڑ گیا۔ اور آخر کو بڑی رد و کد کے بعد اُس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی میرے سامنے کر دی اور خود شرم سے گھٹنوں میں منہ دے لیا۔

"کیا تھا اس کی ہتھیلی پر۔" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"مصری کی ڈلی! اُس کی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا۔"

"میں دیکھتا رہ گیا۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

"پھر؟"

"پھر وہ اُٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دُور سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیص کی جیب میں پڑی رہی۔ پھر میں نے اُسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیونٹیاں کھا گئیں۔"

"اور لڑکی۔"

"کونسی لڑکی؟" وہ چونکا۔

"وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھما دی۔"

"اُسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔"

"کس قدر پھُس پھُسا ہے آپ کا عشق!" میں نے ناامیدی سے چڑ کر کہا۔ مجھے تو بڑے کسی شعلہ بداماں قسم کے عشق کی اُمید تھی"

"قطعی پھُس پھُسا نہیں۔" منٹو لڑ پڑا۔

"بالکل ردّی...... تھرڈ ریٹ۔ مرگھلا عشق۔ مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔ بڑا تیر مارا۔"

"تو اور کیا کرتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرامی پلا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا؟" وہ بگڑا۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ مصری کی ڈلی کڑکڑا کر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چُوسنے کی چیز ہے۔"

یہ وہی منٹو تھا۔ فحش نگار۔ گندہ دہن۔

جس نے 'بُو' لکھی تھی۔

جس نے 'ٹھنڈا گوشت' لکھا تھا۔

لیکن مرزا غالب میں جو بعوبن بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہو یا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور ہے۔ جسے وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔ جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تضاد جو منٹو کی مختلف کہانیوں میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ 'نیا قانون' لکھتا ہے اور دوسری طرف 'بُو'..... دونوں میں وہ خود کو غرق کر کے لکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک فحش نگار یاد رہ جاتا ہے اور واقعہ نگار کو وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہواً؟..... ایک ہی بات ہے!

ملک میں فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے کے بعد اُس کوٹھی کے دہاں اُس کوٹھی میں کیسے جانے لگے۔ منٹو اُس وقت فلمستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اُس کی زندگی کا سہارا تھی اُسے ملتی تھی کہ اس کی فلم "آٹھ دن" کامیاب نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اُسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مکرجی نے نہ جانے اُسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم اُن کے خلاف ہو گیا۔

بکواس ہے مکرجی۔ فراڈ ہے پکا! وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اُس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لیے سینیریو ڈیپارٹمنٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔ "اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے۔ تہلکہ مچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی اشوک کمار ہیرو۔ بس پھر دیکھیے گا۔"

ایک کہانی منٹو کی زیرِ غور تھی۔ اشوک کو وہ پسند تھی۔ اُس سے پہلے اُسے مجبور کی کہانی پسند تھی پھر دل سے اُتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی۔ میرے آنے کے بعد اُسے میری کہانی ضدی پسند آگئی۔ خیر منٹو کو ناگوار نہ گزرا۔ اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پر۔ نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی ہونے لگے۔ اِدھر کمال امروہی محل کی کہانی لے کر آگئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آگئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزّت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطار ہی میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو۔ تنخواہ ملتی رہے گی کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی۔ لہٰذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کہانی ضدی کو منوانے کی طرف لگ گئیں اور بغیر اشوک کمار کے دوسرے درجہ کی تصویروں کی قطار میں ضدّی بنائی جانے لگی۔

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی! منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی اُدھیڑ بُن کیا کرتا کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر، کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کَل اشوک کمار کو پسند نہ آئی۔ مگر منٹو یہی کہتا۔

”آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں، میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا۔“

”آپ کی کہانی میں اُس کا رول رومینٹک نہیں باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کرے گا۔“ اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی۔ مگر ادبی زبان سے یہاں اپنی فکر پڑی تھی۔ اور وہی ہوا کہ ”ضدی“ اور ”محل“ بن گئیں۔ منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو کو اس کی اُمید نہ تھی اور اُسے بڑی ذلّت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اُدھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بیوی بچے اُسے پاکستان بلانے لگے۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ملیں گی۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔ بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بددل ہو گیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر یوں کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا منٹو کتنا بُزدل ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنا لینے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اُس سے نفرت سی ہو گئی۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور ملے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہتک محسوس ہوئی۔

پھر جب اُس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہمیں اُس نے پھر بلایا تھا۔ ضدی ختم ہو گئی تھی اور ہم نے آرزو شروع کر دی تھی۔ بُرے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ اُس کے پھر دو خط آئے۔ اُس نے بلایا تھا، ایک سینما الاٹ کروانے کی اُمید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دُکھ ہوا۔ اُس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا۔ مگر اب تو اور بھی ماننا پڑا۔ مگر میں نے اُس کے خط پھاڑ دیئے اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے اُسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سُنا منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ منٹو کا ایک خط آیا۔ "کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوا لو۔"

پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا۔ بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں نہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ جیل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر کرشن جی سے کہہ کر بمبئی بلوا لو تو بہت اچھا ہو۔ اُس کے بعد عرصہ تک کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر سُنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے! اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اُس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو۔ مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی آتی کڑوی خبریں سُنیں کہ جی اُوب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں پیشگی پیسہ دو تو سب کھا جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اُوپر لکھنے کو کہا تھا۔ اور بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا آج صرف ایک کسک زندہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا اور میں زندہ ہوں؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے۔ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں۔ اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا یہی نا کہ اُس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں جو نہ دُکھتا ہے نہ رِستا ہے خاموش سلگتا رہتا ہے۔

آج مجھے صفیہ بے طرح یاد آ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ایک بار سر جوڑ کر ہم ویسے ہی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ہوئے اڈلفی چیمبر میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں سہاگ رات اور پہلوٹھی کے بچے کی باتیں، یہ ہیں موت کی باتیں۔ ابھی سے ڈر رہی ہوں اور میرا قلم ختم ہو جاتا ہے۔ نہ جانے ان چند سالوں میں اُس پر کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دُنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی تمہاری محبت اُس طوفانی ہستی کا سہارا چٹان بن کر دیتی رہی۔ یا تمہارا پیار تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمہیں جھنجھوڑ کر پست کر گیا یا تم اب بھی اپنے منٹو صاحب کی صفیہ رہیں۔ پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اُس کی بدروی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں۔ ان خاموش گھیسوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جو بے مروتی اور لاپروائی سے تمہارے اردگرد منڈلایا کرتی تھیں۔ دم تو گھُٹ جاتا تھا۔ کیا اُس نے تمہاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا اور بھرے خاندان میں اکیلا ہی سدھارا۔ کیا بچیاں اپنے باپ

کو پاگل مفلس شرابی سمجھتی تھیں۔ اُس نے تمھیں تنگدستی اور ندامت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم نہ جانے کیوں اُس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا دھندلا سا بھی عکس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا اُس نے اُنھیں عیب کی طرح چھپایا۔ اُسے غرّہ تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں لاکھوں کما کر پھینک دے تبھی تو اُسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فاقے بھی کر سکتا ہے اور اُس کا قلم بیکسی سے گھسٹتا رہتا ہے۔

تم عاجز تو نہیں آگئیں ادیبوں سے! یونہی خود گھسٹتے ہیں اور اپنوں کو دلدل میں گھسیٹتے ہیں!..... اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ قو بہن یہ ادیبوں ہی کی عادت نہیں ہمارے دیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ادیب ہوں یا کلرک! ان کی یہی زندگی ہے اور کم و بیش یہی انجام جو زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور ڈھیٹ سسکتے رہتے ہیں۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس جواں مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں! جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے۔ وہ دُنیا جس نے اُسے مرنے دیا میری ہی تو دُنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل یونہی مجھے بھی مر جانے کی اجازت ہوگی۔ اور پھر لوگ ماتم کریں گے میرے بچّوں کا بوجھ اُن کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جلسے کریں گے چندے جمع کریں گے اور اُن جلسوں میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی نہ آسکے گا۔ وقت گذر جائے گا۔ سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔

عصمت چغتائی

منٹو ——— میرا دشمن

منٹو میرا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ ہم میں خاصی چپقلش رہتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے ہم نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں پہنچائیں۔ کتب پبلشرز بمبئی سے شائع ہونے والے نئے ادب کے معمار کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا جو اسکیچ کرشن چندر نے لکھا اُس میں اس چپقلش کا ذکر بھی کر دیا اور ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا ہے کہ اگر میں نے منٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا۔ لیکن آج جب منٹو اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم واقعی دشمن تھے؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدا ہی دشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

منٹو کی اور میری اُفتاد میں زمین آسمان کا فرق تھا ——— وہ لڑکپن ہی سے دینو یا فضلو کمہار کی دوکانوں کے اُوپر جو باروں میں جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور رات کو خراب بھی فلاش ہی کے دیکھتا تھا، اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ بلا نوش تھا اور میں نے شراب تو دور رہی، سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا جب میں تیئیس برس کا تھا۔ اُس نے کٹرہ گھنیاں ہو، ہیرا منڈی ہو یا فارس روڈ ——— اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے اُدھر جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ماں نے بچپن ہی سے ان تینوں کے خلاف سخت نفرت میرے دل میں بھر دی تھی۔ والد محترم نے ان تینوں میدانوں میں جو کار ہائے نمایاں سرانجام دیے، میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی آئندہ دو نسلیں اس سلسلے میں کچھ بھی کیے بغیر اُن پر فخر سے سربلند کر سکتی ہیں۔ اُن کے انھیں کارناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہو گئی اور ہم نے جس عسرت میں بچپن کے دن کاٹے، اُس نے خون کو کچھ ایسا منجمد کر دیا کہ آج جب میں سگریٹ یا شراب کو ویسا معیوب نہیں سمجھتا، کبھی کھُل کھیلنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پتا جی جب ایک آدھ پیگ چڑھا لیتے تھے تو گویا نعرہ لگاتے تھے "کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے" وہ حال میں جیتے تھے اور انھوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ ردِ عمل کے طور پر میں نے لڑکپن ہی میں زندگی کا سارا خاکہ تیار کر لیا تھا ——— اور منٹو کو میرے اس زہد، حسابیت، پلاننگ، کفایت شعاری اور ٹھہراؤ سے نفرت تھی۔ اپنی اس نفرت کا اظہار اُس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا۔

...... مجھے منٹو نے فلمستان میں کام کرنے کے لیے بمبئی بلایا تھا۔ میرے بمبئی پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے ہم وکٹوریہ میں آمنے سامنے بیٹھے گرانٹ روڈ کو جا رہے تھے۔ منٹو نے تھوڑی سی پی رکھی تھی۔ اچانک اُس نے انگریزی میں کہا (I LIKE YOU THOUGH. I HATE YOU.)

...... ڈیڑھ سال بعد ہم ملتستان کی کینٹین میں بیٹھے تھے۔ لنچ کا وقت تھا۔ منٹو کی میز پر حسبِ دستور راجہ مہدی علیخاں، وریاما وغیرہ دو ایک دوست تھے۔ میں برابر کی میز پر اپنی یونٹ کے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیسے ہندوؤں کے دواہ کرم سنسکار اور کپال کریا — یعنی مُردے کی کھوپڑی کو توڑنے کی رسم کا ذکر چلا تو منٹو نے دانت پیس کر کہا — "اشک جب مرے گا تو اس کی کپال کریا میں کروں گا۔"

...... میں کے۔ ای۔ ایم۔ ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دے دیا تھا۔ راجہ مہدی علیخاں مجھ سے ملنے آیا اور اس نے کہا — "منٹو کہتا ہے کہ سالا اس طرح پیسہ نہ جوڑتا تو بیمار نہ پڑتا۔"

جب گرانڈ روڈ کو جاتے ہوئے منٹو نے مجھ سے کہا تھا، میں تمہیں پسند کرتا ہوں، لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لیے جواب دیا تھا۔ ورنہ منٹو سے مجھے دراصل کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ رہا منٹو تو اس نفرت کے باوجود، جس کا اظہار وہ "وقتاً فوقتاً" کرتا تھا اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم دونوں گہرے دوست ہوتے اگر میں سٹرھیاں پر سے پھسل پڑنے میں منٹو کو نہ دیکھے، بنا جانے، بنا پڑھے اُس کے خلاف ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے۔ منٹو کی ایک کہانی "خوشیا" ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں اور راجندر سنگھ بیدی اس زمانے میں ساتھ ساتھ لکھا پڑھا کرتے تھے۔ وہ کہانی لکھتے تو مجھے آکر سنا نا نہ بھولتے اور میں لکھتا تو انہیں جا سناتا۔ دونوں مل کر ہمعصروں کے افسانوں پر تبادلۂ خیالات کرتے اور جیسا کہ نوجوانی میں ہوتا ہے، ہماری رائیں خاصی تیز اور حکمی ہوتیں۔ بیدی نے "خوشیا" کے بارے میں میری رائے پوچھی۔

میں نے اُس وقت تک منٹو کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی، نہ اُسے دیکھا تھا۔ "سرگذشت اسیر" کے نام سے ہیوگو کا ایک ترجمہ منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سُنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے بغل میں دبائے کسی ناشر کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔ یہ میں نہیں جانتا۔ بہرحال "خوشیا" کی اشاعت سے پہلے منٹو کے بارے میں یہی دو ایک باتیں میں جانتا تھا اور چونکہ لکھنا میں نے کرشن، منٹو اور بیدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، عمر میں بھی میں تینوں سے بڑا ہوں اور اُس وقت تک میرے کچھ مشہور افسانے، "ڈاچی"، "کونپل"، "قفس" وغیرہ لکھے جا چکے تھے اور مترجم کو میں طبعزاد لکھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا، اس لیے میری نظروں میں منٹو کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ "خوشیا" پڑھتے وقت بھی میں پہلے ہی سے مصنف کے خلاف تھا۔ "خوشیا" مجھے بہت اچھا بھی نہیں لگا۔ حالانکہ منٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا درجہ حاصل ہے اور بنیادی خیال کو منٹو نے بہت اچھی طرح نبھایا ہے تو بھی مجھے یہ اعتراض تھا کہ "خوشیا" حقیقی کردار نہیں بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اُس زمانے میں باقاعدہ اُس گلی کی سیر کرتے تھے اور اُن کی وساطت سے مجھے اُس کے آداب و قواعد سے خاصی واقفیت تھی۔ نچلے طبقے کی طوائفوں کے دلال (جیسی کہ خوشیا کی کہانی ہے) دلال عموماً اُن سے پہلے ہی جسمانی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں، یہ بات میں یقینی طور پر جانتا تھا۔ اسی لیے میرا خیال تھا

کہ خوشیا کا کردار غیر حقیقی ہے۔ بیدی نے جب خوشیا کے بارے میں میری رائے پوچھی تو اُس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ یوں بھی جھگڑنے کے دن تھے۔ کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی جو منہ میں آیا، بک دیتے تھے۔ اس لیے میں نے کہا۔ "دُور کوڑی کی کہانی ہے۔"

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا۔ لیکن بیدی نہیں بھولا۔ اور جب کچھ عرصے بعد بیدی دلی گیا اور وہاں منٹو نے (جو اُس وقت آل انڈیا ریڈیو دلی میں آ گیا تھا) اپنی عادت کے مطابق اُسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں بیدی نے خوشیا کے بارے میں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

دلی سے واپس آ کر بیدی نے منٹو سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے منٹو تک تمہاری بات پہنچا دی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ تھا کہ منٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے، اس لیے میں نے اس اطلاع کو سُنا اَن سُنا کر دیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں جب کرشن چندر کے بلاوے پر میں دلی ریڈیو اسٹیشن گیا اور وہاں جاتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ میرا وہ ریمارک کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دوستوں نے میری ملازمت پر اس لیے خوشی کا اظہار کیا کہ اب منٹو کو اپنا بدل ملے گا یعنی اگرچہ میں اور منٹو کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے، لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا۔

دہلی میں اپنی نوکری پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتا چل گیا اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کشمکش بھری زندگی سے نجات پا کر آیا تھا، اس لیے اس خیال سے میری روح کانپ گئی کہ مجھے پھر کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقع ملتے ہی منٹو کو سمجھاؤں گا کہ لوگ محض تماشا دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم کیوں تماشا بنیں۔ لیکن ایک تو یہ کہ ریڈیو میں اس وقت منٹو کا طوطی بولتا تھا، دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے نیچا دکھانے کے لیے اُدھار کھائے بیٹھا تھا اس لیے میری کوششیں بارآور نہیں ہوئیں —— ریڈیو کا دفتر اُن دنوں علی پور روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں تھا۔ بڑے کمرے اسٹیشن ڈائرکٹر، پروگرام ڈائرکٹر اور میوزک ڈیپارٹمنٹ کے پاس تھے۔ چھوٹے کمروں میں سے (جو شاید کوٹھی کے باتھ روم رہے ہوں گے) ایک میں راشد، دوسرے میں کرشن اور تیسرے میں منٹو بیٹھے تھے۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں کرشن کے کمرے میں بیٹھا تھا (کرشن سٹوڈیو میں (جو سڑک کے دوسری طرف ایک کوٹھی میں واقع تھا) گیا ہوا تھا اور میں کوئی فیچر لکھ رہا تھا کہ منٹو ٹہلتا ہوا آیا اور اِدھر اُدھر کی بات کر کے اُس نے خوشیا کی بات چھیڑی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں میری کہانی 'خوشیا' پسند نہیں آئی؟" وہ بولا۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن منٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا "تمہیں اُس میں کیا پسند نہیں آیا؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے اُسے سمجھایا کہ میں یہاں ہندی صلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں، میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم مزے سے کام کرو، اور مجھے کام کرنے دو، فضول بحث مباحثے میں مت پڑو۔ لوگ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں، ہم کیوں تماشا بنیں.....

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی۔ اُس نے ہاتھ کی جنبش سے جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے وہی سوال دہرایا اور شاید کوئی سخت بات بھی کہی۔ مجبوراً میں نے کہا۔ "کہانی وہ اچھی ہے، لیکن حقیقی نہیں۔"

"کیوں حقیقی نہیں ؟"

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا۔ تمہیں ایک خیال سُوجھا اور تم نے اپنے آپ کو دلال کے روپ میں رکھ کر ویسی صورت میں اپنے ردِ عمل کو قلمبند کر دیا۔ حقیقی دنیا میں خوشیا واقعی دلال ہوتا، کانتا اُس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ اُسے وہیں دبوچ لیتا ——— تم نے جو کچھ لکھا وہ ایک پڑھا لکھا شاعر سوچ سکتا ہے، اَن پڑھ دلال نہیں۔"

کچھ اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی۔ منٹو لمحہ بھر کو چپ رہا۔ پھر تلملا کر بولا۔ "ہاں ہاں، میں وہ دلال ہوں منٹو وہ دلال ہے، تمہیں افسانہ نویسی کا علم بھی ہے۔ تم خود کیا لکھتے ہو؟"

لیکن اُس وقت کرشن چندر آ گیا یا مجھے اڈوانی (اسٹیشن ڈائریکٹر) نے بلا لیا یا جانے کیا ہوا، بہر حال وہ قصہ وہیں ختم ہو گیا۔

...... لیکن وہ قصہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ دلّی میں جو چپقلش اس کے بعد رہی سو رہی، منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہ بھول سکا۔ گذشتہ سال "نقوش" کے کسی خاص نمبر میں اُردو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہوا تھا۔ اُس وقت جب اُردو میں کوئی نیا افسانہ لکھے ہوئے آٹھ دس برس ہونے کو آئے ہیں اور میرے احباب اور اُردو کے ناظر تک مجھے بھول گئے ہیں، منٹو کو میں یاد رہا۔ خوشیا کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کرنا وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی کہ منٹو سے میری چشمک نہ ہو، میں اپنی میز بھی اُٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا، لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی نیچے اُترتا، دوستوں میں جاتا، منٹو سخت حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا۔

اُن دنوں کی بڑی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے۔ منٹو ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنے پر مامور تھا۔ کرشن چندر ڈراموں کا انچارج تھا۔ میں ہندی صلاح کار تھا اور چونکہ اُس نظام میں ہندی کو اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرصت کے وقت میں ایک آدھ ڈرامہ بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اُردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا۔ "بولو بھئی، کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے؟" موضوع سنتے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک مسودہ کرشن کو دے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا زعم تھا اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈرامہ لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈرامہ آرٹسٹ ——— غلام محمد، رندھیر (جو اب فلم ایکٹر ہیں) تہذ محمد وغیرہ اُسے عموماً گھیرے رہتے تھے۔ منٹو لکھتے لکھتے انہیں ڈراما سنایا بھی کرتا تھا اور وہ سُن کر "منٹو صاحب، آپ ڈرامہ کے بادشاہ ہیں" کہتے ہوئے منٹو کے خرچ پر چائے اڑایا کرتے تھے۔ جاوید اور حسرت صاحب سے منٹو کا پینے پلانے کا رشتہ تھا۔ اور اڈوانی اُس سے اس لیے دبتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار محکمہ اطلاعات اور براڈکاسٹنگ کے سیکرٹری تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر ہر وقت، منٹو صاحب، منٹو صاحب، ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں گھرا رہتا۔ لنچ کے وقت کبھی اُس

سے اور کبھی کرشن کے کمرے میں محفل جمتی۔ میں بھی کبھی کبھی آ نکلتا تھا۔ منٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تحقیر آمیز ریمارک ضرور پاس کرتا، اور اگرچہ میرے معاملے میں لوگ اُس کا ساتھ نہ دیتے۔ مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا "دیکھو بھائی، تم منٹو کو سمجھا دو۔ وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے، میں طرح دے جاتا ہوں" "تم بھی اُسے تنگ کرو" کرشن نے کہا۔ "میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا"

اور اُس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کر لیا کہ آج میں منٹو کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اُس کی کہانی 'دھواں' شائع ہوئی تھی۔ کہانی مجھے بے حد پسند تھی۔ منٹو نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور نفاست سے افسانہ لکھا تھا، لیکن میں تو شرارت پر تُلا ہوا تھا اور چونکہ میں اس دوران میں منٹو کی انانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لیے میں نے اپنا طرزِ عمل طے کر لیا۔ دفتر پہنچ کر میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا ——"میں نے تمھاری کہانی 'دھواں' پڑھی"

"کیسی لگی؟"

"اچھی ہے، اب تم چوٹی پر لکھو"

منٹو لمحہ بھر کو چپ رہا۔ پھر اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا "کیا مطلب ہے تمھارا؟"

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دُہرا دی "بس اب تم چوٹی پر لکھو!"

اُس وقت عصمت نے 'لحاف' نہ لکھا تھا۔ منٹو چڑ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو۔ لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا۔ اس لیے اُس نے کہا "تم کیا جھک مارتے ہو؟ میں نے تمھارے ڈرامے پڑھے ہیں"

اُس وقت میرا مجموعہ 'ہاپی' چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ لڑنے کا فن مجھے خوب آتا ہے اس لیے طرح دے کر میں نے کہا "میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں، اس لیے میرے ڈراموں کی بات چھوڑو، لیکن تم جو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو، جیسی جھک مارتے ہو، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں 'کروٹ' میں تم نے ماہم کے افسانہ 'زین' کی کہانی چرائی ہے۔ 'دوزخ' کا ناٹک پورے کا پورا ترجمہ کر دیا ہے۔ (اُس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا)، اور حوالہ تک نہیں دیا۔ میں اچھے ناٹک نہیں لکھتا۔ لیکن طبعزاد تو لکھتا ہوں۔ میری اچھی بری چیز میری اپنی ہے۔ کسی دوسرے کی چرائی تو نہیں"

منٹو جھلا اُٹھا، لیکن میں وہاں نہیں رُکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ منٹو ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا، لیکن ڈرامہ لکھنا تو دور رہا اس کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اُس نے پھر مجھ سے افسانہ کے فن کو لے کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر طرح دے کر نکل گیا اور سٹوڈیو چلا گیا۔ منٹو نے سٹوڈیو میں میرا پیچھا کیا۔ لیکن میں پھر ٹال گیا۔

اسی شام دشوا متر عادل اپنے دوست اور بہنوئی مسٹر مدن موہن بھلّہ کے ساتھ منٹو سے ملنے گیا۔ اس نے آ کر بتایا کہ منٹو نے انھیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں دیں کہ اشک سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ اُس کو افسانے کے فن کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ 'ادبِ لطیف' میں اُس نے افسانہ کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا بکواس ہے وغیرہ وغیرہ۔

"تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اُوپر اپنے کمرے میں بیٹھا وہ سب سنتا رہا، کیونکہ تماشائی بڑے خوش تھے۔ اور منٹو کیا کہتا ہے، وہ مجھے رائی رتی بتانا نہ بھولتے تھے، لیکن میں چُپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہُوا اور افسوس کرتا رہا کہ بادلِ نخواستہ مجھے وہ سب کرنا پڑ رہا ہے، جس کی دوستوں کو توقع تھی۔

میں منٹو کے افسانے پسند کرتا تھا۔ 'خوشیا' کے بعد میں نے منٹو کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے۔ 'نیا قانون'، 'منتر'، 'شوشو'، 'ڈرپوک'، 'مُوسم کی شرارت'، 'ہتک'، 'مسٹر ڈی کوسٹا' مجھے بہت پسند آئے تھے۔ لیکن جب تک میں دلّی میں رہا، میں نے کبھی منٹو کے سامنے اُس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چونکہ منٹو کی نظر کافی تیز تھی، اس لیے خوشامد کرنے پر وہ اگرچہ وقتی طور پر خوش ہوتا تھا، لیکن خوشامدی کے لیے اُس کے دل میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھے دلّی بُلا کر منٹو کے مقابل لا کھڑا کیا، لیکن جب بھی ہم میں جھگڑا ہُوا، اُس نے ہمیشہ منٹو کی طرفداری کی۔ منٹو اس طرفداری کا فائدہ اُٹھا لیتا تھا، لیکن کرشن چندر کے لیے اُس کے دل میں عزت نہ تھی۔ وہ اُسے بھی گالیاں دیتا تھا۔ چونکہ ان دنوں منٹو کو ہر وقت خوشامدی لوگ گھیرے رہتے تھے، اس لیے میری اس حقیقی تعریف کو بھی منٹو خوشامد پر محمول کرے، یہ میری انا کو منظور نہ تھا۔ میں دانستہ منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑ جاتا اور اُس کے کمزور افسانوں کی تنقید بڑے زوروں سے کرتا۔ غرضیکہ خاصی چپقلش رہتی تھی۔

اُن دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن چندر کھُل کر نہ کھیلتے تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبروریزی کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں، لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت ترقی پسندوں کو عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع سوجھتا تھا۔ جب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ تم یہ سب لکھ نہیں سکتے اس لیے تمھیں منٹو اور عصمت (ان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے حسد ہوتا ہے۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی بڑ ہانکی، تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا۔ لیکن دونوں نے ایک ہی موضوع ——— یعنی نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی ——— پر افسانے لکھے۔ منٹو نے "بلاؤز" اور میں نے "اُبال" دونوں افسانے 'ساقی' دہلی کے ایک ہی نمبر میں (غالباً کسی سالنامے میں) چھپے۔ 'اُبال' کو دوستوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اُسے اُس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اُس کا انگریزی ترجمہ شائع ہُوا تو وہ کافی پسند کیا گیا۔ 'بلاؤز' اور 'اُبال' اس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عریانی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا اثر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جہاں 'بلاؤز' کے انجام کی حقیقت کوری حقیقت ہے۔ وہاں 'اُبال' کے انجام میں نوکر کی ٹریجڈی کے ساتھ سماجی ٹریجڈی بھی پنہاں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت (SOCIAL REALISM) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو حقیقت جیسی بھی ہے، اس کا نقشہ کھینچتے وقت ہی اپنے قلم کو محدود رکھنا چاہیے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماج کا بھی جائزہ لینا چاہیے، یہ بحث طویل ہے اور فن برائے فن اور فن برائے زندگی کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہیں گے۔ بہرحال

منٹو کے ساتھ ہونے والی چشمک میں میں نے بھی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اس کی بڑی تعریف ہوئی، لیکن پھر میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے رنچھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو جیسا کہ میں نے دیکھا، میرا خیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو۔ جن حالات میں اچانک ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہو گیا، تقریباً انھیں حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اُس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود بھی اُس فرار کا باعث تھا۔ کیونکہ لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا، خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اُسی کے حربوں کو اس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بمبئی سے بھاگنے کے بارے میں نذیر اجمیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے۔

"میں نے بہت غور کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا "منٹو بھائی ——
آگل راستہ نہیں ملے گا —— کار موٹر روک لو —— اُدھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ
—— اور میں باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔"

دہلی سے اچانک منٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ افواہ اُڑی تھی کہ اُسے فلم میں نوکری مل گئی ہے۔ لیکن دو سال بعد اُس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا —— باجو کی گلی سے —— آگل راستہ نہ ملنے پر —— بالکل ویسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بمبئی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے۔ 'کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے' کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نعرہ لگایا کرتے تھے وہ تھا —— 'سر قائم جنگ دائم' —— اور وہ اپنے لڑکوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا شہر کا سب سے بڑا لڑاکا ہوگا، اس لیے وہ سب کو لڑنے کے طریقے بتایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پیٹنے سے پٹنا مشکل ہے۔ پٹو، لیکن پیٹنے والے کو نہ چھوڑو —— میری صحت تو لڑکپن ہی سے خراب تھی۔ اپنے والد یا بھائیوں کی طرح تو میں کیا لڑتا، لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہو گئی اور کشمکشِ حیات میں جہاں جہاں بھی معرکہ پڑا ہے، میں نے پٹ کر آخر پیٹنے والے کو پیٹ دیا ہے۔

منٹو سے میرا دوبارہ سابقہ پڑا۔ ایک بار دہلی میں اور دوسری بار بمبئی میں۔ دہلی میں میں نے اُسے زک دے دی لیکن بمبئی میں ہماری جوڑ برابر رہی۔

'دھواں' کے سلسلے میں ہم میں جو چشمک ہوئی اس کے بعد میرے اور اُس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ منٹو زور میں تھا اور کرشن اگرچہ مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن ہر بار منٹو کے لیے ڈھال بن جاتا تھا، اس لیے میرا وار اوچھا پڑتا تھا لیکن اس

دوران میں اپنے زعم میں منٹو راشد سے بھی بگاڑ بیٹھا۔ راشد آزاد نظم کے بانی سمجھے جاتے تھے اور منٹو کو آزاد نظم سے چڑ تھی۔ اُنہیں دنوں راشد کی نظموں کا مجموعہ ماورا کے نام سے شائع ہوا جس پر کرشن چندر نے دیباچہ لکھا۔ منٹو نے دونوں کا مذاق اُڑایا۔ اُس نے نیلی رگیں کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی لکھا جس میں راشد کی نظموں سے الفاظ لے کر اُن کا مذاق اُڑایا۔ ڈرامہ آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ دو مکالمے دیکھیے:۔

سعید۔ (شاعر) کرشن، تم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں؟

کرشن ٹھنڈے ہاتھ......؟

سعید۔ ٹھہرو، مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو — اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں — ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خنک ہوں — کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمھاری زندگی میں یوں داخل ہوں جیسے رات کے سنسان اندھیرے میں کوئی جگنو بھٹکتا آنکلے۔

کرشن۔ مذاق کے طور پر، اپنی دُم سے لالٹین باندھے — نہیں — چاند کی ڈلی چوستا ہوا ادھر آنکلے۔ تمھیں آج ہو کیا گیا ہے سعید، یہ ٹھنڈی یخ عورت، تمھاری زندگی میں کب داخل ہوگی؟

کچھ دن منٹو آزاد شاعری کا، راشد کی نادر تشبیہوں کا، اجنبی عورت کا، زمستان کی رات کا مذاق اڑاتا رہا، پھر اُس نے کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈھ لیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن راشد اُسے نہیں بھولے

اس کے بعد ایک دن منٹو نے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لیے دیا۔ راشد ٹائپ شدہ مسودہ اپنے کمرے میں لے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر انھوں نے مسودہ واپس کیا۔

"کیسا ہے؟" منٹو نے پوچھا۔

"نہایت اچھا ٹائپ ہوا ہے۔" راشد نے اُس استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو ان کی اپنی چیز تھی۔

اور منٹو بقول خود کباب ہو گیا۔ اس کے بعد منٹو مجنوں راشد اور اُن کی نظموں کو کوستا رہا۔ اپنے کسی دوست سے اُس نے راشد کی نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

ہندی صلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ منٹو اور راشد میں چلنے لگی تھی، راشد میرے پڑوسی بھی تھے اس لیے منٹو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔ تاہم مجھے پریشان کرنے میں منٹو نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

پھر غالباً ۱۹۴۲ء کے اواخر یا ۱۹۴۳ء کے شروع میں (ٹھیک سن مجھے یاد نہیں) اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پروگرام ڈائرکٹر (پروگرام اگزیکیٹو) ہو گئے۔ راشد نے چارج سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر حاضری میں اُس کا تبادلہ لکھنؤ کرا دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام اسسٹنٹوں میں کرشن سب سے قابل تھا۔ اور باقی جتنے پروگرام اسسٹنٹ تھے وہ اپنا شیڈول بنانے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے نہ اُس کا کہنا مانتے تھے۔ پروگرام ڈائرکٹر تک بیسیوں باتوں میں کرشن سے مدد لیتے تھے اس لیے اُس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے، اور بہت سی باتیں کرشن براہ راست ڈائرکٹر سے منظور کرا لیتا تھا۔ راشد

کی فطرت میں آمریت کو کافی دخل ہے۔ انھیں یہ منظور نہ تھا کہ کرشن اُن کو نظر انداز کر جائے۔ اس لیے انھوں نے اُس کو لکھنؤ بھجوا دیا۔ لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی، راشد نے اُن کی غیر حاضری میں اُن کے خلاف کچھ الزامات لگائے اور چونکہ بخاری صاحب تک راشد کی براہِ راست رسائی تھی۔ اس لیے فوراً تبادلہ کرا دیا۔ اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس افسوس کا اظہار بھی کیا۔ راشد امید کرتے تھے کہ میں اُن کی تائید کروں گا، لیکن جب میں نے کرشن کی طرفداری کی تو باوجود اس کے کہ ہم برابر کے گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بیگم راشد میں بہت اچھے تعلقات تھے، روز کا ملنا بیٹھنا تھا، راشد مجھ سے بدظن ہو گئے۔

راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو منٹو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام ڈائریکٹر (مسز بیدر چوپڑا) کو گانٹھ لیا۔ اس کے جنم دن پر منٹو نے ایک بڑھیا سُوٹ اُسے پرزنٹ کیا اور یوں اُسے اپنی طرف بلا لیا۔ اڈوانی چونکہ مجھ سے خوش تھے اس لیے انھوں نے مجھے نئے پروگرام اسسٹنٹ کے آنے تک کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لیے کہا۔ منٹو کا ڈرامہ شیڈیول پر تھا۔ میں نے پروڈیوس بھی کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منٹو اُس کی ریہرسلوں میں سٹوڈیو بھی آتا رہا۔ حالانکہ وہ شاذ ہی اپنے ڈراموں میں دلچسپی لیتا تھا۔

اس دوران میں لکھنؤ سے ہندی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا ——— نہایت بدصورت، لمبا تڑنگا، چپٹی ناک والا نوجوان تھا۔ اڈوانی نے صبح اُسے اور مجھے اپنے کمرے میں بُلایا اور اُس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام سیکھے۔ کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اُس دن کا کام نمٹانے لگا۔ لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اُس لکھنوی پی۔ اے (پروگرام اسسٹنٹ) کو سمجھایا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اُسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت کچھ تھا۔ کام سیکھنے کی بات بھی اُسے اچھی نہ لگتی تھی۔ اُس نے راشد سے پوچھا تو راشد نے بھی اس سے یہی کہا کہ ڈرامہ ڈیپارٹمنٹ کی سب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اشک تو آرٹسٹ ہے۔ کوئی بھی خرابی ہو، جواب وہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہو گا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر بیٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹو اُس لکھنوی پی اے کے ساتھ آیا۔ میرا دھیان مسودے میں لگا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کی کرسی ہے۔" ساتھ ہی اُس نے میرے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ادھر آ جائیے۔"

میں نے نگاہیں اُٹھائیں۔ پی۔ اے کی آنکھوں میں تحکم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے کہا "میں اوپر اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آ جائیے گا۔"

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے غصہ کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی اے اُن سے مل چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں اُن کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل اُنھیں یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ اڈوانی نے بغیر ان سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا۔ میں اس کا شائق بھی نہ تھا۔ کیونکہ ایک بار جب جگل صاحب نے مجھے پی۔ اے کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اُٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے، اُس کی انگیخت پر، مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ انھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی فاتحانہ چمک میرے دل میں دُور تک گھاؤ کرتی چلی گئی۔ اُسی غصہ میں ایک

مجھ کے لیے خیال آیا کہ استعفا دے دوں، پھر خود ہی اس پر ہنسی آگئی۔ جھلّایا ہوا اوپر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ منٹو کی آنکھوں کی چمک پھر سامنے آگئی —— خدا گواہ ہے اگر منٹو اُس لکھنوی پی اے کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اُس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سب نہ کرتا جو میں نے کیا اور منٹو کو دہلی نہ چھوڑنی پڑتی۔

اُس وقت کمرے میں جا کر بیٹھا تو کام کرنا میرے لیے یکسر مشکل ہو گیا۔ بار بار اپنی ہتک کا خیال آنے لگا۔ راشد پر غصہ آتا، اُس لکھنوی پی اے پر غصہ آتا، لیکن سب سے زیادہ غصہ آتا منٹو پر! اس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اُس سے پتہ چل گیا تھا کہ میری ہتک کرنے والا نہ وہ پی اے ہے، نہ راشد، منٹو ہے اور میں نے طے کر لیا کہ منٹو کو اس سازش کا مزہ چکھاؤں گا۔ میرے غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا اُس میں منٹو ہی کا ڈرامہ پروڈیوس کیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میں اُس میں ایک نقطہ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا پروڈیوس ہو۔ کچھ پہلے کا غصہ اور کچھ تازہ ہتک کا گھاؤ، کام وام چھوڑ کر میں بس کہنیاں میز پر ٹکا ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے اجداد میں سے کسی نے مہرشی چانکیہ کے آشرم میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خاندان اُن سے وابستہ تھا یا بچپن سے والد محترم سے اس مہرشی کے کارنامے سن سن کر میں نے اُسی کی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا۔ بہر حال ہمیشہ جب مجھ پر مصیبت آئی، میری سمجھ اور سوچ کی قوتیں اور بھی تیزی سے کام کرنے لگیں اور توہین کرنے والے کو، اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اونچا ہے، میں نے کبھی معاف نہیں کیا (اور یہ بات کتنی بھی بری کیوں نہ ہو) اُس سے ضرور انتقام لیا اور نہ صرف ہر مصیبت سے نکلا ہوں، بلکہ ایک دم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پر مجھے محسوس ہوا کہ یہ لکھنوی پروگرام اسسٹنٹ نہایت احمق آدمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے اُسے بھڑکایا، لیکن جو منٹو کے کہنے میں آگیا، اُس کی حماقت میں کیا شک ہے۔ اُس وقت ہندی میں میرا کافی نام تھا۔ اُس نے میرا نام نہ سنا ہو، ایسی بات نہیں۔ وہ سمجھدار ہوتا تو مجھے الگ لے جا کر بات کر لیتا اور یوں تحکمانہ لہجے میں مجھ سے کچھ نہ کہتا۔ سوچا کہ اس احمق ہی کو آلۂ کار بنایا جائے اور کچھ دیر بعد میں نیچے گیا۔ لکھنوی پی۔ اے سینہ تانے، چپٹی ناک چڑھائے، نتھنے پھُلائے، لکھنؤ کے اپنے قصے سُنا رہا تھا کہ کیسے چپ صاحب (جو اس وقت لکھنؤ کے سٹیشن ڈائرکٹر تھے) اُسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اُس نے وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں اور منٹو (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاپ پاؤں کرسی پر رکھے گھٹنے بانہوں میں دبائے ہمہ تن گوش اُس کی لن ترانیاں سُن رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی تو دوسری تھی نہیں کہ بیٹھتا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منٹو کو چوپڑہ صاحب کا چپراسی بلا کر لے گیا تو میں نے اُن لکھنوی حضرت سے کہا۔ "مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں۔ اس سٹیشن پر ہندی کے ایک پروگرام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی۔" اور میں نے اُسے شام کو گھر پر چائے کے لیے مدعو کر دیا۔

میں ان دنوں نیس ہزاری میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی۔ چائے پلا کر میں اُس لکھنوی احمق کو رِج پر لے گیا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور بڑی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ لگاتار اپنی تعریفیں کر رہا تھا کہ کس

طرح اُس نے ڈرامے لکھے، کس طرح چیب صاحب نے کہا کہ ویسا سکرپٹ (SCRIPT) ہندی میں کوئی نہیں اور کس طرح انھوں نے اُس کی سفارش کر کے اُسے پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا۔ میں نے بھی اُسے خوب چنگ پر چڑھایا۔ اُس کی شخصیت کی تعریف کی۔ اُسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اُس نے اپنا سکہ جما دیا تو سب اُس سے خوف کھائیں گے، یہیں آرٹسٹ تو اچھے سے اچھے کو بدھو بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ پی۔ اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈکاسٹ ہوں انھیں اچھی طرح پڑھے، ویٹ (VETT) کرے۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک بھی چیز پڑھے اور ویٹ کیے بغیر براڈکاسٹ نہ ہونے دے گا۔ "اب جب آپ آگئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں" میں نے کہا۔ "تو میں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لیے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا۔ باقی تو اردو مسودے ہی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے سن کر ویٹ کیا کیجیے۔ اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈکاسٹ کیجیے، کیونکہ خراب ڈرامہ براڈکاسٹ ہو تو ذمہ داری آپ کی ہو گی اور میٹنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی۔" اس پر اُس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔

اب شیڈیول تو تین مہینے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرشن بنا کر گیا تھا۔ میں مہینے دوسرے مہینے ڈرامہ لکھتا تھا اور منٹو کے دو تین ڈرامے ہر مہینے ہوتے تھے۔ اگلا ڈرامہ منٹو ہی کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک کہ مجھے یاد ہے) آوارہ، پلاٹ وغیرہ مجھے سب بھول گیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی منٹو کے اُن دنوں لکھے بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن اُس لکھنوی پی۔ اے نے اُس کا مسودہ نکالا اور مجھے بلایا۔ میں اُسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اُسے سنانے لگا۔ اُس کو زبان وغیرہ یا ڈرامہ وغیرہ کی خاک سمجھ نہ تھی۔ ڈرامہ سناتے سناتے میں کہتا "کیوں صاحب اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا ہے؟" اور وہ کہتا —— "ہاں ہاں، یہ بہتر ہے۔" اسی طرح میں لال پنسل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا۔ دو چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیے۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جان گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا۔ یہ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام تر ذمہ داری ان کی ہو جائے گی۔ ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اُس کی جگہ تین اختتام تجویز کر دیے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ اُس لکھنوی پی۔ اے نے راشد پر بڑا رعب ڈالا کہ اُس نے منٹو کا ڈرامہ پڑھا ہے۔ بڑا خام ہے۔ اُس نے بڑی محنت سے ویٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈکاسٹ ہو۔ راشد تو منٹو سے پہلے ہی جلے بیٹھے تھے۔ ان کو اپنا پرانا بدلہ نکالنے کا موقعہ ہاتھ آیا اور انھوں نے وہ چند الفاظ بھی جن پر میں نے لال پنسل سے گول دائرے بنا دیے تھے، بدل دیے۔

جب منٹو کو معلوم ہوا کہ اُس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اُس کے سر پہ خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈائرکٹر کے کمرے میں گیا اور اُس نے راشد اور اُس لکھنوی پی۔ اے کو بے نقط سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ ہو گا تو بنا ایک لفظ کٹے ہو گا، ورنہ نہیں ہو گا۔

میں اُوپر تو بی کلارک (انگریزی اناؤنسر) کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اڈوانی کے کمرے کا روشندان میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا۔ نیچے اڈوانی کے کمرے میں منٹو کچھ اتنے زور سے چلا رہا تھا کہ میں اُٹھ کر روشندان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا

نظارہ کرنے لگا۔ راشد کہہ رہے تھے کہ انھوں نے خود ڈرامہ پڑھا ہے اور ہوگا تو انھیں تبدیلیوں کے ساتھ ہوگا ورنہ نہیں ہوگا اور ڈیوی ایشن (DEVIATIN) یعنی جدول کے انحراف کی ذمہ داری اُن کی نہیں ہوگی جب ہم باہر والوں کی چیزیں ویٹ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے۔ اور منٹو پنجرے میں بند شیر کی طرح تلملا رہا تھا اور تقریباً دہاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہوگا تو اسی روپ میں ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

مجھے منٹو کی اس تلملاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوتی۔ منٹو نے مجھے جتنی گالیاں دی تھیں، میری ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی تھیں، اُردو کا ٹائپ رائٹر میرے ہاتھ بیچتے ہوئے جو چالیس روپے جھوٹ بول کر زیادہ لے گئے تھے اور اُوپر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے ستایا تھا، اُس سب کا صلہ ان چند لمحوں کی اس کی تلملاہٹ میں مجھے مل گیا۔ "بنا دی ٹھک ٹھک، لوہار دی اکو سٹ"۔ میں نے من ہی من میں پنجابی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف پھرا۔

مجھے یاد نہیں، اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انھوں نے راشد پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈائرکٹر کے کام میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہرحال ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے معمور میں واپس آکر کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں میز پر پھیلا کر اطمینان کی سانس لی۔

لیکن اُس مسرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اداسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہوگیا ——— آنکھوں کے سامنے منٹو کی تلملاہٹ، اُس کے خوبصورت ماتھے پر پڑی ہوئی شکنیں، اُس کی باہر کو نکل ہوئی آنکھیں ——— سب کچھ گھوم گیا ——— اور اس تلملاہٹ کا باعث میں تھا ——— میں جو درحقیقت اُسے چاہتا تھا، اُس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اُس کے افسانوں کا اُس کے نام نہاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ مداح تھا ——— میں، جس نے دو ایک مہینہ پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ "چرواہے" اُس کے نام معنون کیا تھا۔

"چرواہے" کا ایک نسخہ میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام کیا ہوا انتساب میرے سامنے ہے

منٹو کے نام

جو مجھے کبھی بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا

میرے اُس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر یہ انتساب پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامہ کا قصہ پیش ہوا۔ لکھنوی پی۔ اے نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی تحریری تنقید پیش کی۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگ میں ہو۔ لیکن چونکہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا، اگر وہ ڈرامہ نہ ہو تو اُس کی جگہ دوسرا ڈرامہ چننے کی بات تھی اس لیے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اُٹھائی۔ لکھنوی پی۔ اے نے پہلے ہی سے وہ تنقید تیار کر رکھی تھی، سو اُس نے پڑھ دی۔ بہرحال منٹو کی تنقید ہو اور وہ بھی بھری میٹنگ میں، یہ کبھی نہ ہوا تھا منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا۔ لکھنوی پی اے کی سمجھ کے بارے میں اُس نے دو تین تیز باتیں کیں اور تیز باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا نہ تھا۔ مجھے پھر غصہ آگیا اور میں نے کہا کہ یہ ڈرامہ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تنقید کی ہے ——— اور چونکہ سب قطع و برید میں

لے کی تھی اس لیے میں نے بڑی صفائی سے اس ڈرامے کی کمزوریاں اُجاگر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں، منٹو نے کیا کہا، لیکن غصّہ میں اُس نے میری قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ ٹکنیک کے ضمن میں مَیں کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر لکھ کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز لہجہ میں کہا کہ میں تمھیں دس برس تک ڈرامہ لکھنا سکھا سکتا ہوں۔ تم اُوپر میرے کمرے میں آؤ تو تمھیں بتاؤں، ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈرامہ بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی، لیکن شور سُن کر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آ گئے۔ طے ہُوا کہ ڈرامہ تصیح شدہ حالت میں ہو گا اور چونکہ اپنے آرٹسٹ کا سوال ہے اس لیے جدول سے انحراف نہیں ہو گا۔

منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رُکا۔ اُس نے ٹائپ رائٹر اُٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دوپہر کو خورشید صاحب (سکریٹری انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ) کا فون آیا کہ منٹو کا ڈرامہ اگر براڈکاسٹ کرنا مقصود ہو تو منٹو کے لکھے ہوئے مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ڈرامہ خورشید صاحب نے منگایا تھا اور پھر اُنھوں نے یہ پیغام بھیجا تھا۔ راشد چونکہ تُلے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ تصیح شدہ حالت ہی کریں گے اس لیے خورشید صاحب کے ذریعے اُسے کینسل کرا دیا تھا)

تیسرے دن بھی منٹو دفتر میں نہیں آیا۔ ڈرامہ اُس نے منگا لیا۔ چوتھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن سُنا کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے اور اُسے فلم کمپنی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے منٹو نے بتایا کہ نوکری وو کری اُسے کچھ نہیں ملی تھی اور بمبئی میں اُسے خاصی تکلیف ہوئی۔ بیوی کو وہ دہلی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں فلمستان میں اُسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اُس کا دوست نذیر جا کر اُس کی فیملی کو بمبئی لے آیا۔

"وہ تمھارا لال کیا ہُوا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے" اچانک منٹو نے کہا یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر غصّہ تھا، نہ اُس لکھنوی پی۔ اے پر بلکہ منٹو پر غصّہ تھا، اسی طرح منٹو کو بھی اُن دونوں کے بجائے مجھی پر غصّہ تھا، اُس کا ڈرامہ مَیں نے کاٹا ہے، یہ بات وہ جان گیا تھا۔

"اب تمھارے کیا ارادے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

منٹو چُپ رہا۔

"دیکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر یہیں اسی طرح لڑنا ہے تو مجھے فلمستان کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو پا تا ہوں آرام سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور چخ چخ رہی تو کیا فائدہ۔"

"نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا۔" اور اُس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

اُس دن گھر واپس آکر میں نے صفیہ بھابی سے کہا۔ دیکھیے، منٹو نے مجھے بمبئی بلایا ہے۔ میں آنہیں رہا تھا۔ دوبارہ تار دینے پر چلا آیا ہوں۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ "آوارہ" کا مسودہ سنبھالے ہوئے ہے اور دلّی کے اس واقعہ کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لیے تماشا بنے ہیں۔ اب اُس نے مجھے بمبئی بلایا ہے تو آپ اسے سمجھا دیجیے کہ مجھے یہاں تنگ نہ کرے۔ کیونکہ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔"

منٹو اور صفیہ بھابی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط نہیں کیے لیکن ہاں کر دی۔ لیکن جب بعد میں میں نے سوچا تو میں نے طے کیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا موقع ہی نہ آنے دوں گا کہ منٹو سے میری لڑائی ہو۔ اور بمبئی میں جتنے میرے واقف کار تھے ان سے مل کر میں نے فلمستان، اُس کے کرتا دھرتا ششدھر مکرجی اور وہاں کے طریق کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ میں خاص طور پر ان لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے۔ مجھے تین چار اہم باتوں کا پتہ چلا۔

۱۔ فلمستان کا باس مکرجی زمانہ قدیم کے سادیت پسند اُن داروغوں جیسا ہے جو غلاموں کو کوڑے مار مار کر اُن سے کام لیتے تھے۔

۲۔ فلمستان میں منٹو کا ایک چھتر راج ہے۔

۳۔ جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تجویز کیا تھا تو منٹو نے فلمستان میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے۔

۴۔ فلمستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نویس لکھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے پڑھتے ہیں اور سب کو رد کر کے خود لکھتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے شاہد لطیف اور سنتوش کو فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا جبکہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلمستان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو مجھے خطرناک سمجھتا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ خود اُس نے ہی مجھے وہاں بلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب منٹو نے مجھے فلمستان میں کام کرنے کے لیے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ انٹرویو کو آؤ اور سیکنڈ کلاس کا کرایہ کمپنی دے گی تو چونکہ کوشلیا ٹریننگ لینے بمبئی جا رہی تھی، لہٰذا میں بھی تیار ہو گیا۔ خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی تو بمبئی کی سیر ہی ہو جائے گی۔ لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ آخر منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اُس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اُس میں مجھے بمبئی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن اُس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا۔ چونکہ اس قصّے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے اور خاصا دلچسپ ہے، اس لیے میں اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لیے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو دلّی آنے سے پہلے منٹو سے ملا بھی نہ تھا۔ اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں، جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے وہ مجھے اچھا لگا تھا۔۔۔

گورا چٹا رنگ، پتلا چھریرا جسم، فراخ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پر استہزا آمیز مسکراہٹ ——— منٹو کی یہی پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں مَیں منٹو کا 'نیا قانون' اور شاید 'مسنرڈی کوسٹا' پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بیحد اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک مترجم کے بجائے ایک ذہین افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنا لی تھی لیکن دہلی میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لیے جو پارٹ ڈھل گئے تھے اُن سے نجات نہیں ملی۔ ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کرشن لکھنؤ تبدیل ہو گیا تھا، اختر الایمان کو راشد نے جواب دلوا دیا تھا۔ چڈھا، میراجی اور راجہ مہدی علی خاں، راشد کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور راشد چونکہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لیے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گزرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی جھپٹ ہو جاتی، خاصی چپقلش بھی رہتی تھی، لیکن اچھے سے اچھا لکھنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا ——— منٹو کے بمبئی جانے کے بعد اُس کی اور اُس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں مَیں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اُسے ڈھیلا کر دیا ——— منٹو کے بمبئی جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد ——— ٹھیک سن مجھے یاد نہیں، اُس کا افسانہ 'بُو' شائع ہوا۔ اُس افسانے کے شائع ہوتے ہی اُس کے خلاف ایک شور برپا ہو گیا۔ چودھری نذیر احمد نے اس کے بارے میں میری بھی رائے مانگی۔ مَیں نے 'بُو' کی خوب تعریف کی۔ مجھے 'بُو' کے کنٹنٹ سے غرض نہ تھی۔ میں اُس افسانے کی تکنیک پر فدا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تھیم کو منٹو نے جس چابکدستی سے 'بُو' میں سمویا ہے، وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنا چکا ہوں، جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار یشپال بھی شامل ہیں اور یشپال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر مبتدی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لیے وہ 'بُو' ضرور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اس کے جوڑ کا افسانہ، بیدی کا 'لاجونتی' ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ اُردو ادب میں اُس کی ٹکر کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ لاجونتی میں ہیئت ہی نہیں کنٹنٹ کا بھی کمال ہے۔

بہرحال مجھے خیال ہوتا ہے کہ 'بُو' کے بارے میں جو خط میں نے چودھری نذیر احمد کو لکھا، اُس نے منٹو سے اس کا ذکر کیا یا اُس کا خلاصہ اُنہیں بھیج دیا۔ کیونکہ جب میں بمبئی گیا تھا تو منٹو نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس خط کے بعد میرے بارے میں منٹو کا رُخ کچھ ڈھیلا ہو گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ڈائرکٹر نتن بوس فلمستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات چلی تو منٹو ہی نے میرا نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق بمبئی میں ہوئی۔ منٹو اگر شراب نہ پیئے ہوتا اور دہلی کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے 'آوارہ' کے اُس مسودے کا ذکر نہ کرتا جسے میں نے کانٹ چھانٹ دیا تھا تو میں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا کہ میری طرف سے منٹو کے دل میں جو کدورت تھی وہ دُھل گئی ہے۔ منٹو ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ اُس واقعہ کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ سال بھر پہلے فلمستان میں اُس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی۔ اُس وقت میں وہاں جاتا تو اگر میرا یا شاہد کا یا میرا یا سنتوشی کا گُٹ بن جاتا تو منٹو کو تکلیف ہوتی۔ اس لیے اس نے میری مخالفت کی جس وقت اُس نے مجھے بُلایا اُس وقت

شاہد لطیف اور سنتوشی فلمستان چھوڑ چکے تھے اور منٹو مکرجی کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ منٹو تمھارے مکالموں کے پرخچے اُڑا دے گا۔ تم تنخواہ ضرور اچھی پاؤ گے۔ لیکن تمھاری جان ضیق میں آ جائے گی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اُس کے ڈرامے کی جو دھجیاں اُڑائی تھیں اُس کا انتقام لینے کی ترکیب اُس نے یوں نکالی تھی۔ اور چونکہ میں ہاں کر چکا تھا اور دہلی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے فلم کی نوکری کر لی ہے اس لیے میں واپس تو نہ گیا لیکن میں نے فلمستان میں اپنا لائحۂ عمل طے کر لیا۔

میں نے اُس وقت تک کنٹریکٹ پر دستخط نہ کیے جب تک فلمستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ میز کرسی نہیں مل گئی۔ (یہ پہلی احتیاط تھی کہ منٹو میں اور مجھ میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے) اور یہ طے نہیں ہو گیا کہ صرف میں ہی نتن بوس کے لیے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی ڈائلاگ ڈائریکشن کروں گا۔

میرا پہلا فلم "مزدور" تھا اور دوسرا "سفر" جسے مترا نے ڈائریکٹ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی صرف میں نے لکھے اور یوں فلمستان کا ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منٹو کو اس بات کا قلق ضرور رہا کہ میں نے اُس کی چال کاٹ دی لیکن میں نے اپنی عادت کو جانتے ہوئے نت جھگڑنے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منٹو مجھے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا پہلا فلم "مزدور" خواہ باکس آفس پر کامیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۴۵ء کے بہترین ڈائلاگ سمجھے گئے تھے اور مجھے ایک سند بھی ملی تھی۔ میرا دوسرا فلم "سفر" باکس آفس پر بھی کامیاب رہا، اور ظاہر ہے کہ میرا کریڈٹ بھی بڑھ گیا۔ تب اشوک کمار نے اپنا الگ فلم پروڈیوس کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مکرجی مان گئے۔ منٹو کے دونوں فلم "چل چل رے نوجوان" اور "شکاری" دو دو سال لینے کے باوجود ناکام رہے تھے۔ اس لیے اشوک کمار میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے ان کو دو تین پلاٹ، جو میرے ذہن میں تھے، سنائے۔ اشوک نے ایک پسند کر لیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ ڈالوں۔ لیکن میں نے کہا کہ لکھنے سے پہلے ایک شرط واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کہانی لکھنے کا دو ہزار روپیہ پیشگی لوں گا —— میں اُس وقت پونے سات سو کے قریب تنخواہ پا رہا تھا —— لیکن میرا کہنا تھا کہ میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم ہوں، کہانی نویس کی حیثیت سے نہیں۔ کہانی لکھوں گا تو اُس کا دو ہزار لوں گا اور ڈائیلاگ نوکری کے کھاتے میں لکھوں گا۔ اگرچہ اشوک کمار مکرجی کا سالا تھا لیکن ان دنوں سالے بہنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک نے کہا "آپ مکرجی سے کہیے" لیکن مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے۔ میں نے انکار کر دیا تب اشوک نے کہا کہ میں سیٹھ چنی لال سے کہوں گا۔ آپ بات کر لیجیے گا، لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالیے۔

منٹو کو یہ خبر مل گئی کہ اشوک میرے پاس پہنچا ہے اور میں دو ہزار روپیہ مانگ رہا ہوں تو اُس نے واچا کو ساتھ ملا لیا۔ واچا اشوک کو اپنے فلیٹ پر لے گئے۔ شراب واچا کے ہاں اعلیٰ قسم کی رہتی تھی۔ اشوک کو انھوں نے اُس وقت تک نہ آنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ منٹو نئے فلم کی کہانی لکھے گا اور دوسرے دن اُس کا مہورت ہو جائے گا۔

چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور مہورت ہو گیا تھا اس لیے "آٹھ دن" کے فلمانے کے سلسلے میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں یہ

ایک الگ لمبی کہانی ہے، لیکن چونکہ منٹو نے یہ جانتے ہوئے کہ میں نے الگ سے معاوضہ مانگا تھا، بغیر معاوضہ لیے افسانہ لکھ دینا منظور کر لیا (یہ اور بات ہے کہ جب آدھی فلم بن گئی تو اس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مد میں بھی کچھ معاوضہ لے لیا) اور اچھی خاصی سازش کر کے میرا پتہ کاٹ دیا اس لیے مجھے بہت بُرا لگا ——— خصوصاً اُس وقت جب میں افسانہ کا خاکہ لکھ کر اشوک کے آنے کا انتظار کرتا رہا ——— مہورت ہو گیا۔ مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے اس لیے سوا اس کے کہ میں زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا، اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے منٹو سے بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی۔ آٹھ دن کا ڈائریکٹر فلمستان کا ایڈیٹر دتارام پائی مقرر ہوا تھا۔ اگرچہ ڈائریکشن تو اشوک ہی کرتا تھا، لیکن چونکہ پائی بڑا قابل ایڈیٹر تھا اس لیے اس کی چلتی تھی۔ میں نے پائی کو ساتھ ملایا اور آٹھ دن میں پنڈت طوطارام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا۔ جب کہانی شروع ہوئی تھی تو یہ دو ایک مناظر کا رول تھا، لیکن میں نے اس خوبی سے اپنا پارٹ کیا اور بغیر ری ٹیک (RETAKE) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اُس نے طے کیا کہ یہ رول بڑھا کر سارے فلم میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ وہ پنڈت طوطارام چونکہ ہندی بولتا تھا، اس لیے پنڈت کے سب ڈائلاگ میں لکھتا تھا۔ منٹو ایک لائن لکھتا تو میں چار کر دیتا۔ منٹو ایک سین لکھتا تو میں اُس کے دو بنا دیتا۔ مجھے سٹیج ایکٹنگ تو پسند ہے لیکن فلم ایکٹنگ کو فلم ناٹک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن منٹو کو پریشان کرنے کے لیے وہ مضحکہ خیز رول میں کرتا رہا اور منٹو اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹ پر ہاتھا پائی تک کی نوبت آگئی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ فلمستان سے الگ ہوئے اور اگرچہ اشوک اور واچا منٹو کے دوست تھے اور منٹو ان کے ساتھ بمبئی ٹاکیز میں چلا گیا (جسے اشوک نے مکرجی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا) لیکن منٹو وہاں ایک بھی کہانی نہ دے سکا۔ جب میں پنج گنی سے الٰہ آباد آتے ہوئے اشوک سے ملا اور میں نے پوچھا کہ منٹو کیوں چلا گیا تو اس نے کہا کہ اُس نے کہانی لکھی تھی، لیکن ہم نے کمال امروہوی کی کہانی 'محل' لینے کا فیصلہ کر لیا۔ منٹو کچھ کہے بغیر چلا گیا حالانکہ ہم نے کہا کہ اس کے بعد تمہاری والی کہانی بنائیں گے لیکن اس نے نہیں سُنا۔ در حقیقت ساؤنڈ ریکارڈسٹ واچا (جو منٹو کا دوست تھا) اور بمبئی ٹاکیز کے مالک واچا میں فرق تھا اور منٹو ایسے آدمیوں میں گھر میں گیا جنھیں کبھی اُس نے فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ آگے راستہ بند ہے، کار موڑ نہیں چلے گی تو وہ باجو کی گلی سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چٹھیاں اشوک اور واچا کو ملی تھیں، لیکن سٹوڈیو کو آگ لگاتا اور خود بیکار ہو جانا آسان نہیں۔ اس کا اثر نہ شاہد لطیف نے لیا نہ نذیر اجمیری نے۔ منٹو کے بددل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیر اجمیری کی چنی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہی کی جس دن کمالی امروہی کی کہانی کا پتہ چلا، منٹو نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن منٹو کی اس رنچھوڑیت اور باری صاحب کی رنچھوڑیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی رنچھوڑیت میں خوف یا بزدلی کا عنصر تھا۔ جبکہ منٹو کی رنچھوڑیت اُس کی زبردست انانیت کے باعث تھی۔ اور اس کی اسی انانیت میں اُس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ منٹو کو نوکر شاہد کرنے سے نفرت تھی۔ [illegible] کر جانے پر [illegible] کی خوشنودی کے لیے منٹو نوکر کے تھا۔

سناتے میں نے دیکھا ہے، (حالانکہ میں سمجھتا ہوں، مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی عظمت کم نہیں ہوتی، اپنے فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ لیکن غالب کو سمجھنا اُن کے بس کی بات نہیں اور پھر بنگالی کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر اُن کے نزدیک غالب سے بڑا ہے!) اشوک اور واچا کی محفل میں بیٹھ کر سوقیانہ لطیفے سناتے دیکھا ہے۔ اَن پڑھ ایکٹروں اور میوزک ڈائریکٹروں کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے بکواس کرتے سنا ہے (جسے منٹو بکواس اور دوسرے بزلہ سنجی کا نام دیتے تھے) لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں اُس کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچی، کیونکہ اول تو یہ کہ وہ اُن کو اپنے سے کہیں کمتر سمجھتا رہا اور دوسرے یہ سب لوگ خواہ منٹو کو شکی سمجھتے ہوں، شرابی سمجھتے ہوں لیکن اوّل درجے کا ڈائلاگ رائٹر سمجھتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اُس میٹنگ میں جہاں راشد نے، بیڈی نے اور اس لکھنوی پی۔ اے نے اس کے ڈرامے کی "تنقید" کی اور بمبئی ٹاکیز کے سٹوڈیو میں جہاں اشوک اور واچا (اس کے جگری دوستوں) نے اُس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہی کی کہانیاں لے لیں، منٹو کی انانیت کو زبردست ٹھیس پہنچی اور جب اُس کی انانیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اُس کے لیے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی موٹی کھال والا ابن الوقت مصنف ہوتا تو ہتک برداشت کرتا ہوا بھی وہیں جما رہتا، لیکن منٹو کی انانیت کے لیے وہ ہتک ناقابلِ برداشت تھی، اور چونکہ پٹ کر پیٹ دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا، اس لیے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اُسے سخت تکلیف ہوئی۔ دوسری بار تو اُس کی جان پر آ بنی، لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو ٹھیس لگنے دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پارٹی ہو، میٹنگ ہو (نارمل یا انفارمل) منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ مبذول کر لے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا۔ یوں تو فلمستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں جب میں نے کانٹریکٹ پر دستخط نہ کیے تھے اور میری شرطیں مکرجی نے ابھی منظور نہ کی تھیں اور میں مکرجی کو غالب کے بجائے مہادیوی ورما کے گیت سنایا کرتا تھا، میں نے منٹو کی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا، لیکن ایک خاص واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں سکا۔

۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ ٹھیک مہینہ مجھے یاد نہیں۔ بمبئی میں امریکہ یا انگلستان کا، یہ مجھے یاد نہیں، ایک مشہور ایکٹر آیا تھا۔ میں نے اُس ایکٹر کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ موٹر سائیکل ریس میں شامل ہوتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ دیکھنے والے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ بہرحال بمبئی میں وہ ایک دو سٹوڈیوز میں گیا۔ رائے بہادر چونی لال نے اُسے فلمستان میں بھی مدعو کیا۔ شام کو فلمستان کی کینٹین میں، جو کھلے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی، میزیں لگا دی گئیں اور ششدھر مکرجی، گیان مکرجی، اشوک، واچا، چٹلکر، برمن، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چونکہ اُس ایکٹر کو ہمارے ہاں آنے سے پہلے فلم پروڈیوسرز کی ایسوسی ایشن میں جانا تھا، اس لیے اُسے دیر ہو گئی۔ بڑے مکرجی اُٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ منٹو حسبِ معمول باسز (BOSSES) کے ساتھ بیٹھا بقول شیام اپنی بزلہ سنجی اُن پر ضائع کرتا رہا۔ میں، نیپالی، برمن وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آخر ایکٹر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔ لمبوترا سا منہ ـــــ جیسے کسی نے دونوں جبڑوں کو شکنجے میں کس کر چپٹا کر دیا ہو، بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا۔ اُن کی بیوی بڑی حسین تھی۔ ظاہر ہے کہ روپیہ اور نام کی کشش نے اُس حور کو اُس لنگور کے پہلو میں لا بٹھایا تھا۔ بہرحال اُس کے آگے آگے رائے بہادر چونی لال اور مکرجی آئے۔ کینٹین میں ایک بڑی میز بچھی تھی اور اُس کے ساتھ

چھوٹی چھوٹی میزیں لگی تھیں۔ بڑی میز مہمانوں اور کمپنی کے باسز کے لیے تھی اور چھوٹی میزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا ——— لیکن منٹو، اشوک اور واچا کے ساتھ بڑی میز پر بیٹھا رہا۔ لیکن ایک تو اس ایکٹر کے ساتھ آنے والے لوگ زیادہ تھے، دوسرے رائے بہادر کے ساتھ بھی چند مہمان تھے۔ اشوک اور گیان مکرجی مالکوں میں سے تھے۔ مکرجی نے واچا اور منٹو کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ واچا اُٹھ کر چھوٹی میز پر جینکر کے پاس جا بیٹھا۔ اُس نے منٹو کو بھی پاس بٹھانا چاہا، لیکن منٹو نہیں بیٹھا۔ اس افراتفری میں جب مہمان بیٹھ رہے تھے، منٹو چپ چاپ کھسک گیا۔ میں یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا "کیوں؟"

"چلو چلیں۔"

"کیوں؟"

"سب بکواس ہے۔"

"بیٹھو۔" میں نے کہا "جہاں اس بکواس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لیتے ہیں۔"

لیکن منٹو نہیں رکا، خاموشی سے کینٹین سے نکل گیا۔

"گنجے فرشتے" میں منٹو نے شیام پر جو سکیچ لکھا ہے، اُس میں منٹو کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے۔ لاہور میں شیام آیا تو اُس کو ملنے والے اِتنے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی انا کو بار بار ٹھیس لگتی تھی ——— منٹو لکھتا ہے:

> "شیام نے مجھ سے کہا ——— میرے ساتھ رہو، لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت
> کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اُس سے وعدہ کر کے کہ رات کو میں اُس سے
> نیلیٹی ہوٹل میں ملوں گا، چلا گیا۔"

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے، منٹو کے چلے جانے کی وجہ (باوجود اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اُس کے ساتھ رہے،) اور کچھ نہ تھی، اُس کی انا تھی۔ اُس کی اس اُلجھن اور گھٹن کو میں نے اس امریکی (یا انگریزی) ایکٹر کی آمد پر بھی محسوس کیا۔ مکرجی نے جب منٹو کو اُٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ یک لخت اُداس ہو گیا اور پھر وہاں بیٹھنا اُس کے لیے مشکل ہو گیا ——— منٹو، شیام سے ملنے فلیٹی بھی گیا، لیکن اس ملاقات کا حشر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منٹو اور بھی چڑ کر واپس آ گیا۔ بمبئی میں جب وہ شیام سے ملتا تھا تو عموماً شیام نہیں، منٹو لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا، کیونکہ ایکٹروں، ڈائریکٹروں میں وہ اپنی قابلیت، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے سننے والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتا تھا۔ لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں، سننے والے آرٹسٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے، جن میں سے شیام کو سب جانتے تھے۔ اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ بھی ہنگامی طور پر بھول گئے تھے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس بات سے منٹو کو، جو اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا، کتنی کوفت ہوئی ہوگی

منٹو جس طرح پیلیا جاتا تھا، لیکن پٹتا نہیں، پیدا جاتا تھا لیکن پدتا نہیں، اُسی طرح مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اُس میں مفقود تھی۔ وہ بہت ذکی الحس تھا (اپنے مضامین میں بار بار اُس نے اِس کا ذکر کیا ہے) لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات چُبھ سکتی ہے، ایسے وہ اُونچے درجہ کا افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا، لیکن انسان کی یہ عام خامی ہے۔ ٹالسٹائی کئی بار نفس سے اندھے ہوئے، لیکن اپنے افسانوں میں اُنھوں نے اس کے خلاف لکھا، بالزاک نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے، لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ اُنھیں روپیہ بے دریغ اور بیگانی چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہیے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہئیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہیے ——— صفحۂ قرطاس پر زندگی کی دبی چھپی حقیقتوں کو عظیم فن کار کی چابکدستی سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر عیاں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا۔ آج میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں، لیکن اُن دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود میں زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا ———

میں جن دنوں دہلی گیا، منٹو کی ایک کہانی کا بڑا چرچا تھا ——— اُس کا نام تھا "ترقی پسند" ——— چرچا اُس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ دیوندر ستیارتھی اور بیدی پر لکھی تھی۔ چونکہ بیدی میرے بہت نزدیک تھا اس لیے پہلی فرصت میں مَیں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ کہانی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ لوک گیت لکھتے لکھتے ستیارتھی ایک دم افسانے لکھنے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سُنانے کا مرض ہوتا ہے۔ ستیارتھی کو بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہو۔ بہرحال وہ اپنے کُنبے سمیت راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مہمان ہو گئے اور صبح شام اُسے افسانے سُنانے لگے۔ بیدی اُس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اُس کے پاس تھے۔ جگہ زیادہ نہیں تھی۔ پھر ستیارتھی کی موجودگی میں خلوت کا میسر آنا یوں بھی مشکل ——— بیدی شام کا تھکا ہارا آتا تو ستیارتھی ایک افسانہ سُنانے کے لیے تیار رہتے۔ نہ صرف رائے لیتے بلکہ تصحیح چاہتے۔ اسی میں رات کو دیر ہو جاتی۔ صبح اُٹھتا تو اُسے تصحیح شدہ افسانہ سُننا پڑتا ——— مہینہ بھر ستیارتھی وہاں رہے اور بیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ منٹو کی کہانی "ترقی پسند" کا پلاٹ یہی ہے۔ صرف آخر میں منٹو نے ذرا افسانوی پُٹھ دیا ہے کہ ہرپا رتھی (ترقی پسند میں ستیارتھی کا بادل) اپنے میزبان سے کچھ ایسا چمٹتا ہے اور اُس کے وقت کا ہر لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے پیار کرنے کے لیے بھی غسلخانہ ہی بہتر خیال کرتا ہے۔

کہانی اچھی ہے۔ اس میں چٹخارہ بھی ہے لیکن منٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مجھے کہانی پڑھنے میں دلچسپ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ (بیدی کے مُنہ سے سُنا ہوا) منٹو نے قلمبند کر دیا، اس لیے مجھے بُرا لگا۔ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حق بیدی کو تھا۔ یا پھر منٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دیکھو یار، میں اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں تمھیں لکھنا ہو تو میں نہ لکھوں ورنہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن منٹو سے افسانہ نگار کو اتنا صبر کہاں۔ خیال آیا تو اسے قلمبند کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعہ کو لکھنے سے دو دوستوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ کھڑی ہوئی بلکہ انھوں نے منٹو کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا اور جس طرح منٹو نے اپنی کہانی

میں بیدی اور ستیارتھی کے عادات و اطوار، شکل و شباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اُڑایا تھا، اُسی طرح ان دونوں نے مل کر ایک افسانہ لکھ کر منٹو کی ذاتی زندگی اور اُس کی خامیوں کو اُجاگر کر دیا۔ کہانی ستیارتھی کے نام سے شائع ہوئی۔ انھوں نے ہی لکھی بھی تھی۔ بیدی نے اُس پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے پتے لگائے کہ کہانی، جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، بے حد اچھی اُتری۔ نام ہے — "نئے دیوتا"۔

"اُنھیں بھی کیا خوشی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، وہ نا تو نفاست حسن (نئے دیوتا میں سعادت حسن کا بدل) پہلے بھی کما لیتا ہو گا ڈیڑھ سو روپے کے لیے اُس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے۔ اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر یہ نوکری اُس نے کیسے کر لی — غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی ہتک کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا رہا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اُس جالے میں پھنسے چلے جاتے ہیں — ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یار دوستوں کو دعوت دے رہا ہے..."

اور یوں شروع کر کے "نئے دیوتا" کے لکھنے والوں نے نفاستِ حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، سِڑلے پن، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت اور سنک، پرورش، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرایے میں مذاق اُڑایا کہ منٹو بلبلا اُٹھا۔ (بعد میں جیسا کہ اُس کی عادت تھی، اُس نے خود اپنی سنک اور سِڑلے پن کی تشہیر شروع کر دی[1]۔)

"نئے دیوتا" کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دِلّی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ چونکہ منٹو اپنے اچھے سے اچھے دوست کی عزت کسی بھی وقت اُتار کر رکھ دیتا تھا اور اپنے سامنے کبھی کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا اس لیے یار دوستوں کو اچھا موقع ہاتھ آیا۔ دوست احباب جب اکٹھے ہوتے، کسی نہ کسی بہانے اُس کہانی کا، یا ستیارتھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اُسے چھیڑتے — منٹو اس کہانی کا ذکر آتے ہی کس طرح چڑ جاتا، دُنیا جہان کا مذاق اُڑاتے ہوئے، مذاق کیے جانے پر کس طرح سیخ پا ہو جاتا، اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

لنچ کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں آ اکٹھے ہوئے تھے۔ گپ ہو رہی تھی۔ کرشن اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا سب کی سُن رہا تھا۔ اُس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اُوپر کیے، گھٹنوں کو باہوں میں دبائے اُکڑوں بیٹھا تھا۔ راشد، قدوس اور دوسرے پروگرام اسسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ (اختر الایمان اور میراجی شاید اُس وقت ریڈیو میں نہیں تھے، یا شاید تھے، مجھے یاد نہیں) حفیظ جاوید نیچے دری پر دیوار سے پیٹھ لگائے، گھٹنے پر ٹانگ رکھے، ادھ لیٹے، ادھ بیٹھے خاموشی سے سب کچھ سُن رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ کمرے میں جگہ نہ تھی، اس لیے کونے میں پڑے ریکارڈوں کے اُونچے چیسٹ پر ٹانگیں نیچے کو لٹکائے بیٹھ گیا تھا۔ تبھی جانے کس نے اور جانے کیسے ستیارتھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے۔

دوسرے نے کاٹا۔ "لیکن نئے دیوتا تو اُس نے خوب کہانی لکھی ہے۔"

"واہ!" کرشن نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اُسی وقت اُس کی نگاہیں منٹو سے چار ہوئیں جو ستیارتھی کا نام سُنتے ہی چوکنا ہو بیٹھا تھا اور کرشن کا اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔

---

[1] جو کشوری کالج کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے منٹو نے کہا۔ "البتہ جب میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں تو مجھے یہ اپنا یہ سِڑلا پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔" (لذتِ سنگ)

اور تب کسی نے (منٹو کو بتاتے ہوئے) کہا۔"ارے یار، ستیارتھی کیا کھا کر ویسا افسانہ لکھے گا، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔"
"بیدی کا تو نہیں" تیسرے نے کہا۔"لکھا تو ستیارتھی ہی کا ہے، بیدی نے اس میں پتے لگائے ہیں اور کہانی دو آتشہ ہو کر نکلی ہے۔"
"ہم نے سُنا فیض کا بھی ہاتھ ہے......"

اور اُس وقت منٹو نے پاؤں نیچے کیے اور سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی کرختگی میں ڈبوتے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے گڑھوں سے نکالتے ہوئے کہا۔"بیدی اور فیض کیا، اُس میں تاثیر کا ہاتھ ہے، تبسم کا ہاتھ ہے۔ سنت سنگھ سکھیوں اور موہن سنگھ کا ہاتھ ہے، منٹو از این امسٹی ٹیوشن......"

تب مجھے نہ جانے کیا سُوجھا، منٹو کو بات ختم کرنے کا موقع دیے بغیر میں نے کہا۔"اپنے بارے میں یار سب کو غلط فہمی ہوتی ہے وہ شیام لال کپور تھا نہ، گورو گھنٹال کا ایڈیٹر، وہ بھی اپنے آپ کو انسٹی ٹیوشن سمجھا کرتا تھا......"

میں نے شیام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا، لیکن اس سے پہلے کہ میں بات کرتا یا قہقہہ خاموش ہوتا، منٹو جھنجھلا کر اُٹھا اور اُس نے غصّہ سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میری طرف پھینک دیے۔

کوئی دوسرا موقعہ ہوتا، منٹو مجھے گالی دیتا تو میں کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے مُنہ پر جما دیتا۔ لیکن لڑنے کی طرح مذاق کرنے کا بھی ایک فن ہے مذاق مذاق میں جو چڑ جاتا ہے، گالی دیتا ہے، یا ہاتھ اُٹھاتا ہے دراصل وہی پٹ جاتا ہے۔ منٹو نے گالیاں دیں تو لوگ اور بھی زور سے ہنس دیے۔ کرشن نہیں ہنسا۔ اس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔"کیا کرتے ہو؟" اور دوسرے لمحے منٹو نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔ بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے انگریزی میں کہا۔"ڈو نوٹ مائنڈ اِٹ۔" (DO NOT MIND IT)

اُس وقت چاہے منٹو اور دو گالیاں بھی دے لیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اُٹھاتا۔ لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے، منٹو نے گالی دی اور میں ہاتھ اُٹھانے کو تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی مُنہ کھولتا تو سر پھٹول ہو جاتی۔

فلمستان کے زمانے کی بات ہے۔"آٹھ دن" کی شوٹنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطارام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا تھا چونکہ دن کو سٹوڈیو خالی نہ تھے اور اشوک کمار نے زبردستی پروڈکشن لے لی تھی اس لیے "آٹھ دن" کی بیشتر شوٹنگ رات کو ہوتی۔ منٹو رات کو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا۔ اُس کے اشغال دوسرے تھے۔ لیکن جب سے میں نے تکرم بھڑا کر "آٹھ دن" میں رول لے لیا تھا اور منٹو کے لکھے مکالموں میں ردوبدل کرنے لگا تھا تو منٹو رات کو بھی سیٹ پر آنے لگا تھا۔ رات کو وہ پیا پلایا کرتا تھا اور سیٹ پر آنا اُسے بیحد شاق گزرتا تھا۔ لیکن میں اُن کے مکالموں کو "مسخ" نہ کر دوں، اس بات کا اُسے ڈر تھا۔ اشوک کی کہانی کے سلسلے میں میرے ساتھ اس نے جو زیادتی کی تھی، اُس سے میں بے حد چڑا ہوا تھا، اور اُس کو تنگ کرنے کے درپے تھا۔ لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شاذ ہی غلطی اپنے سر لیتا ہوں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر رہے۔ اس موقعہ پر بھی میں نے منٹو کو اتنا چڑا دیا کہ وہ بے اختیار ہو کر گالی دے بیٹھا، لیکن سُننے والوں کو غلطی اُسی کی معلوم ہوئی۔

"آٹھ دن" کی شوٹنگ کے بعد میں بیمار ہو کر پنج گنی چلا گیا تھا اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس لیے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں۔

اتنا یاد ہے کہ رات کی شوٹنگ تھی، شادی کا سیٹ تھا۔ مجھے پنڈت کی حیثیت سے ہیرو کی شادی کرنا تھی اور میں کمر میں دھوتی کسے ننگے بدن پر جنیو پہنے، رام نامی دوپٹہ گلے میں ڈالے، سر پر پنڈتوں سی پگڑی سجائے ویدی پر بیٹھا تھا اور ہیرو کی ماں سے اپنا پارٹ لیلا مصرا کو رہی تھیں، میرا جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس میں کہیں فقرہ آگیا "تو کیا میں جھک مار رہا ہوں" یا شاید یہ فقرہ تھا "میں ہرگز یہ جھک نہیں مار سکتا" بہرحال جھک مارنے کا محاورہ منٹو نے استعمال کیا تھا۔ اشوک ہدایات دے رہے تھے۔ منٹو بیٹھے ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا سین شوٹ ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے شرارت سوجھی اور میں نے سنجیدگی سے کہا "میں یہ ڈائلاگ نہیں بول سکتا"۔

"کیوں؟" اشوک نے پوچھا۔

"جھک مارنا ہنسا بھرا شبد ہے۔ ویدی پر بیٹھا ہوا، ویدوں کا وکتا، دھرم پرائن برہمن ایسا واکیہ کبھی نہیں بول سکتا"۔

"لیکن یہ تو محاورہ ہے"۔ منٹو تمک کر اُٹھا۔

بہت سے ایسے محاورے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں، لیکن شریف لوگ نہیں بولتے، اسی طرح ویدی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا"۔ میں بولا۔

"لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھرا نہیں"۔

"جھک کیا ہے، مچھلی۔ جھک مارنا، مچھلی مارنا ——— مطلب اِس محاورے کا کچھ بھی ہو، لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا"۔

"بنگال کے پنڈت مچھلی مارتے ہی نہیں، کھاتے بھی ہیں"۔

"لیکن پنڈت طوطارام بنگالی نہیں، نہ یہ کہانی بنگالیوں کی ہے"۔

"تم بکواس کرتے ہو"۔ منٹو جھلّا اُٹھا۔ "تمہیں یہی فقرہ بولنا ہوگا"۔

"میں نہیں بول سکتا۔ میں ویدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں"۔

"میں بھی برہمن ہوں"۔ منٹو گرجا۔

"برہمن تمہارے اجداد ہوں۔ اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو"۔

اور منٹو نے بے اختیار ہو کر زور سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوچتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ درحقیقت دل میں مجھے اُس وقت بھی ہنسی آرہی تھی، لیکن اُوپر سے میں بے حد سنجیدہ بنا ہُوا تھا۔ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرائن پنڈت ویدی پر بیٹھ کر ایسا محاورہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت لچر تھا لیکن جو لوگ فلمی دُنیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے لچر اعتراض وہاں سیٹوں پر شب و روز ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اعتراض لچر ہے لیکن برہمن یہ بول سکتا ہے یا نہیں، اس سوال نے اُسے ایک دم وزن عطا کر دیا۔ فلمی دُنیا والے نہایت ڈرپوک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا ناستک وہاں مہورت کرتا ہے حالانکہ ان مہورتوں کے باوجود آئے دن حادثے ہوتے ہیں، فلم فیل ہوتے ہیں اور فنانسر خسارہ اُٹھاتے ہیں، میری بات اشوک اور واچا کو

ٹھیک لگی۔ منٹو نے گالی دی تو میرا پلہ اور بھی بھاری ہو گیا اور چونکہ میں محض مذاق نہ کر رہا تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لیے میں نے کہا "دیکھو منٹو، میں پہلوان نہیں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پہلوان نہیں ہو اور تم نے اب بھی کھولے تو میں تمہیں اُٹھا کر سٹوڈیو کے باہر پھینک دوں گا۔"

معاملے نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ اشوک گھبرا گئے۔ شوٹنگ رُک گئی۔ اُنھیں فکر ہوئی کہ ہم دونوں اڑے رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ ہزار کی ڈز پڑ جائے گی۔ وہ منٹو کو باہر لے گئے (یا شاید مجھے لے گئے۔ یہ مجھے یاد نہیں) لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سیٹ پر آئے تو منٹو نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دبلتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا، گھر چلا گیا۔ پھر کبھی وہ رات کو سیٹ پر نہیں آیا۔ میں نے مکالمے ہی نہیں، مناظر تک بدل ڈالے لیکن پھر اُس نے میرا راستہ نہیں کاٹا۔

منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اُسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی دے (سلے والے تو کہتا ہی رہتا تھا) لیکن کرشن کبھی ایسا موقعہ نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا۔ دو موقعوں کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اُس نے اور مجھے گالی دی۔ اُن دنوں ہم میں تناؤ نسبتاً کم تھا۔ مکرجی نے اشوک اور منٹو وغیرہ کو زک دینے کے لیے سنتوشی کو پھر بُلا لیا تھا اور "اُٹھو دن" کے لیے اُس کا ایک گیت منظور کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی، لیکن منٹو، سنتوشی کا وہاں آنا پسند نہ کرتا تھا، اس لیے وہ ایک گیت مجھ سے لکھوا رہا تھا، ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے، کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے منٹو نے اچانک مجھے باتوں باتوں میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی زمانے میں میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والد محترم نت نئی گالیاں تصنیف کرنے میں یکتا تھے۔ یوں بھی جالندھر گالی خیز خطہ ہے۔ دوست جب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھرکم گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں 'بھیشم' لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا، اور اپنے سینیر ایڈیٹر جناب ساگر چند گورکھا کے ساتھ (جو بعد میں روزنامہ پرتاپ کے مزاحیہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں) ریلوے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا لڑکپن کا دوست کلونت سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ دُور ہی سے اُس نے ایک موٹی سی گالی سے میرا حال چال پوچھا اور میں اُس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اُس سے بغلگیر ہو گیا (آج یہ بات کچھ خواب کی سی معلوم ہوتی ہے، اور حالانکہ میری بیوی اب بھی مجھے خاصا غیر مہذب سمجھتی ہے، لیکن جالندھر سے لاہور آنے والے اشک اور الہ آباد کے اشک میں زمین و آسمان کا فرق ہے) گورکھا صاحب حیران و ششدر کھڑے دیکھتے رہے۔ بعد میں میں نے اُنھیں سمجھایا کہ وہ میرا لنگوٹیا یار تھا اور جالندھر کے لنگوٹیے یاروں میں خیر مقدم کی یہ پُرانی رسم ہے...... کاش منٹو میں اور مجھ میں ایسا یارانہ ہوتا اور ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالیاں دے سکتے۔ لیکن دفتر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اُس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی، اُس میں بے تکلفی نہ تھی، یارانہ نہ تھا، سرپرستی کا غیر مبہم سا جذبہ تھا مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خاموشی سے سُن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سُننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے

باعث میں گالی دے نہ سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا۔ "دیکھو منٹو، تم امرت سر کے ہو تو میں جالندھر کا ہوں، میں گالیاں دوں گا تو تمھاری طبیعت صاف ہو جائے گی۔ دوبارہ تم مجھے کبھی مت گالی دینا۔"

اور منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی۔ اُس کی بے پناہ جھنجھلاہٹ میری کپال کریا کرنے کی خواہش میں ضرور ظاہر ہوئی لیکن گالی وہ مجھے نہ دے سکا۔

منٹو جب گالی دینے پر معافی مانگ لیتا تھا، اتنا مادہ اُس میں تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم لڑتے رہے۔ میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اِسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا ہے اور ہم لڑنے پر مجبور رہے۔ اگر کہیں برابر مل کے بیٹھتے بھی تو ایک دوسرے سے نبرد آزما، ایک دوسرے کے پینترے کو کاٹ کر کیشت دینے والے مہروں کی طرح!

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہو، ایسی بات نہیں۔ لیکن ہماری انا یا احتیاط کھل کر ہمارے ملنے کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو منٹو تنا رہا، منٹو نے ملنے کی کوشش کی تو میں تنا رہا۔ ٹھیک سن یاد نہیں، لیکن کرشن لکھنؤ جا چکا تھا۔ راشد پروگرام ڈائرکٹر کی کرسی پر جا براجے تھے، چوپڑا صاحب کو ابھی منٹو نے بھانسا نہیں تھا، منٹو کو مخالفت کا حلقہ اپنے گرد تنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کا وقت تھا، دیئے جل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈرامہ یا کہانی لکھ رہا تھا۔ کوشلیا اندر باورچی خانے میں کھانے پکانے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر سڑک پر سے سخت اور تیکھی آواز آئی ——— "اشک!"

"منٹو!——— مجھے خیال آیا ——— اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھر (۹ حسن بلڈنگز، کشمیری گیٹ) میں تین چار بار گیا تھا، لیکن وہ گزشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا۔ حالانکہ میں تیس ہزاری میں بھیرو کے مندر کے سامنے رہتا تھا اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ میرے ہاں تو دُور رہا، وہ کبھی کرشن چندر کے ہاں بھی نہ آیا تھا، جو میرے نزدیک ہی رہتے تھے۔ (میرے آنے سے پہلے آیا ہو تو میں نہیں جانتا)

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا۔ نہ اُٹھ کر دروازہ کھولا، کیونکہ آواز اگرچہ منٹو کی معلوم ہوئی لیکن یقین نہ آیا کہ منٹو ہے۔

"اشک!" وہی کرخت، تیکھی، قدرے چڑچڑی آواز۔

میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ منٹو، صفیہ بھابی اور اُن کے ساتھ ایک گورا چٹّا، بڑی خوبصورت آنکھوں اور تیکھے ناک نقشے کا نوجوان ——— تینوں اندر آئے۔

منٹو نے تعارف کرایا۔ "یہ مسعود پرویز ہے (میرا بھتیجا یا میرا دوست، منٹو نے کیا کہا، مجھے یاد نہیں) تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا چلو ملا لائیں۔"

میرے پاس اُس وقت دو چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ منوہر لال بھارگو میونسپل کمشنر دہلی نے کمال مہربانی کر کے ہم جیسے غریب الوطنوں کے لیے بارکوں جیسے ۲۶ کوارٹر بنا رکھے تھے جس وقت کا ذکر ہے، راشد ایک نمبر میں رہیں

تین نمبر میں اور کرشن پانچ نمبر کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک کمرہ سونے کا اور ایک بیٹھنے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں میں نے ایک کرسی میز کام کرنے کے لیے رکھ چھوڑی اور بیٹھنے کے لیے ایک دری اور جاجم فرش پر بچھا رکھی تھی ـــــ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا "بیٹھو بیٹھو" اور کوشلیا کو آواز دی کہ دیکھو منٹو اور صفیہ بھابی آئے ہیں۔ منٹو اور پرویز بیٹھ گئے، صفیہ بھابی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اُس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا جب تک صفیہ کوشلیا کے ساتھ بیٹھک میں نہیں آ گئیں۔

مجھے اس میٹنگ کی کوئی بات یاد نہیں۔ سوا اس کے کہ مسعود پرویز کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں، اُس کا ناک نقشہ بھی دلکش تھا اور میں نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً فلمی دنیا میں ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہو گا۔ (شاید وہ اُس وقت کسی فلم کمپنی میں نوکر تھا یا جانے کی کوشش کر رہا تھا) منٹو اِدھر اُدھر کی بڑی اوپری باتیں کرتا رہا اور میں تنا بیٹھا رہا۔ بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا۔ پرویز سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے کونسی میری چیز پڑھی ہے، وہ کب دہلی آیا ہے، کیا کر رہا ہے، کب تک رہے گا؟ بات چیت کو میں نے ذاتی رخ نہیں دیا۔ منٹو کو باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا، بلکہ جب کوشلیا آئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا ناٹک کرتا رہا۔

میں نے ایسا کیوں کیا، جب میں نے ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو پاتا ہوں کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا کہ پرویز مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور منٹو اپنے شام کے شغلِ مے نوشی کو چھوڑ کر اُسے مجھ سے ملانے چلا آیا تھا۔ صفیہ بھابی کوشلیا سے ملنا چاہتی ہوں گی، یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی تھی، صفیہ شلیا کو چاہتی تھیں اور کوشلیا بھی صفیہ اور منٹو دونوں کی عزت کرتی تھی۔ لیکن منٹو نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور میرے ہاں آنے کا جو بہانہ اُس نے بنایا، اُس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پھر منٹو کے اس طرح آنے میں، اُس کے اس طرح آواز دینے میں، میرے ہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں آ کر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ باتوں میں اُس نے جتا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کرشن کے گھر بھی کبھی نہیں آیا اور مجھے اُس کا یہ انداز کھل گیا تھا۔

منٹو کی بات میں نہیں جانتا، لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے دماغ پر حاوی رہی۔ میں جھگڑالو آدمی ہوں، منٹو بھی اوّل درجے کا جھگڑالو رہا ہے، لیکن ایک دوسرے کی موجودگی جانے ہماری انانیت کے کن تاروں کو چھیڑ دیتی تھی کہ وہ بے ساختہ تن جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کرسی پر بیٹھا لکھنے کا بہانہ کر رہا تھا، اور پاس ہی دری پر بیٹھے منٹو اور مسعود، صفیہ بھابی اور کوشلیا باتیں کر رہی تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا، جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا گھٹیا پن نہ کرنا چاہیے اور چونکہ میں منٹو کے آنے کا صحیح مقصد جانتا تھا، جسے اُس نے احساسِ برتری کے زیرِ اثر دبا رکھا تھا، اس لیے میں کھل نہیں سکا۔ ہلکا سا رحم کا جذبہ منٹو کو اپنی بلندیوں سے ذرا نیچے اُترتے دیکھ کر میرے دل میں ضرور پیدا ہوا، لیکن اُن بلندیوں سے اُسے اُتار لانے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوئی۔

منٹو پھر میرے گھر کبھی نہ آیا ـــــ دہلی میں بھی نہیں، بمبئی میں بھی نہیں اور اُس نے دہلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ نیچے اُترنا اسے منظور نہ ہوا۔

(اوپندر ناتھ اشک)

جو بِک نہ سکا

یہ غالباً سنہ ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے کہ لکھنؤ میں ایک صبح کو ایک پولیس والا میرے گھر کا دروازہ اپنے ڈنڈے سے کھٹکھٹا رہا تھا اور مجھے میرے نام سے پکار رہا تھا۔ پولیس والے کا یہ رعب داب، میرے لیے بڑی دہشت ناک شکل اختیار کر گیا کیونکہ میں جس ماحول کی باسی تھی، وہاں کسی لڑکی کا نام گھر کے افراد بھی اُونچی آواز سے پکارنا بے حیائی سمجھتے تھے۔ میں ان دنوں جگر کی تکلیف میں مبتلا تھی اور بستر پر پڑے پڑے چڑچڑے پن تو دمے کے لیے ضد کر کر کے رویا کرتی تھی۔ بہرحال معلوم ہوا کہ لاہور کی کسی عدالت کا سمن میرے نام آیا ہے۔ بظاہر بہادر بنتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے سمن لیا اور پڑھا۔ منٹو صاحب نے "دھواں" کے مقدمے میں گواہ صفائی کے طور پر مجھے بُلوایا تھا۔ میں نے گھبرا کر دستخط کر دیے لیکن سمن کی خوفناک عبارت نے حواس باختہ کر دیے تھے۔ ایک قانون داں عزیز کو فوراً بلوایا تو کیس جا کر عدم حاضری کی صورت میں وارنٹ گرفتاری" کا خوف دل سے نکلا —— انہی قانون داں عزیز سے معلوم ہوا کہ میری گواہی عدالت تسلیم نہیں کرے گی کیونکہ گواہ کے سلسلے میں کچھ عمر وغیرہ کی بھی قید ہوتی ہے —— اس بات سے اوس سی پڑ گئی۔ میرے بجائے میڈیکل سرٹیفکیٹ گیا —— لیکن اس سارے قصے سے خواہ مخواہ مارے ہیبت کے بُرا حال ہو گیا۔ ضرورت سے زیادہ "ادیب پن" اپنے اوپر طاری کر کر کے سب سے کہے جا رہے ہیں، کہ "جناب یہ منٹو بھی عجیب ہیں۔" "مجھ سے تو پُوچھا ہوتا!" (کچھ یوں جیسے منٹو صاحب اپنے لیے انتہائی روزمرہ قسم کی چیز ہوں)، مگر اس قصے کے تیسرے یا چوتھے دن جبکہ مجھے لاہور میں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے منٹو صاحب کا خط اور ان کے عدالتی بیان کی نقل ملی۔ انھوں نے نہایت پُرتکلف انداز سے بلا اجازت میرا نام گواہانِ صفائی میں رکھنے پر معذرت کی تھی۔ یہ ان کا میرے نام پہلا خط تھا —— (دوسرا اور آخری خط لاہور میں ملا، جبکہ وہ "اردو ادب" مرتب کر رہے تھے)۔

منٹو صاحب کو اس وقت تک میں نے بہت کم پڑھا تھا۔ حتیٰ کہ "دھواں" بھی اس کے بعد پڑھ سکی۔ مگر "نیا قانون" میرے دل پر بری طرح نقش تھا اور میں اُس زمانے میں محض اسی ایک افسانے کی وجہ سے انھیں بہت بڑا افسانہ نگار مانتی تھی —— منٹو صاحب کو میں نے معذرت کا ایک طفلانہ سا خط لکھ ڈالا، جس میں میں نے اپنی بیماری کا تذکرہ کیا، لیکن عمر وغیرہ کی قانونی باریکی کو ٹال گئی۔ اس خط[1] کا کوئی جواب نہ آیا، مجھے دُکھ سا ہوا کہ شاید منٹو صاحب جیسے بڑے افسانہ نگار میرے عدالت میں حاضر نہ ہونے سے ناراض ہو گئے ہیں۔

پھر جب مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے وہاں مقیم کئی مشہور ادبی شخصیتوں کو خط لکھے جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ

---

[1] کافی عرصے بعد جب کہ منٹو صاحب ترقی پسندوں سے بہت ناراض تھے، میرے اسی طفلانہ سے خط کو نقل کر کے ایک کتاب اس خط کے نام معنون کر دی۔ وہ خط شائع ہوا، مگر میرا نام غائب تھا۔

آپ جیسے بڑے افسانہ نگار سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے —— سب کا جواب آیا، مگر منٹو صاحب کا جواب نہ آیا —— میں اس بات کو بھول سی گئی۔ کچھ روز بعد ایک صاحب نے مجھ سے نہایت بے تکے جارحانہ انداز سے سوال فرمایا۔ "آپ نے منٹو کو ملنے کے لیے خط لکھا ہے ——" ان کا لہجہ کچھ اس قدر تنبیہ الغافلین قسم کا تھا کہ میرے منہ سے بلا ارادہ "نہیں" ٹپک پڑا —— اپنے مخصوص قسم کے چار دیواری ماحول" سے باہر آ کر کھلی ہوا تک اپنے اوپر حملہ آور سی لگتی تھی —— میں "نہیں" پہ اڑی رہی۔ اور ان صاحب نے قصہ یوں پاک کیا کہ "میں نے خط اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" میں اس بات پر بہت چڑچڑائی کہ منٹو صاحب بھی کیسے عجیب آدمی ہیں۔ آخر بڑے ادیبوں سے ملنے والوں کو ہوتا ہی ہے۔ اس میں عجیب بات کیا تھی جو انھوں نے سب سے تذکرہ کر ڈالا —— اس کے بعد منٹو صاحب سے نہ تو میری ملاقات ہوئی نہ خط و کتابت —— (اور اب، کہ وہ ہم میں نہیں رہے تو ان کی یہ بات بھی بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے)۔ لاہور آ کر میں نے کئی بار انھیں دُور سے دیکھا، مختلف ادبی جلسوں میں، —— وہ ہمیشہ اتنے زرد نظر آتے کہ بے ساختہ ان کی زندگی کی دُعا کرنا پڑتی۔ بڑی بڑی بے چین آنکھیں اور بھوؤں کے درمیان سلوٹیں جیسے ان کی نظریں ایسی چیز کی تلاش میں ہوں جسے اور کوئی نہ دیکھ سکے۔ ایک دفعہ ایک ادبی مجلس میں جہاں منٹو صاحب کے فن کے بارے میں ایک صاحب مضمون پڑھ رہے تھے۔ مجھے کرسی صدارت یا صحیح الفاظ میں کرسی حماقت پر بیٹھنا پڑا۔ یہ شرف خود اتنی جگہ، ہم جیسے پچھلی قطاروں میں چھپ کر بیٹھنے والوں کے لیے بے حد اذیت بخش ہوتا ہے، اس پر وہاں کا تناتنی کا ماحول اور سب پر مستزاد منٹو صاحب کی موجودگی —— میں نے بہت لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ منٹو صاحب اپنے فن پر کسی قسم کی تنقید نہیں سُن سکتے۔ اور وہاں تنقید ہی ہو رہی تھی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ منٹو صاحب تنقید پر تنقید کے دوران میں ایک لفظ تک نہ بولے۔ وہ میز پہ کہنیاں رکھے اپنے چہرے کو زرد ہاتھوں میں لیے بیٹھے رہے —— ان کے چہرے پر بڑی اذیت تھی —— اور ہر بولنے والے کی طرف ان کی بے چین آنکھیں یوں جھپٹتیں جیسے کچھ پا نا چاہتی ہوں —— لیکن جب بات ختم ہوتی تو یوں ہٹتیں جیسے وہاں اپنے مطلب کی بات نہ پائی ہو —— اس دن منٹو کے اکھٹے بہت سے نقاد کچھ آپے میں تھے بھی نہیں اور منٹو صاحب کا چہرہ اس کا شاہد تھا —— منٹو صاحب کی اس دن کی مضطرب خاموشی سبھی کے لیے حیرت انگیز تھی —— منٹو صاحب ضبط بھی کر سکتے ہیں، یہ بڑی عجب بات تھی۔

آخری بار میں نے انھیں ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں دیکھا۔ وہ جس وقت اپنی بیوی صفیہ کے ساتھ آئے، تو کسی مضمون پہ تنقید ہو رہی تھی —— سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ اور ذرا سے گھٹے ہوئے کمرے میں بغیر پنکھے کے بہت سے لوگ چند موم بتیوں کی روشنی میں بیٹھے تھے —— منٹو صاحب آتے ہی اپنے مخصوص انداز سے آستینیں چڑھا کر اور ایک پاؤں بنچ پر رکھ کر بیٹھ گئے اور تنقید میں حصہ لینے لگے —— ان کی حالت بہت خراب تھی۔ بے حد زرد اور دُبلے ہو رہے تھے —— صفیہ کے قریب بیٹھے بیٹھے، مجھے ادیب منٹو کے بجائے صرف صفیہ کے شوہر سعادت حسن کا خیال آنے لگا —— صفیہ ان کی صحت کے بارے میں سخت فکر مند تھیں اور بڑی مایوس تھیں —— لیکن آج جبکہ منٹو صاحب اپنے افسانوں کی طرح اچانک موت کی وادیوں میں جا کر ختم ہو گئے ہیں تو میں سوچتی ہوں، اب صفیہ کی ایک فکر موت نے لوٹ لی، تو وہ اپنی تین بچیوں کے ساتھ

تنہائی میں بیٹھ کر کتنی ڈھیر سی فکروں میں مبتلا رہتی ہوں گی ——— منٹو صاحب کے مداحوں کو یہ بات بھی ضرور سوچنا چاہیے۔

مجھ سے منٹو صاحب پر مضمون لکھنے کو کہا گیا ہے ——— مگر ذاتی طور پر ان سے میرا کتنا واسطہ رہا ہے، میں ابھی تک یہی کچھ بتا رہی تھی۔ ان کی ذات کے بارے میں سُنا بہت کچھ ہے لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق منٹو صاحب کو دیکھتے اور پرکھتے ——— ان باتوں میں خود منٹو صاحب کس حد تک ہوتے تھے، میں کیا سمجھ سکتی ہوں ——— اس لیے ان کی ذات کا معاملہ اسی جگہ چھوڑتی ہوں۔

اب رہا منٹو صاحب کا فن تو اگر اس کا تجزیہ ہی درکار ہو تو اس خدمت کے لیے باقاعدہ نقادوں کی کمی نہیں کیونکہ وہی لوگ فنی اصطلاحیں برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں سیدھے سادے انداز سے کہی ہوئی بات کا شمار تنقید میں تو ہوتا نہیں۔ اس لیے منٹو صاحب کے فن پر اگر میں کچھ کہوں تو اس کی وقعت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ منٹو صاحب کے فن پر لکھنے کا جواز اگر یوں ڈھونڈھوں کہ میں نے بھی چند افسانے لکھے ہیں تو یہ قطعی ضروری نہیں کہ جس نے افسانے لکھے ہوں وہ منٹو کے فن پر کوئی عالمانہ رائے بھی دے سکے ——— ہاں فنی ردِ عمل دوسری چیز ہے۔ اور میں چند سطروں میں اس ردِ عمل کو بیان کرنے کی کوشش کروں گی۔ جو منٹو صاحب کے افسانوں سے میں نے قبول کیا۔

منٹو صاحب حد درجہ شدیدُ افسانہ نگار تھے۔ اگر افسانہ نگاروں کو ان کے فن کے مدِ نظر اشریر، متین، شریف اور لطیف افسانہ نگار کہنے کی جرأت ہو تو میں منٹو صاحب کو شدیدُ افسانہ نگار کہوں گی۔ منٹو صاحب اپنے دَور کے بہت بڑے حقیقت پسند تھے اور ہر اُس چیز کو شدت سے محسوس کرتے تھے جو انھیں کھٹکتی تھی۔ اور اسی شدت سے اکثر چیزوں کو نظر انداز بھی کر ڈالتے تھے۔ ریشم کی لچھیوں میں اگر سوت کا ایک نخھا سا تاگا بھی نظر آجاتا تو وہ اس کے گرد اپنے ردِ عمل کا ایک ایسا جال تیار کرتے تھے کہ ان کی بُنت کی خوبی اور نفاست تک اُردو افسانہ نگاری کے بہت کم استاد پہنچ سکتے ہیں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ منٹو صاحب موضوع کے انتخاب میں تو اتنے شدت پسند تھے مگر موضوع کو اظہار میں منتقل کرتے وقت حد درجے کے باشعور اور متوازن فن کار بن جاتے تھے۔ مختصر افسانہ نگاری کی تکنیک کی پوری تکمیل اور احتیاط سے برتنے کے فن میں اگر اُردو کا کوئی دوسرا افسانہ نگار منٹو کے مقابل لایا جا سکتا ہے تو وہ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔

منٹو صاحب بے حد جری افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کسی قسم کی مخالفت سے کبھی شکست نہ کھائی۔ انھوں نے حکومت کی مخالفت کا مقابلہ کیا۔ نقادوں کی مخالفت پر غصّے سے منہ پھیر لیا، ادیبوں کی مخالفت پر حقارت بھری نظر ڈالی، معاشرت کے ٹھیکیداروں اور اخلاق کے اجارہ داروں کی مخالفت کو ٹھکرا دیا اور زندگی کے کسی لمحے میں بھی کسی سے ہار نہ مانی ——— یہ ضد، یہ پتھر پر لکیر قسم کا نقطۂ نظر فن کار کو نقصان بھی پہنچاتا ہے۔ کیونکہ ہر مخالفت کی بنیاد بدنیتی پر نہیں ہوتی۔ بعض اوقات خلوص بھی نکتہ چینی کی بنیاد بنتا ہے اور اس قسم کی نکتہ چینی میں فن کار کے اپنے کام کی چیز بھی نکل آتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ ہر مخالفت کو ٹکرا کر واپس ہو جانے پر مجبور کرنے کے لیے کسی شخصیت کو اپنے اردگرد ایک حصار سا بنانا پڑتا ہے۔ اور یہ حصار نہ صرف مخالفت کا مُنہ پھیر دیتا ہے بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ مشاہدات اور محسوسات کو بھی محصور کر کے ٹھنڈی تازہ ہوا سے محروم کر دیتا ہے ——— لیکن اگر یہ "حصار" محض اس لیے بنایا گیا ہو

کہ فن" کو کہیں اس سے کمتر درجے کا خول محسوس نہ کر ڈالے تو اس قلعہ بندی کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ منٹو صاحب کی اٹل ضد بڑی حد تک اسی زمرے میں آتی ہے ——— انھوں نے معاشرت کے چہرے پر داغ دیکھ لیے تھے۔ اور اس لیے وہ معاشرت کے حُسن پر ایمان لانے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنے مشاہدات کو جھٹلانے سے انکار کرتے تھے اور اخلاق کی اس انوکھی قدر کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتے تھے کہ داغوں کو نظر انداز کر کے معاشرت کے حُسن کا قصیدہ کہو ——— یا پھر داغوں کو بھی لوازمات حُسن قرار دو۔ یہ درست ہے کہ منٹو صاحب آئے دن کی نصیحتوں سے کچھ ایسا کربلا کے منتقم مزاج بن گئے تھے۔ اس لیے وہ معاشرت اور اخلاق کے ان مطالبات کا مذاق اُڑانے کے لیے شدت پر بھی اُتر آتے تھے۔ لیکن اس انتہا پسندی میں بھی شرارت کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ البتہ شدت ضرور موجود ہے۔ اور فن میں شدت کوئی جُرم نہیں ——— بعض رنگوں کو گہرا کرنا ہی پڑتا ہے، کیونکہ زندگی کا کوئی بھی رُخ سپاٹ نہیں جو لوگ ہلکے خوابیدہ رنگوں کو فن کا اوج قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی دراصل رنگ کے ہلکے پن کو بالواسطہ گہرا کہتے ہیں۔

منٹو صاحب سے پہلے بھی طوائف اور بگڑی ہوئی لڑکیاں اور ان کے دلال، اردو ادب میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں ——— لیکن ان میں (امراؤ جان ادا کو الگ رکھنے کے بعد) بہت کم اصلی تصویریں تھیں۔ طوائفیں یا تو نہایت لقراط تھیں یا محض سماج کا کوڑھ، جن پر ادیب تھو تھو کر کے آگے بڑھ جاتے ——— دلال بھی جھلک دکھا جاتے، مگر صرف اپنے لباس کی۔ منٹو صاحب کا سب سے بڑا اور "زندہ" رہنے والا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اُردو ادب میں پہلی بار سنجیدگی سے، اس گرے ہوئے طبقے کو داخل ہونے دیا ——— اور فتویٰ صادر کرنے کے بجائے، اس طبقے کے ساتھ ساتھ نظر آئے۔ وہ تو جو کچھ ہوتا ہے، جو کچھ ہے، جیسا کچھ ہے اسے بغیر کلیاں پھندنے ٹانکے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اور پھر پڑھنے والے کو اجازت تھی، وہ جو رائے چاہے قائم کرے، جو علاج مناسب سمجھے کرے۔ منٹو صاحب کی طوائفیں، بگڑی ہوئی لڑکیاں اور دلال، بدمعاش، غنڈے، ہمارے سامنے اپنے حقیقی رنگ میں آتے ہیں۔ اور ہم آسانی سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بھی انسان ہیں۔ ہماری ہی طرح ان کے بھی لطیف انسانی احساسات ہیں۔ انھیں بھی دُکھ پہنچتے ہیں، ان کی بھی ہتک ہوتی ہے۔ یہ محبت بھی کر سکتے ہیں اور قربانی بھی دے سکتے ہیں ——— بے روزگاری کا زخم یہ بھی کھاتے ہیں، دوسروں کے امین بھی ہوتے ہیں اور مددگار بھی ——— اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ منٹو صاحب نے ان "گرے ہوئے" لوگوں کو پہلی بار اُردو ادب میں پوری ایمانداری کے ساتھ پیش کیا ——— اسی سلسلے میں منٹو صاحب پر الزام رکھا جاتا ہے کہ وہ عریانی پر اُتر آتے تھے ——— اب یہ الگ بحث ہے کہ عریانی کیا ہے اور کیا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ آرٹ اور ادب کے بڑے بڑے شاہکاروں پر بھی یہ الزام عاید ہوتا ہے ——— مگر للہ کوئی اتنا تو بتائے کہ کیا "عُریانی" میں ایک دلکشی، ایک بے داغ سی معصومیت، ایک رنگ، ایک راگ سا نہیں ہوتا جو تخلیق اور نسل انسانی کی بقا کے مقدس تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اب یہ تو محض ضد کی بات ہے کہ کوئی محترم یا محترمہ دس بچوں کے ماں باپ بن کر بھی لذتیت اور عریانی کے نام سے بھڑکیں اور اپنے جگر گوشوں کو "سفلی جذبات" یا اسی قسم کے دوسرے نجس الفاظ کا نتیجہ قرار دیں ——— مگر یہ بحث بھی منٹو صاحب کے مخصوص فنی رنگ سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی، کیوں کہ منٹو صاحب کو میں جس قدر پڑھ سکی ہوں (کچھ کو چھوڑ کر) اس میں (خصوصاً طوائف سے متعلق افسانوں میں)، اکتساب لذت یا ویسا ہی بننے کی اکساہٹ کہیں نہیں پائی ——— اب بھلا "ہتک" کی ہیروئن ہی کو دیکھ لیجیے۔ اپنے غلیظ بستر پر ٹوٹی ہوئی پڑی ہے۔

ایک گردسر کے گرد رکھے ہوئے۔ منٹو نے اس عام انداز کے لیے چاند کے گرد ہالے کی خوبصورت تشبیہ لکھ کر ساری عورتوں کو یوں بغیر آستین کے کپڑے پہن کر سونے کی ترغیب نہیں دی، بلکہ تشبیہ دی بھی تو بغلوں کی کھال کے متعلق پر نچی مرغی کی گھناؤنی کھال سے ——— خدا جانے وہ کس دل گردے کے بزرگ ہیں جنھیں پر نچی مرغی کی کھال دیکھ کر لذت کا دورہ پڑ سکتا ہے ——— یا پھر کاغذ کی طرح سفید، انتہائی شکار، بڑی بڑی کھوئی ہوئی آنکھوں والی سراج کو دیکھیے، جو واہیات سے واہیات جنسی حرکتوں پر اور پھر بے جان ہو جاتی ہے۔ اور اپنے آپ کو بکنے کے لائق بنانے کے لیے چرس والی سگریٹ کے دم لگاتی ہے ——— کیا کسی کو یہ ادا آگے بڑھنے کی اجازت دے سکتی ہے ——— میں نے تو جہاں تک منٹو صاحب کے مشہور و معروف "عریاں" کرداروں کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی بھی نارمل انسان انھیں پڑھ کر لذت حاصل نہیں کر سکتا بلکہ جنسی فعل کے خلاف ایک شدید قسم کی نفرت پیدا ہو جاتی ہے ——— جو ایک سادہ انسان کے لیے ایک مسئلہ بن سکتی ہے ——— جنس کے خلاف یہ نفرت، اس لیے بھی پیدا ہوتی ہے کہ منٹو صاحب ان جنس میں ڈوبے ہوئے کرداروں، پر تشبیہوں اور استعاروں کا رنگ و روغن نہیں پوتتے ——— یہ لیپ پوت منٹو صاحب کی فطرت کے خلاف تھی، اس لیے وہ اتنی سچائی سے ان کی تصویر اتارتے کہ وہ بگڑی ہوئی تصویریں ہی نہیں بلکہ ایکس رے فوٹو بن جاتیں ——— ایکس رے فوٹو ڈاکٹر حضرات غور سے دیکھیں تو دیکھیں، ان سے لذت اخذ کرنا عام ذہن کا کام نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد منٹو صاحب نے اقتصادی اعتبار سے اپنے بدترین دن گزارے۔ یہ عمر، یہ زمانہ منٹو صاحب کی فنی بلندی اور ذہنی پختگی کے عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن افسوس کہ اسی زمانے میں، اقتصادی پریشانیوں نے ان سے ایک ایک دن میں تین تین افسانے لکھوائے ——— ہمارے مغرب زدہ نقاد جو اپنے ملک کی ہر چیز کو حقیر گرداننے کے عادی ہیں، ذرا بتائیں تو کہ کیا یورپ اور امریکہ کے ادیبوں نے بہتر روپے کمانے کے لیے ایک دن میں تین تین افسانے لکھے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہاں کے معمولی سے معمولی ادیب کی ایک کتاب بازار میں آجائے تو وہ بڑی شان سے سال دو سال کچھ نہ لکھ کر، صرف سوچ کر گزارہ کر سکتا ہے ——— منٹو صاحب نے تقسیم سے قبل اپنے اس قلم کے بوتے پر بہتر دن گزارے تھے، اور پاکستان آکر بھی وہ اپنی بیوی اور بچوں کا معیارِ زندگی قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے ——— مگر ہمارے ملک میں صرف قلم ذریعۂ آمدنی نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ چند روپوں کی خاطر نہایت گھٹیا قسم کے رسائل میں لکھتے رہے۔ منٹو صاحب کو اس زمانے میں کثرت سے لکھنا پڑا۔ اکثر موضوعات پر شاید، وہ بمبئی کے دورانِ قیام میں کبھی قلم نہ اٹھاتے۔ یا اگر اٹھاتے تو دوسرے انداز سے ——— مگر لاہور آکر ضروریاتِ زندگی کی طلب نے ان سے سبھی کچھ لکھوا دیا ——— بہت سے افسانے جو لکھے گئے انھیں بہتر حالات میں شاید تھوڑا اور سوچ کر لکھا جاتا ——— مگر ان تمام پریشانیوں کے باوجود منٹو صاحب کی عظمت سے کون منکر ہوگا کہ وہ دانستہ بکے نہیں۔ ایک دفعہ انھی اذیتوں کے دور میں چچا سام کے ایک نمائندے نے ان سے تین سو روپے فی افسانہ طے کر لیا، مگر منٹو صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی اور انھوں نے تین سو (غیر ملکی) روپیہ فی افسانہ کے بجائے (غالباً) پچیس تیس (ملکی) روپیہ فی خط کے حساب سے چچا سام کے نام خطوط لکھ ڈالے ——— منٹو صاحب کبھی بک نہ سکے اور نہ ہی کوئی انھیں کھلے بندوں اپنے حق میں استعمال کر سکا ——— وہ طبیعت کے کھرے تھے۔ اس لیے کسی قسم کی پابندی انھیں گوارا نہ تھی۔

آج منٹو صاحب ہم میں نہیں، وہ اپنی انمٹ بہادری کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن ان کا فن، اردو ادب میں ناقابلِ فراموش کارنامے کی طرح درخشندہ رہے گا ——— منٹو صاحب کے فن اور موضوع پر سینکڑوں اعتراض بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر منٹو صاحب کی ایک خصوصیت سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا اور وہ خصوصیت تھی، انسانیت دوستی اور زندگی کو صاف اور بے داغ دیکھنے کا جذبہ جو اُن کے فن کا مجموعی "تاثر" ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کو "بُو" بیکار کی چیز معلوم ہو، لیکن کیا قارئین کے دل میں "بُو" کی گھاٹن کے لیے "کیوں" نہیں گونج اُٹھتی جس کا میل اور گندی ساری بھی ایک جنسی بدہضمی کے شکار نوجوان کے لیے باعثِ کشش ہوتے۔ کیا خوشیا سے کوئی شخص نفرت کر سکتا ہے۔ کیا "سرکنڈوں کے پیچھے" بکنے والی بھولی بھالی لڑکی سے آپ کو محبت نہیں ہو جاتی جسے یہ ہی نہیں معلوم کہ وہ گناہ کرتی ہے ——— یہ ہمدردی اور انسانیت دوستی کی لہر ایک دو افسانوں تک محدود نہیں ان کے زیادہ تر افسانوں میں موجود ہے۔

یہ انسانیت دوستی مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے ——— اور مختلف اشخاص میں نظر آ سکتی ہے۔ اس کے لیے کوئی سانچہ مقرر نہیں۔ کہ یہاں غالب کو رکھو، یہاں پریم چند کو، یا یہاں سعادت حسن منٹو نہیں سما سکتے ——— یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس انسانیت دوستی پر کون سی مہر ثبت ہے۔ دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت دوستی ہے۔ کلبیت نہیں ——— انسانیت سے نفرت نہیں، انسان کو فطری اور جبلّی طور سے کمینہ اور رذیل قرار دینے کی عادت نہیں۔ یہاں بیٹ بھری تھکن، اضمحلال اور مایوسی نہیں بلکہ یہاں تو یہ جذبہ کارفرما ہے کہ انسان بڑی ہی پیاری مخلوق ہے۔ یہ طوائف کے بازار میں بھی انسان ہی رہتی ہے ——— اگر اس کے معاشرتی زخم مندمل ہو جائیں جن کی طرف فن کار اشارہ کر رہا ہے تو یہ دُنیا کتنی پیاری اور یہ زندگی کتنی لطیف ہو جائے اور منٹو کے فن کا مجموعی "تاثر" یہی جیتی جاگتی انسانیت دوستی ہے۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ذرا اتنا سوچیے کہ سعادت حسن منٹو اگر بہتر دُنیا میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کے موضوعات کیا ہوتے۔ اور ان کا جاندار قلم کیا کیا حسن نہ بکھیرتا۔

ہاجرہ مسرور

رحمدل دہشت پسند

آزادی کی تقریب سعید پر امرتسر میں جب پہلا فساد ہوا تو میں لاہور میں تھا۔ سعادت بمبئی میں غلاموں نے آزادی کی خوشی میں اپنے ہمسایوں کے گھروں کو آگ لگا لگا کر چراغاں کیا۔ اور اس اعلان سے قبل کہ امرتسر پاکستان میں شامل ہو گیا یا ہندوستان میں، آدھا شہر ملبے کا ڈھیر ہو گیا۔ اس جشن کے ناٹک کا جب پہلا سین ختم ہوا تو میری بیوی نے کہا کہ جاؤ اور جو کچھ لا سکتے ہو لے آؤ۔ لیکن جب میں امرتسر پہنچا تو میرے عزیزوں نے مجھے چوک فرید میں ہی روک لیا۔ یہ مسلمانوں کا چوک تھا اور میرا گھر ہندوؤں کے علاقے میں تھا۔ مجھ سے کہا گیا "وہاں جانا خطرناک ہے۔ اغلب یہی ہے کہ تم راستے ہی میں دھر لیے جاؤ گے — ہاں اگر مسلم لیگ کی لاری آ گئی تو شاید کچھ اُدھر جانے کا بندوبست ہو سکے۔" لیکن مسلم لیگ کی لاری نہ آئی۔ میں نے اپنے عزیزوں سے پوچھا "کیا کٹڑہ جیمل سنگھ تک بھی نہیں جا سکتا؟" جواب ملا "صرف شہابے شیر فروش کی دکان تک! اس کے آگے ہندوؤں کا راج تھا۔ میں نے یقین دلایا کہ شہابے کی دکان سے اِدھر ہی رہوں گا۔ اُدھر نہیں جاؤں گا — کٹڑہ جیمل سنگھ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر برلن کا نقشہ پیش کر رہا تھا — شہابے کی دکان سے اِدھر کوچہ وکیلاں کے سامنے ملبے کا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ اِس گلی میں منٹو کا مکان تھا۔ گلی کے دہانے پر ملبے کا ڈھیر مجھے اپنے ماضی اور حال کے درمیان آئرن کرٹن کی طرح آویزاں نظر آیا۔ جس کے اس پار دیکھنا محال تھا۔ لیکن میرا دوست زندہ تھا۔ دل نے کہا۔ "یار زندہ صحبت باقی" —

میں نے اینٹ پتھر کے اُس انبار کی طرف سے مُنہ پھیر لیا، جو کوچہ وکیلاں کی ناکہ بندی کیے ہوئے تھا۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہا آؤ چلیں۔ لیکن آج کہ میرا دوست دُنیا میں نہیں ہے۔ ملبے کا وہ ڈھیر آپ سے آپ اُٹھ گیا ہے۔

کوچہ وکیلاں، منٹوؤں کا محلّہ تھا — سعادت کہا کرتا کہ منٹ کشمیری زبان میں ترازو کو کہتے ہیں۔ کشمیر میں ہمارے آب و جد کے یہاں دولت ترازو سے تلتی تھی۔ اس رعایت سے ہم منٹو کہلائے۔ میں نے منٹو کے اس بیان کی تصدیق نہیں کی۔ دوستوں کو آدمی کچہریوں اور تھانوں میں نہیں لیے لیے پھرتا۔ بعینہٖ جس طرح چاہنے والا محبوب کے خد و خال کو کتابی معیاروں کے مطابق مسطروں سے نہیں ناپتا۔ لیونارڈو نے اگر مونا لیزا کے ہونٹوں کو شیشۂ محدّب سے دیکھا ہوتا تو مصوری کی دُنیا اپنی حسین ترین مسکراہٹ سے محروم ہو جاتی — ہاں تو کوچہ وکیلاں منٹوؤں کا محلّہ تھا۔ گلی میں قدم رکھتے ہی دائیں طرف مسعود پرویز کے والد خواجہ حفیظ اللہ وکیل کا مکان تھا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا کنواں تھا۔ اس سے آگے خواجہ عبدالحمید ڈی۔ ایس۔ پی کا مکان۔ اس مکان کے سامنے ایک حویلی تھی۔ خواجہ عبدالحمید صاحب کے والد نے کوئی سو سے اوپر ہی عمر پائی ہو گی۔ وہ امرتسر کے بچے بچے کو جانتے تھے۔ انھوں نے جب مجھے پہلی بار سعادت کے یہاں دیکھا تو پوچھا کس کے بیٹے ہو؟ میں

نے بتایا تو اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں "ارے ارے تُو تو اپنا بچہ ہے۔ تیرے دادا جب گاؤں سے اُٹھ کر شہر آئے تھے، تو شروع شروع میں یہی تو لیا تھا مکان۔ ہمارے گھر کے سامنے جو حویلی ہے نا۔ لسّی منگوایا کرتے تھے ہم تمہارے گھر سے۔ اوہو ہو کیا زمانہ تھا۔ کیا لوگ تھے ......" اس حویلی کے سامنے شمال کی طرف سعادت کا مکان تھا۔ اس کا ایک دروازہ جنوب کی طرف کھلتا تھا۔ دوسرا مشرق کی طرف۔ اور یہی سعادت کے کمرے کا راستہ تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دائیں ہاتھ۔ یہی کمرہ منٹو کی تحریروں میں "دارالاحمر" کے نام سے منسوب ہے۔ دروازے کے قریب ہی دیوار کے ساتھ "دو کھوکھے" رکھ کر اُن پر گدّا اور گدّے کے اُوپر ملتانی کھیس بچھا دیا گیا تھا۔ سامنے شمالی دیوار کے ساتھ کھڑکی کے قریب لکھنے کی میز تھی۔ اس کے دائیں جانب دیوار میں ایک چھوٹی الماری، جو کتابیں الماری میں نہیں سما سکتی تھیں، میز پر دیواروں کے سہارے پڑی رہتیں۔ کتابوں کے علاوہ قلم دوات، کاغذ، پنسلیں۔ میز کے بائیں جانب آتشدان تھا جس پر بھگت سنگھ کا مجسمہ رکھا تھا۔ مجسمے کے ایک طرف تیل کا ٹیبل لیمپ تھا اور دوسری طرف پُرانی وضع کے ٹیلیفون کا ریسور۔ ایک پبلک ٹیلیفون سے جب متعدد کوششیں کرنے کے بعد بھی اُسے مطلوبہ نمبر نہیں مل سکا تھا تو اُس نے یہ کہتے ہوئے ریسور کو کھینچ کر اور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا کہ "یہ کیا فراڈ ہے"۔ اس نے خود اپنے لیے بھی کئی بار "فراڈ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہی ایک چیز تھی، جو اُسے نہیں آتی تھی۔ اس کا ظاہر باطن ایک تھا۔ وہ بڑا صاف شفاف آدمی تھا۔ اُس اُجلی چاندنی کی طرح جو کمرے کی مشرقی کھڑکیوں کے پاس بچھی رہتی تھی۔

میں اس کمرے میں پہلی بار ۱۹۳۱ء میں گیا۔ میں اُن دنوں ہندو سبھا کالج میں سائنس سٹوڈنٹ تھا۔ ایک روز میں نے اُسے کالج کے جنوب مشرقی برآمدے میں دیکھا۔ اُس نے سُرخ دھاریوں کی بوسکی کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اور سفید بوسکی کا پاجامہ پاؤں میں چپل تھی۔ اور قمیص کے اُوپر اُونچا سا ار لیشن کے مطابق گرم کوٹ۔ وہ میرے ایک ہندو ہم جماعت پرکاش کی تصویر اُتار رہا تھا۔ پرکاش کو دیکھ کر کالج کے فارسی داں سینیئر "بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند بخارا را" کے حال میں مبتلا ہو جاتے اور مصرع اولیٰ کے "اگر" کی خاطر ہاکیوں سے ایک دوسرے کے سر پھوڑنے کو تیار نظر آیا کرتے۔ پرکاش کو منٹو کے کیمرے میں اُترتے دیکھ کر تصویر و مصّور دونوں کو ہجوم نے گھیر لیا۔ میں نے منٹو کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ کون ہے؟ میں نے اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھا۔ جواب "طاٹا" میں تھا۔ یہ نام سُن رکھا تھا۔ وہ اپنے سکول، محلّے اور کالج میں اسی نام سے مشہور تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ اس کی شرارتیں تھیں۔ خیر یہ "طاٹا" جو اس وقت گویا پری کو شیشے میں اُتار رہا تھا، مجھے کچھ عجیب وضع قطع کا آدمی نظر آیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی معقول آدمی بوسکی کا پاجامہ اور لال دھاری کی قمیص گویا نائیٹ سوٹ میں کالج بھی آسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اُسے اور قریب سے جاننے کی کوشش نہ کی اور بات آئی گئی ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تصویر کی اینلارجمنٹ کے سلسلے میں عاشق علی فوٹو گرافر کی دکان پر گیا جس کے نام کا اُن دنوں بہت چرچا تھا۔ اس کے پاس ایسے ایسے کیمرے تھے۔ جو ہمارے شہر کے فوٹو گرافروں نے دیکھے بھی نہیں تھے۔ وہ بمبئی کی فلمی دنیا سے بھی گھوم آیا تھا اور اُس کے شوکیس میں فلمی تصویریں، روشنیوں اور سایوں کے عجیب و غریب امتزاج سے چمک رہی تھیں۔ کاروبار کی بہ نسبت اُسے اپنے آرٹ کی زیادہ فکر تھی۔ اس کے سٹوڈیو میں گاہک کی تسلّی ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ وہ

اکثر ایسی تصویریں بھی پھاڑ ڈالتا جو گاہک تو خوشی سے لے جاتے۔ لیکن وہ تصویر ہی کیا ہوئی کہ مصوّر کا اپنا جی خوش نہ ہو۔ وہ اعلانیہ شراب پیتا۔ اور اس کا توڑ تھپ کر اس کی سپرٹ۔ عاشق علی نے میرے والد کی دو تین تصویریں بنائیں اور پھاڑ ڈالیں "کچھ بات نہیں بنی یار۔ بات بنانے کے لیے وقت درکار تھا۔ اس لیے میرا اکثر وہاں پھیرا رہتا۔ یہیں منٹو سے میری ملاقات ہوئی "کہیے پر کاش کی تصویر کیسی آئی۔ میں نے پوچھا۔ جواب ملا "فلم ہی کب تھی کیمرے میں"۔

ہماری یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ مارلین ڈیٹرخ کی ٹانگوں پر مرتا تھا اور میں گاربو کے حسن اداس کو دیکھ کر آہیں بھرتا تھا جس مقام پر میں اب پہنچا تھا وہ اُسے چار برس پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ مئی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا تھا اور میں مئی ۱۹۱۶ء میں۔ غیر فلمی ستاروں کی کشش ان کے دو مفلوک الحال غائبانہ عشاق کو دونوں میں قریب سے قریب تر لے آئی۔ غالب نے کہا تھا ؎

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا"

لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ "ذکر اس پری وش کا" رقیبوں کو رازداں بنا دیتا ہے۔ منٹو سے اپنی دوستی کے لیے میں گریٹا گاربو اور مارلین ڈیٹرخ کا احسان مند ہوں۔ ان کی تصویروں کی کشش مجھے پہلی بار کوچۂ وکیلاں میں لے گئی۔ ہالی وڈ سے امرتسر کے فاصلے آنکھ جھپکتے میں طے ہو گئے۔

سعادت کی میز کے پاس الماری میں رنگا رنگ کے فلمی رسالوں کے انبار لگے تھے۔ اس نے اپنا یہ ذخیرہ میرے سامنے چاندنی پر بچھا دیا اور کہا جونسی تصویر چاہو لے سکتے ہو۔

ہم نے چیدہ چیدہ تصویروں کو فریم کروانا شروع کیا۔ فریم کے لیے اُن دنوں بائینڈنگ پیپر ابھی نیا نیا چلا تھا۔ فلمی قسم کی فوٹو گرافی کی طرح اسے بھی عاشق علی نے امرتسر میں رواج دیا۔ ہمارا شوق اس کا جیتا جاگتا اشتہار تھا۔ ہالی وڈ کی پنڈلیاں اس پہ کوڈک کی گوٹ۔ نتیجہ آپ خود تصور کر لیجیے۔ لیکن یہ عشق ہمیں بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ خود بائینڈنگ کریں گے۔ مگر گوٹ اب بھی مہنگی تھی۔ منٹو کو سوجھی کہ پیسٹل پیپر (PASTEL PAPER) آزمانا چاہیے۔ تجربہ کامیاب رہا۔

سعادت کے والد کا ان دنوں انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ایک بڑی سی تصویر بھگت سنگھ، مارلین ڈیٹرخ اور جون کرافورڈ کے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی۔ بند کالر کا کوٹ۔ سر پر کشمیری وضع کی پگڑی۔ خشخشی ڈاڑھی۔ بڑی بڑی خشمگیں آنکھیں۔ یوں لگتا جیسے ہمارے مشاغل کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید ان کی غضب آلود نگاہوں کی زد سے بچنے کے لیے ہی سعادت بھاگ کر ایک بار بمبئی چلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ میٹرک میں فیل ہو رہا تھا۔ کہا کرتا "میاں جی اللہ بخشے بڑے سخت گیر آدمی تھے"۔ سعادت کی بہن بتا رہی تھیں "جان خطا ہوتی تھی اس کی میاں جی کے ڈر سے۔ پتنگ اُڑا رہا تھا ایک روز کوٹھے پر۔ میاں جی آ گئے اتنے میں ــــ چھت سے کود پڑا یہ برابر کے کوٹھے پر۔ چوٹ آئی۔ لیکن کیا مجال ہے جو 'سی' تک کی ہو"۔ وہ بیساکھیوں اور سہاروں کا کبھی قائل نہیں تھا۔ رحم کی التجا کرنے والوں سے اُسے نفرت تھی۔ وہ زندگی بھر پتنگ اُڑاتا رہا۔

اور اسی طرح کودتا رہا۔ ایسے میں کئی بار وہ لوگوں کے سروں پر بھی آن گرا۔ لوگ بھنّائے جھلّائے، گالیاں دیں۔ قانون کو مدد کے لیے پکارا۔ لیکن منٹو نے کہا مجھے بھی پتنگ اُڑانے کا حق ہے۔ آسمان کی وسعتوں پر کسی کا اجارہ نہیں۔ جو مجھے گرانے کی کوشش کرے گا میں اس کے سر پہ کود جاؤں گا جو میرے پتنگ پر "کانٹی" پھینکے گا میں اُس کی کھوپڑی پر مٹی کی اینٹ ماروں گا۔

معاشرے کے اس کھیل کے دوران میں اس نے متعدد چوٹیں کھائیں۔ لیکن رحم کی درخواست کبھی اس کی زبان پر نہ آئی۔ وہ داد طلب تھا فریاد کی لے سے اس کے لب نا آشنا تھے۔

اس کے والد منصف تھے۔ انھوں نے دو شادیاں کیں۔ سعادت کی والدہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ منصف صاحب نے اپنی پہلی اہلیہ کی اولاد کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ کی کہ ان کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم اور ان کی اولاد —— سعادت اور اس کی بڑی بہن ناصرہ اقبال کے لیے کچھ باقی نہ بچا۔ تلخ یادوں کے سوا۔ منٹو کی تحریروں میں یہی کڑواہٹ گھلی ہوئی ہے۔ جیسے قند کی گولیوں میں یکایک کونین کا ٹکڑا آجائے۔ یہ تلخی کتنی دیر پا تھی اس کا اندازہ منٹو کی موت سے ہو سکتا ہے۔ معاشرہ آدمی کا دوسرا باپ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سے انصاف نہ کر سکا۔ اخلاق کے ٹھیکے دار اُسے عمر بھر کچہریوں میں لیے لیے کہ یہ عریاں نویس ہے، فحش نگار ہے، یہ جنسی باتوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ انھوں نے کبھی نہ سوچا کہ مرد و زن کے تعلقات اگر ناپاک ہیں تو حضرت آدم سب سے پہلے تماشبین تھے (نعوذ باللہ) لیکن منٹو کے ہاں جنسی تلذذ تھا ہی کہاں۔ اس نے قوام کی گولیاں کبھی نہیں بیچیں ماس کی دُکان میں کونین تو ضرور تھی کوکین نہیں تھی۔ اس کا منہ کڑوا تھا۔ کڑواہٹ کے احساس کو کند کرنے کے لیے اس نے اور کڑواہٹ اپنے اندر انڈیلی۔ بوتل کو منہ لگا لیا ؎

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
ازبس کہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

دو سال سے وہ بے تحاشا پی رہا تھا۔ وہ ہر وقت مدہوش رہتا تھا شراب سے اُس کا جگر چھلنی ہو چکا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے اواخر میں وہ مرتے مرتے بچا۔ ڈاکٹروں نے اسے معجزہ سمجھا اور کہا، سال یا دو سال اور —— "اگر اب بھی نہ چھوڑی تو" —— لیکن اس نے پھر بوتل کو منہ لگا لیا۔ گلاس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کی تھکی ہوئی روح کو سبو سے ساغر تک فاصلہ بھی بہت نظر آیا۔ اپنے اور ابدیت کے درمیان وہ بلور کا پردہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ رہگذرِ زیست کا تھکا ہوا راہی جس پر معاشرے نے قدم قدم پہ سنگباری کی تھی جلد از جلد اس منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں درد کو لذتِ سنگ کے نام سے نہیں بہلایا جاتا۔ جہاں چٹانیں نہیں ہوتیں۔ پتھروں کے سوداگر نہیں ہوتے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کی صبح کو اس کی طبیعت یکایک بگڑ گئی۔ لیکن وہ ہسپتال تک بھی نہ پہنچ سکا۔ اُسے خون کی قے آئی۔ ایمبولنس کار اُسے راستے سے ہی واپس لے آئی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ وہ صلیب کے سایہ میں جیا اور صلیب کے سایہ میں جان دے دی۔

مئی ۱۹۵۳ء میں کراچی سے پشاور جاتے وقت جب میں اس سے ملنے گیا تو لحظہ بھر کے لیے مجھے بھی نہ پہچان سکا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس کی آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں ٹھٹھک گیا۔ اتنے میں اس کی بہن نے کہا۔ "سعادت! سعید آیا ہے۔" اس کا چہرہ چمک اُٹھا اور آنکھیں جو کہیں خلاؤں میں دیکھ رہی تھیں یکایک میرے چہرے پر اُتر آئیں —— "آآآ —— خواجہ......" میری نظریں گلاس پر گڑ گئیں۔ وہ سمجھ گیا میں کیا سوچ رہا ہوں۔ لیکن اُس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "ٹھیک ہے

یار سب ٹھیک ہے۔ بکواس مت کر"! اس کی پھٹی پھٹی گلابی آنکھیں گلہ کر رہی تھیں کہ تو بھی ناصح بن گیا! اُسی کمبخت سے بھاگ کر تو میں نے پناہ لی ہے۔ تجھ سے مجھے بہتر سلوک کی توقع تھی۔

اس کی بڑی بڑی بے چین آنکھوں میں بلا کا حسن تھا۔ ایک زمانے میں اسے پنجاب کی دیہاتی بولیاں جمع کرنے کا شوق ہوا تھا جنھیں وہ اپنے جاننے والوں کے سامنے اکثر دہرایا کرتا۔ ان کے مقابلے میں باقی سب شاعری فراڈ تھی۔ آنکھوں کی تعریف میں یہ شعر اس نے کس کس کو نہیں سنایا ہوگا، ؎

گورا رنگ تے شربتی اکھیاں   گھنڈ وچ قید کیتیاں

اس کی اپنی آنکھوں میں بھی یہی شربتی کیفیت تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے وہ دھند میں لپٹی ہوئی جھیلیں دکھائی دیتیں جن کی تہ میں نہ جانے کتنی حسرتوں کے سفینے دفن تھے۔ وہ عمر بھر اس محبت اور ہمدردی کی جستجو کرتی رہیں جس سے وہ بچپن میں محروم ہو گیا تھا۔ اس کے دوستوں کا خلوص اور مداحوں کی قدردانی بھی اس کی تلافی نہ کر سکے۔

بھگت سنگھ کے بت کے سامنے آویزاں تصویر کی آنکھیں پھر میری چشم تصور میں اُبھر رہی ہیں۔ ان خشمگیں نگاہوں کے سایے میں پھر بڑی مصروفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر موضوعِ گفتگو بدل چکا ہے۔ فلمی ستاروں کی بجائے ادب و انقلاب زیر بحث ہیں۔ گہرے سانولے رنگ کا ایک بھاری آدمی کارلائیل اور گبن کے اندازِ تحریر میں گفتگو کر رہا ہے۔ تین نوجوانوں کے تمتماتے ہوئے چہرے اس کی تاثیر سخن کے شاہد ہیں۔ کمرے کی فضا ایکٹروں کے قصیدوں کی بجائے والٹیر، روسو، ڈانٹن، مارکس، لینن، ٹراٹسکی، سٹالن اور گورکی کے تذکروں سے گونج رہی ہے۔ اس بزرگ کا نام باری (علیگ) ہے ——— اس کے مریدوں کے نام سعادت حسن، حسن عباسی اور ابو سعید قریشی۔

باری صاحب سے مجھے اپنی پہلی ملاقات یاد نہیں۔ یہی احساس رہتا ہے جیسے میں انھیں ہمیشہ سے جانتا تھا۔ بہرحال یہ منٹو سے ملاقات سے بعد کی بات ہے۔ ان سے ہمارا تعارف علم و ادب اور حب الوطنی سے تعارف تھا۔ فلمی رسالوں کی جگہ اب ہم کتابیں خریدتے۔ متحرک تصویروں کی کہانیوں پر بحث کرنے کے بجائے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے پلاٹ سوچتے۔ دہشت پسندی کی داستانوں میں ہمیں لطف آتا۔ مستند حکمرانوں کا تختہ اُلٹنے والوں کے آئینوں میں ہمیں اپنا عکس نظر آنے لگا۔ ہم نے اپنی چشم تصور میں امرتسر کے گلی کوچوں کی بارہا مورچہ بندی کی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں رود بارِ انگلستان تک دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ یاجوج ماجوج کی طرح قید کر دیا تاکہ پھر دُنیا کو تاخت و تاراج نہ کر سکیں اور عظمتِ افرنگ کے لازوال آفتاب کو تانبے کے پُرانے پیسے کی طرح گردش سے نکال پھینکا۔ انقلاباتِ روس و فرانس کی داستانیں بچّوں کی کہانیاں بن گئیں۔ منٹو اُس زمانے کے بارے میں لکھتا ہے:-

"اب سوچا جائے تو اس زمانے کی یہ سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں لیکن
اس وقت یہ کھلونے ہی عظیم الجثہ اور قوی ہیکل تھے۔ ان سے پنجہ لڑانا گویا کسی دیو سے
زور آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری صاحب اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم

چاروں اس زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بہلانے کے جُرم میں پھانسی پا گئے ہوتے اور امرتسر کی خونیں تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا جو با خلوصِ دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رُخ کا بھی صحیح علم نہ تھا۔

باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ کھا لیتے تو ڈرتے رہتے تھے کہ توند نہ نکل آئے۔ حالانکہ فاقوں کے زمانے میں بھی ان کے جسم کا یہ حصہ بڑھتا رہا۔ زیادہ تیز نہیں بھاگتے تھے کہ ان کے دل پہ اس کا اثر پڑے گا۔ حالانکہ ان کے جسم کے اسی رئیس عضو نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی بڑی سُرخ بغاوتوں کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے اور پٹاخے کی آواز سُن کر زرد ہو جاتے تھے —— اشتراکی ادیب باری تمام عمر اپنی زندگی کی جلی اور خفی سُرخیاں جماتا رہا۔ لیکن وہ ان کے نیچے وہ مضمون نہ لکھ سکا۔ جو اس کے وزنی سر میں پرورش پاتے تھے۔"

(باری صاحب از منٹو۔ مجموعہ گنجے فرشتے)

اگر ہمارا مرشد بزدل نہ ہوتا تو دارالاحمر کے آتشدان پر رکھے ہوئے بھگت سنگھ کے بُت کے سائے میں چار ایسے بچے کھیل رہے تھے جن کے مجسمے ڈانٹن، روبس پیری، میزنی، لینن اور ٹراٹسکی کی گیلری میں کھڑے ہوتے۔

لیکن بغاوت کی وہ چنگاری جو سعادت کے سینے میں سلگ رہی تھی، دبی نہ رہ سکی۔ باپ کی بے رُخی بھائیوں کی بے اعتنائی اور عزیزوں کی ستم ظریفی سے جو شعلہ بھڑکا تھا، زمانے کے حوادث نے اُسے ہوا دی۔ اور وہ معاشرے کے دیمک خوردہ شہتیروں کو چاٹنے لگا۔ اس کے قلم کی روشنائی لاوا بن کر بہہ نکلی۔ جن لوگوں کے گھر اس کے راستے میں آئے وہ چیخ اُٹھے۔ انھوں نے قانون کو مدد کے لیے پکارا۔ مذہب اور اخلاق کے فائر بریگیڈ کو حرکت میں لائے۔ لیکن لاوا نہ رُکا، آگ نہ بجھی۔ حتیٰ کہ اس کی حدت میں اس کی اپنی زندگی کے سوتے بھی سُوکھ گئے —— وہ آتش فشاں پہاڑ اب خاموش پڑا ہے۔ اس کی آگ سے ڈرنے والے اب اس کے دامن میں پھول لگا رہے ہیں۔ لاوے کی مٹی بہت زرخیز ہوتی ہے۔

منٹو پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ آج ہر کوئی اس کا شناسا ہے۔ ہر ایک کو اس کی دو ایک باتیں ضرور یاد ہیں۔ ہر کوئی اس سے اپنی پہلی ملاقات کا حال لکھ رہا ہے۔ اس کی شخصیت اور فن کو نفسیاتی اور جمالیاتی کسوٹیوں پر پرکھا جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے اس کی خود پسندی پر دو صفحے سیاہ کر دیے ہیں۔ ایک نے اس کا موازنہ موپاساں سے کیا ہے۔ ایک اور بزرگ نے اسے سمرسٹ کا رتبہ دیا ہے۔ ان تعزیتی تحریروں میں حفیظ ہوشیارپوری کے ہاں مجھے بہت خلوص نظر آیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

"منٹو کی زندگی موت اور اُس کے فن کے بہترین ترجمان، اس کے محبوب شاعر غالب کے یہ اشعار ہیں:۔

جز در آئینہ ندیدم اثر سعیِ خیال　　　　بر قدر رہبر طلبگاریِ انساں رفتم

سازِ ہنگامہ نہ اندر خورِ طاقت کردم — راہ مستی نہ بہ اندازۂ ساماں رفتم
تا سبکروحیِ من رنج گرانی نہ کشد — شب وصل شدم و زودہ پایاں رفتم
نگہم نقد بہ گنجینۂ دلہا می زد — مژدہ باد اہلِ ریا را کہ ز میداں رفتم

حفیظ نے آگے چل کر لکھا ہے:-

"اس نے اپنی تاریخ وفات کی فرمائش کی تھی ۔ آج میں اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔"

چوں سعادت ز جہاں رفت ہمی گفت حفیظ — تشنہ از میکدۂ عالم امکاں رفتم
خواند ایں مصرع تاریخ ز غالب "یا آہ" — مژدہ باد اہلِ ریا را کہ ز میداں رفتم"

۶ — ۱۳۶۸ + ۶ = ۱۳۷۴ھ

اپنی نوکِ قلم سے وہ عمر بھر ریاکاری کے پیرہن تار تار کرتا رہا ۔ ان میں ایک پیرہن مذہب کا بھی تھا۔ ہمارے ملک میں راسپوٹین کے بھی باپ بستے ہیں۔ جہالت مآب بزرگ ، جن کی شرعی داڑھیوں ، نورانی چہروں ، مقدس دستاروں ، بے داغ عباؤں اور دور رس نگاہوں کو دیکھ کر شیطان بھی بہروپ بھرنا بھول جائے۔ خوش عقیدہ عوام ان کے دامِ فریب میں اس بری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ہل نہیں سکتے۔ یہ دلوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ راکھ کا سونا بناتے ہیں۔ ان کی خاکِ پا لاعلاج مریضوں کا علاج ہے۔ ان کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج بے روزگاروں کو روزی دلواتے ہیں۔ ان کی دکانوں پر حب کے تعویذ فروخت ہوتے ہیں جن سے سنگدل محبوب رام ہوں۔ ان کے کالے علم سے دشمن زیر ہوں اور مقدمے جیتے جائیں۔ یہ بانجھ کو بچہ دیں اور کنواریوں کے آسیب اتاریں ـــــ منٹو کا "صاحبِ کرامات" (مجموعہ: سڑک کے کنارے) بھی ایک ایسا ہی بزرگ ہے جو ایک سادہ لوح کسان کو، جو جلد بازی میں اپنی بیوی بھاتاں کو طلاق دے چکا ہے۔ لیکن اب اُسے دوبارہ بسانا چاہتا ہے۔ صاحبِ کرامات اُسے تحلیل دے کر پہلے اس کی کنواری بیٹی جیناں اور پھر اس کی بیوی بھاتاں (لڑکی کی ماں) کو نشہ پلا کر اپنے جلال کی آگ بجھاتا ہے۔ اس کے کندھے پر مزدور رومال ہے (جو حاجی لوگ تحفتہً لاتے ہیں) اس کی لال لال آنکھوں میں سُرمے کی تحریر ہے "سدرا ز ریش بزرگ۔ لمبے لمبے پٹے۔ ان کے اور داڑھی کے بال کھچڑی...... ہاتھ میں چاندی کی مٹھ والا عصا...... مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے اُٹھنا چاہا! مگر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اُسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور موجو سے کہا چودھری تیری بیٹی کا نصیبا جاگ اُٹھا۔ لیکن اس روز جیناں کا نصیبا سو گیا۔ رہی بھاتاں؟ وہ مطلقہ ہے اور مولوی صاحب فرماتے ہیں "جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ـــــ اور پھر اس کو اپنے گھر بسانا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے۔ پھر جائز ہے ـــــ ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کڑی سزا نہ دی جائے ...... موجو چودھری کو اپنی بیوی سے محبت ہے۔ ارشاد ہوا (خدا کی طرف سے جو مولوی صاحب سے ہم کلام ہے) تو ہم اس کی محبت کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ ایک رات کے لیے تو اس سے نکاح کرلے۔ دوسرے دن طلاق دے کر موجو کے حوالے کر دے ..... مولوی صاحب نے کنڈی بند کر دی۔ اور بھاتاں سے کہا۔ تم آج کی رات میری بیوی ہو......" صبح جاتے وقت مولوی صاحب اپنی داڑھی اور

پٹے بستر پہ تکیے کے نیچے چھوڑ گئے ——— منٹو کا یہ خاص پینترا ہے۔ مذہب کی آڑ لے کر ہمارے یہاں اکثر ایسے جرائم کیے جاتے ہیں۔ مہذب اخبار ایسی خبروں کو گول کر جاتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار کی آنکھیں تہذیب کی سطح کو نہیں اس کی تہہ کو دیکھتی ہیں۔ وہ چیزوں کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہیں ہوتا۔ کیمیاگر دھات کی ماہیت اور اس کے عناصر ترکیبی کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ ملمع سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کی بھٹی میں کھوٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ اسے کٹھالی سے نکال کر دوکاندار کے منہ پہ دے مارتا ہے کہ یہ لو اپنا سونا۔ اپنی تہذیب۔ منٹو اپنی تحریروں میں اپنے خاص ڈرامائی انداز سے جگہ جگہ معاشرے کی جعلی داڑھیاں نوچتا نظر آتا ہے کہ یہ لو اپنا میک اپ! اس میک اپ کے پردے سے کبھی "صاحب کرامات" اپنی تمام تر عریانی سمیت نمودار ہوتے ہیں اور کبھی وہ شیاطین جو حوروں کو ورغلا کر لاتے ہیں۔ اور انھیں چوک میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ واپس جانا چاہتی ہیں۔ لیکن وہاں رضوان کھڑا ہے جنت کے دروازے ان پر بند ہو چکے ہیں چودہ سو سال کی بت شکنی کے بعد بھی لات و منات دنیا میں موجود ہیں۔ اقبال نے کہا تھا ؎

جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

منٹو کا فن اسی فلسفہ حیات کا ترجمان تھا۔ اقبال نے شکایت کی تھی ؎

کارگہ حیات میں کیا کوئی غزنوی نہیں
کب سے ہیں منتظر کھڑے دیر و حرم کے سومنات

منٹو اسی سوال کا جواب تھا۔ یوم اقبال پر منٹو نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا۔

"اقبال نے خدا سے دعا مانگی تھی۔ ع مرا نور بصیرت عام کر دے ——— یہ دعا جو ایک دردمند دل سے نکلی تھی ضرور قبول ہو گی ......" منٹو اس وقت بھول گیا تھا کہ یہ دعا قبول ہو چکی تھی۔

لیکن محمود و ایاز کو الگ الگ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم کے ساتھ آذر کا نام بھی ضرور آئے گا۔ بت شکن منٹو نے اپنے خاک و خون سے اپنے نحیف و ناتواں جسم کی خاکستر کو آنسوؤں میں گوندھ کر بہت سے بت بنائے اور انھیں اولادِ آدم کے سامنے عالی شہ نشینوں اور طاقچوں میں سجا دیا۔

"بابو گوپی ناتھ اور ممی کی مورتیوں میں مجھے آدم و حوا کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کا گناہ آدم و حوا کا گناہ ہے۔ لیکن ان کی روحیں آلودگی سے پاک ہیں۔ منٹو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ان کا خمیر کس مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ منٹو کے مذہب میں انسان اپنے بارِ عصیاں کے باوجود انسان ہے، معبود ملائک، اور ان بتوں کا خالق۔ ان کے آستانے پر اپنا سر جھکانے کو کفر نہیں گردانتا۔ غالباً یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اقبال نے ؎

آدم خاکی نہاد بندۂ مولیٰ صفات

کا نام دیا تھا۔ ان سے مجھے "میلادِ آدم" کی یاد آتی ہے۔ منٹو نے اپنے کتبے میں لکھا ہے "یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے ...... وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا"...... کیا ہم اسے اتنے بھی غلو کی اجازت نہیں دے سکتے؟ وہ کشمیری تھا۔ جرم و عصیاں کے آتش کدوں سے وہ ان قدیم عورتوں کی طرح جو ریل کی پٹڑیوں سے ایندھن اکٹھا کرتی ہیں، یہاں جرمان

کی راکھ میں لپٹی ہوئی محبت کی چنگاریاں چُن چُن کر اپنی کانگڑی بھرتا رہا" تاکہ رسوم و قیود کے پالے کی ماری ہوئی روحیں اپنا سینہ گرم کر سکیں۔ سراج کی سرد مہری، بسم اللہ کی اداس آنکھوں اور شاردا کے سگرٹ کے ڈبے میں اسی آگ کی چنگاریاں پوشیدہ ہیں۔ سڑک کے کنارے کے چولہے جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر داریاں چڑھی ہیں۔ اسی ان دیکھی آگ سے گرم ہیں۔ وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹ میں یہی کانگڑی چھپائے ہوئے ہے...... وہ خود بھی اسی پالے کا شکار تھا۔ اس نے پرمتھیس (PROMETHEUS) کی طرح دیوتاؤں کے آستانے کی آگ چرالی۔ اس جرم کی پاداش میں اسے چٹان پر باندھ دیا گیا۔ اور محاسبہ کے گِدھ اس کا جگر نوچنے لگے۔ اگلی سب سے بڑا گناہ ہے ——— منٹو کا آتش دان اسی آگ سے روشن ہے۔ لیکن اس کے اوپر بھگت سنگھ کا بُت کیا کر رہا ہے؟ ——— تخریب و تخلیق کہ شاید ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

منٹو کی تخلیقی کاوشوں کی ابتدا ترجموں سے ہوئی۔ پہلا ترجمہ (جہاں تک مجھے یاد ہے) ایک پُراسرار طویل افسانہ دست بریدہ بھوت تھا۔ اپنی قسم کا یہ پہلا اور آخری ترجمہ اور تجربہ تھا۔ باری صاحب تاریخ و معاشیات کے طالب علم تھے۔ انھیں افسانوی ادب سے کچھ ایسا شغف نہیں تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو اچھے بُرے کی پہچان نہ بتا سکتے۔ ذوقِ سلیم نے مدد کی اور دارالاحمر میں وکٹر ہیوگو، لارڈ لٹن، گورکی، چیخوف، پوشکن، سلوگ، گوگول، دوستووسکی، اندریف، اوسکر وائیلڈ اور موپاساں کی کتابیں نظر آنے لگیں۔ وکٹر ہیوگو، باری صاحب کے نزدیک دُنیا کا سب سے بڑا ناولسٹ تھا۔ ہم نے اس کی تصانیف دُور دُور سے منگوائیں اور انھیں درسی کتابوں کی طرح پڑھا۔ باری صاحب چاہتے تھے کہ اس کی (LES MISRABLE) کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اس کی ضخامت دیکھ کر ہمت نہ ہوئی۔ منٹو نے البتہ سرگذشتِ اسیر کے عنوان سے (LAST DAYS OF A CONDEMNED) کا ترجمہ کر دیا۔ یہ کتاب سزائے موت کے خلاف پُرجوش احتجاج ہے مصنف صاحب کا چھوٹا بیٹا ہر ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ آسکر وائیلڈ کی "ویرا" کا ترجمہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ منٹو نے باری صاحب کے بارے میں اپنے مضمون میں اس کتاب کی اشاعت کا مفصل ذکر کیا ہے ——— یہ ڈراما روس کے دہشت پسندوں اور نراجیوں کی سرگرمیوں سے متعلق تھا۔ جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ امرتسر میں ان دنوں اگر کوئی ہوائی بندوق سے بھی مسلح ہونا چاہتا تو توپ دم کر دیا جاتا۔ چنانچہ جب اس کے اشتہار شہر کی دیواروں پر نظر آئے اور لوگوں کو "مستند حکمرانوں کے عبرت ناک انجام۔ روس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام کی خبر دی گئی" اور "زاریت کے تابوت میں آخری کیل" گاڑا گیا تو کوچہ وکیلاں میں بھگت سنگھ اور دت کے ان چیلوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ جو امرتسر کے گلی کوچوں میں ماسکو کا ناٹک کھیلنا چاہتے تھے اور ہندوستان میں انگریز کی شہنشاہیت کے خاتمے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن خواجہ عبدالحمید صاحب ریٹائرڈ ڈی۔ ایس۔ پی نے پولیس کے سفید پوشوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ تو اپنے بچے ہیں میاں۔ جاؤ اپنا کام کرو اور بلا ٹل گئی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر پولیس نے بچّوں کے اس کھیل کا اپنی روایتی تندہی سے تعاقب کیا ہوتا تو منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کا افسانہ "تماشا" (مجموعہ: منٹو کے افسانے) انھی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس میں ۱۹۱۹ء کے مارشل لاء کے ہنگامے کو ایک بچّے کی نظروں سے دیکھا گیا ہے اس کا ہیرو خود منٹو ہے۔ اس وقت وہ کوئی سات برس کا تھا۔ قانون کی بے اعتنائی نے اس بچّے کو بڑا ہونے سے روک دیا۔ عزیزوں کی بے اعتنائی کیا کم تھی کہ وہ اِدھر کا رُخ

کرتا۔ اس کے علاوہ اُسے پٹے ہوئے راستوں سے نفرت تھی۔ لیڈروں کی خودغرضی سے یہ نفرت اور بڑھ گئی۔ وہ خلوص کا بھوکا تھا۔ لیکن ان لوگوں میں خلوص کہاں تھا۔ وہ چیخ اٹھا "ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ"۔

"ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک کی فضا بگاڑ رہے ہیں۔ یہ نام نہاد لیڈر اپنی اپنی بغل میں ایک ایک صندوقچی دبائے پھرتے ہیں جس میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کتر کر روپیہ جمع کرتے ہیں ...... ان کے ہر سانس میں آپ ریاکاری اور دغابازی کا تعفن محسوس کرتے ہیں، لمبے لمبے جلوس نکال کر منوں بھاری ہاروں کے نیچے دب کر، چوراہوں پر طویل طویل تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکھیر کر یہ نام نہاد رہنما اپنے لیے راستہ بناتے ہیں۔ جو عیش و عشرت کی طرف جاتا ہے ...... یہ لوگ چندے اکٹھے کرتے ہیں، مگر کیا انھوں نے آج تک بے کاری کا حل پیش کیا ہے ...... یہ لوگ جن کی روح لنگڑی، دماغ اپاہج، زبان مفلوج اور ہاتھ پیر شل ہیں۔ ملک و ملت کی رہبری کیسے کر سکتے ہیں ...... ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں، صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمرؓ کا سا اخلاق رکھتا ہو جس کے سینہ میں اتاترک کا سپاہیانہ جذبہ ہو ......"

(منٹو کے مضامین مطبوعہ ۱۹۴۲ء)

یہ مضمون جیسا کہ اس کی تاریخ اشاعت سے ظاہر ہے۔ آزادی سے بہت پہلے لکھا گیا اور منٹو کی زندگی میں بمبئی کے پہلے دور کی پیداوار ہے۔ دارالاحمر کے زمانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسے پڑھنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ سیاست اور لیڈروں کی دنیا کے بارے میں اس کا کیا ردِ عمل تھا اسی مجموعہ میں آگے چل کر اس نے اپنا خیال اور واضح کر دیا ہے:۔

"سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیڈروں اور دوافروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوافروشی دونوں پیشے ہیں۔ خیر کہنا یہ ہے کہ سیاسیات سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سینما سے۔ گاندھی جی سینما نہیں دیکھتے، میں اخبار نہیں پڑھتا۔ اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنے چاہئیں اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں"۔

(باتیں۔ منٹو کے مضامین)

بادی النظر میں یہ چند سطور "شوخیٔ تحریر" ہیں اور بس۔ درحقیقت گاندھی جی اور فلموں کا بُعد لیڈروں میں ذہنی توازن اور (SENSE OF HUMOUR) کے فقدان کے نشان ہیں گاندھی جی اور فلم محض علامتیں۔ سعادت نے اپنے خاص منٹوی انداز میں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کو بے نقاب کرنے کا کام لیا ہے۔ تضاد کو ابھارنا طنز کی خاص ٹیکنیک ہے۔ منٹو اس

کا ماہر تھا۔

"وہی بمبئی تھا، جہاں کانگرس نے امتناعِ شراب کا قانون پاس کر کے ان ہزارہا مزدوروں کو بیکار کر دیا تھا جو تاڑی نکالتے تھے وہی عروس البلاد تھی جس کے گھونگھٹ کا ایک حصّہ حریری ہے اور دوسرا کھردرے ٹاٹ کا ——— وہی بمبئی جہاں اُونچی اُونچی خوبصورت عمارتوں کے قدموں میں فٹ پاتھوں پر ہزارہا مخلوق رات کو سوتی ہے۔

"مسلم لیگ مسجد ہے۔ کانگرس مندر ہے۔ کانگرس سوراج چاہتی ہے مسلم لیگ بھی۔ لیکن دونوں مل جل کر کام نہیں کر سکتے...... ان کے خون کا ملاپ موریوں اور بدروؤں میں ہوگا۔"

(باتیں)

ایسے میں سیاسیات سے اس کی برگشتگی قدرتی بات تھی ——— لیکن میں امرتسر سے بمبئی پہنچ گیا ——— جلیانوالہ باغ کے شہر میں ماسکو کا منڈوا اپنے اشتہار کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ اس کی سین سینری، پردے پٹلے ڈائرکٹر کے گھر میں منتقل ہو گئے اور بعد میں کباڑ کے بھاؤ لاہور کے ایک کتب فروش نے خریدے۔ دنگلوں، مویشیوں کے میلوں، منشیات کے ٹھیکوں، عصمت فروشی اور اس طرح کے دوسرے کھیل تماشوں کی طرح کتاب چھاپنا بھی ایک تماشا تھا۔ اور یہ کتاب (ویرا) تو سچ مچ کا ناٹک تھا۔ جس کے لیے لائسنس ضروری تھا۔ لیکن لائسنس نہ ملا اور پروڈیوسر بھاگ گیا۔ باری صاحب غائب تھے! انھیں اس ناٹک کا انجام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ بھول گئے تھے کہ (PICTURE OF DORIAN GRAY) کا مصنف دہشت پسندی سے اتنا ہی دُور تھا جتنے گاندھی جی سینما سے ناٹک کے اختتام پر ویرا آسکر وائیلڈ کی ہیروئن وہی خنجر جسے وہ زار روس کے سینے میں گھونپنے کے لیے لائی تھی۔ اپنے سینے میں گھونپ لیتی ہے ——— اسے زار روس سے عشق تھا۔ محبت فتح یاب ہوئی۔ فرض منہ دیکھتا رہ گیا۔

لیکن تماشا ابھی ختم نہیں ہوا۔ "بچوں کا کھیل" ابھی جاری ہے ——— پندرہ دن غائب رہنے کے بعد ویرا کے "پروڈیوسر" باری صاحب پھر آموجود ہوئے ۔ اب کے ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر پبلشر کے "بیک اپ" میں۔ اخبار کا نام "خلق" تھا۔ ہمیں حکم ہوا کہ فوراً کام شروع کیا جائے "تاکہ اخبار کی اشاعت میں مزید تاخیر نہ ہو۔ منٹو کا افسانہ "تماشا" "خلق" کے پہلے شمارے میں شامل تھا۔ میں نے بھی اپنی دانست میں ایک بڑا انقلاب انگیز مضمون لکھا۔ "مزدور" جس میں جذباتیت کی خاکساری بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اور سرمایہ دار کو خوب موٹے موٹے "مُفرّس و معرّب" الفاظ میں کوسا گیا تھا۔ یہ مضمون "آدم" کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ منٹو نے بھی مارے ڈر کے اپنے افسانے کے مصنف کا اعلان نہ کیا۔ باری صاحب نے ہیگل اور مارکس کے بارے میں اپنے خاص خطیبانہ انداز میں کچھ لکھا۔ جسے میں شاید آج بھی نہ سمجھ سکوں۔ مگر وہ ہمارے پیر و مرشد تھے جن کے روحانی فیض نے ہمیں اپنے تمام ہم عمروں سے ممتاز و ممیز کر دیا تھا۔ اور تو اور ہمارے پروفیسر بھی (جن میں فیض احمد فیض اور صاحبزادہ محمود الظفر جیسے لوگ بھی شامل تھے) ہمیں ادب و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسے میں ہمارے استاد باری کو کوئی بے معنی اور بے مصرف

بات کیونکر کہہ سکتا تھا۔ اس مضمون کا مطلب کسی کی سمجھ میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ اتنا ضرور ہوا کہ مارکس کے نام سے پولیس کے کان کھڑے ہو گئے۔ لیکن "نملق" اپنے پہلے ہی شمارے کے بعد مالی مشکلات میں مبتلا ہو چکا تھا اور باری صاحب کا اخباری دنیا میں انقلاب بپا کرنے کا خواب بھی چکنا چور ہو گیا۔

باری صاحب بڑے بڑے منصوبے بناتے اور انھیں چائے کی پیالی میں گھول کر پی جاتے۔ وہ عجیب غریب خواب دیکھا کرتے۔ وہ کہا کرتے کہ جذبۂ انقلاب کو جلا دینے کے لیے قید ہونا ضروری ہے۔ لیکن سعادت کہا کرتا تھا "باری صاحب آپ بکواس کرتے ہیں۔ آپ وہاں دو دن زندہ نہیں رہ سکتے۔" لیکن باری صاحب کا خواب ضبط کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ "تم دیکھ لینا وہ دن دُور نہیں جب تم مجھ سے جیل میں ملنے آیا کرو گے" ——— "جیل میں"۔ وہ اپنی ڈائری لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہلکے گلابی ——— (مجھے رنگ اچھی طرح یاد نہیں) رنگ کا نہایت ہی عمدہ کاغذ لے کر شہر کے بہترین جلد ساز سے کالے عملی چمڑے کی ایک ڈائری بنوائی گئی۔ اس کے پہلے ورق پر آہنی سلاخوں والے دروازے کی ایک کٹنگ نہایت نفاست سے چپکائی گئی۔ اس تصویر کے اُوپر کا تب سے "دریچۂ زنداں" کا عنوان نہایت ہی عمدہ خط میں لکھوایا گیا ———

اشتراکی ادیب باری بہت بڑا رومان پسند تھا!

اس کے چیلے اپنے گورو کی طرح مارکس اور اینگلز کا چلّا نہ کھینچ سکے۔ مادہ پرستی کا یہ وظیفہ ان کی سبک اور نازک روحوں کے لیے بہت بوجھل تھا۔ ان کی انفرادیت، اجتماعیت سے سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی ——— منٹو کی "انا" ہجوم کو خدا نہیں مان سکتی تھی مگر "انا الحق" کی منزل ابھی دُور تھی۔

ابو سعید قریشی

منٹو ماموں کی موت

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ منٹو ماموں میانی صاحب کے قبرستان سے اُٹھ کر گھر چلے آتے تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیاتِ ثانی کے معجزے کو نظر انداز کر کے ان سے صرف اتنا کہوں گا —" منٹو صاحب۔ آپ نے آج تک جتنی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکت آپ کی موت تھی"۔

بہاول پور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا ٹسٹ میچ ہو رہا تھا اور میں ڈرنگ سٹیڈیم میں بیٹھا طالع یار خاں کو میچ کا چشم دید حال نشر کرنے میں مدد دے رہا تھا کہ لاہور سے میرے نام ایک ٹرنک کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں فوراً غم سے بے قابو نہیں ہو گیا بلکہ مجھ میں شدید برافروختگی پیدا ہو گئی۔ مجھے منٹو ماموں پر انتہائی شدید غصہ آرہا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ سلوک کس طرح کر سکتے ہیں ؟ لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اور جب میں بولا تو میری آواز سے غیر معمولی تشویش نمایاں تھی۔ میں نے پوچھا کہاں انتقال ہوا ؟" جواب ملا۔ گھر پر"۔ اس جواب سے مجھے بڑا اطمینان ہوا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اچانک گھر سے باہر کسی اور مقام پر موت سے ہم آغوش نہ ہو گئے ہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی تانگے پر، کسی ریستوران میں، کسی پبلشر کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے یا کسی فلم سٹوڈیو میں انھیں اچانک موت آگئی ہو......

جب میں اپنی جگہ پر واپس گیا تو میچ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے والے ساتھیوں نے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات تھی۔

میں نے ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ دیا۔ "امپائر نے سعادت حسن منٹو کو آخر آؤٹ دے ہی دیا۔ آج صبح ان کا انتقال ہو گیا"۔

منٹو ماموں کو آؤٹ دینے کے لیے امپائر سے کئی بار اپیلیں کی جا چکی تھیں لیکن ہر بار اپیل مسترد کر دی گئی تھی۔ اب ان کی بہ ہمہ اور ڈانوا ڈول اننگس ختم ہو گئی تھی۔ وہ کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی حنیف محمد کی طرح ہوشیار اور محتاط کھلاڑی نہیں بن سکتے تھے، جسے وہ لاہور کے تیسرے ٹسٹ میچ میں کھیلتے ہوتے دیکھنے کے بے حد مشتاق تھے۔ اس کا علم مجھے ان کی موت کے چوبیس گھنٹے بعد گھر پہنچ کر ہوا۔ درحقیقت ان کی زندگی کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے اُنھوں نے ایک ریستوران میں اپنے دوستوں سے کہا تھا "حامد جلال کو واپس آجانے دو میں اسی کے ساتھ ٹسٹ میچ میں حنیف کا کھیل دیکھنے جاؤں گا"۔

ان کی دوسری خواہش اس بے یار و مددگار عورت کی موت پر افسانہ لکھنے کی تھی جس کی برہنہ لاش گجرات میں سڑک کے کنارے پائی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس عورت اور اس کی ننھی سی بچی کو بس کے اڈے سے اغوا کیا گیا اور نصف درجن کے قریب ہوس پرستوں نے اپنی بہیمانہ خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کڑکڑاتی سردی میں ان کے چنگل سے نکل

کر بھاگی تو اس کے جسم پر پیاس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹے نے منجمد کر دینے والی سردی میں دم توڑ دیا۔ اس المیہ سے منٹو ماموں بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو گجرات سے کچھ لوگ ان کے پاس آتے تھے اور انھوں نے حادثہ کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں ضرور اشتعال اور ہیجان پیدا ہوا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو ماموں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی ہوگی جو ان کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزرنے کے بعد گھر واپس آئے، تھوڑی دیر بعد انھیں خون کی قے ہوئی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جو اُن کے قریب ہی کھڑا تھا، خون کی دھاریوں کی طرف انھیں متوجہ کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یہ تو پان کی پیک ہے انھوں نے اسے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس کے بعد انھوں نے حسبِ معمول کھانا کھایا اور سو گئے۔ گھر بھر میں کسی کو وہم گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات خلافِ معمول ہوئی ہے۔ کیونکہ میرے لڑکے نے منٹو ماموں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے خود منٹو میاں کو بھی اس کے متعلق کوئی تشویش نہ ہوئی ہو۔ یوں بھی وہ گھر والوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اُٹھا کر بتایا کہ وہ شدید درد محسوس کر رہے ہیں اور اب تک بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا جگر پھٹ گیا ہے۔ ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورتِ حال کا تن تنہا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انھوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو جگایا اور انھیں موت کے مُنہ سے نکالنے کی جدوجہد شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کئی شدید علالتوں کے بعد وہ شفایاب ہو چکے تھے اس لیے کسی کو یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انھیں آؤٹ دینے کے لیے امپائر کی انگلی اسی وقت سے فضا میں بلند ہونی شروع ہو گئی تھی، جب منٹو ماموں کو خون کی پہلی قے آئی تھی۔

منٹو ماموں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے جو کچھ سُنا ہے، اس سے میں یہی اندازہ لگا سکا ہوں کہ کافی دیر تک انھیں خود بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آ گیا ہے۔ ڈاکٹر کے انجکشن وغیرہ لگانے کے گھنٹہ ڈیڑھ بعد تک وہ مایوس نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی حالت خلافِ معمول نہیں سنبھلی۔ ان کی نبض برابر ڈوبتی گئی اور درد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ خون کی قے بھی بند نہیں ہوئی۔ صبح کو ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ منٹو ماموں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

اس وقت منٹو ماموں کے ہوش و حواس بالکل بجا تھے اور ہسپتال کا نام سُنتے ہی وہ بول اُٹھے "اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور یہیں سکون سے پڑا رہنے دو۔"

گھر کی عورتوں کے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر منٹو ماموں فوراً مشتعل ہو گئے اور انھوں نے غضبناک آواز میں کہا "خبردار جو کوئی رویا۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا منہ رضائی سے بند کر لیا۔

منٹو کا یہ اعلیٰ ذوق تھا جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا، وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اُسے مرتا ہوا دیکھیں۔ منٹو ماموں مجسم غیظ و غضب بنے ہوئے تھے معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے

ناراض تھے یا شراب سے ——— جو اُن کی قبل از وقت موت کی ذمہ دار تھی۔

ایمبولنس آنے سے پہلے صرف ایک یا دو بار اُنھوں نے اپنے منہ سے رضائی ہٹائی۔ انھوں نے کہا "مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے۔ اتنی سردی شاید قبر میں بھی نہیں لگے گی۔ میرے اوپر اور رضائیاں ڈال دو۔" کچھ دیر توقف کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ انھوں نے آہستہ سے کہا: "میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو......"

شراب کے لیے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لیے ایک پوا منگا لیا گیا۔ انھوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے "میرے لیے دو پیگ بنا دو۔" اور یہ کہتے ہوئے درد اور شدید تشنجی دورے کے باعث وہ کانپ سے اُٹھے۔

منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت بھی اپنے لیے رحم کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا وقت آ پہنچا ہے لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے اپنے اُوپر جذباتیت نہیں طاری ہونے دی۔ انھوں نے اپنے بچّوں یا کسی اور کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ نگاہِ واپسیں یا وصیت کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لیے زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے، کیونکہ ان کی زندگی اور روح تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے ——— وہاں پہنچ کر انھیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ محبت کرتے رہتے ہیں۔

بسترِ مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انھیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا ہم معنی سمجھنے لگے تھے جس پر جسمانی فتح کسی صورت میں ممکن نہیں ہے، جس طرح موت کے آگے کوئی انسان پیش نہیں پا سکتا اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہوتے تھے۔ لیکن ان کی فطرت چونکہ ہمیشہ سے باغیانہ تھی اس لیے انھوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔ انھیں شکست سے بھی سخت نفرت تھی خواہ وہ موت کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے۔ جہاں کوئی انھیں مرتا نہ دیکھ سکے۔ جہاں کوئی ان کی شکست کا نظارہ نہ کر سکے۔

ان سے کم درجے کا آدمی شاید ایک ڈرامائی موت کا اہتمام کرتا تاکہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا چرچا کریں۔ اس پر مضامین لکھے جائیں اور اس کے اعزا و احباب کہہ سکیں کہ اس کی زندگی ضرور ایسی تھی جسے ہم پسند نہیں کرتے تھے، لیکن مرنے سے پہلے وہ منفعل ہو گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا۔ لیکن منٹو ماموں ریاکار نہیں تھے۔ اُنھوں نے اس خواہش کا سختی سے مقابلہ کیا۔ ان کی موت کے وقت صرف ایک پہلو ڈرامائی تھا یعنی شراب طلب کرنے کا منظر۔ لیکن اس کا فائدہ بھی مرکزی کردار کو پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کا صحیح مفہوم صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔

میں اُس وقت موجود ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ایک حد تک میرے سامنے بے نقاب کر دیتے۔ اور یہ کچھ

مشکل بھی تھا کیونکہ انھیں صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی۔ سانپ اور انسان کی کہانی نہ بھولنا۔ میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتا اور شراب کا آخری جام انھیں پینے کو دے دیتا۔ صرف یہی ایک جملہ ہر بات واضح کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔ سانپ اور انسان کی کہانی صرف اتنی تھی کہ ایک آدمی نے اپنے دوستوں کے منع کرنے کے باوجود ایک زہریلا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن سانپ نے اپنا سارا زہر اس کے جسم میں اُتار دیا، تو اس نے بھی سانپ کو پکڑ لیا اور اُس کا سر کاٹ کر پھینک دیا۔

ایمبولنس جیسے ہی دروازے پر آکھڑی ہوئی، انھوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چمچہ وسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی۔ لیکن ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق سے نیچے اُتر سکا ہوگا۔ باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر غشی طاری ہو گئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے ہوش و حواس کھوئے تھے۔ انھیں اسی حالت میں ایمبولنس میں لٹا دیا گیا۔

ایمبولنس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انھیں دیکھنے کے لیے اندر گئے تو منٹو ماموں مر چکے تھے۔ دوبارہ ہوش میں آئے بغیر راستے ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

حامد جلال

منٹو کی موت

منٹو کی موت پر مجھے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ کچھ دنوں پہلے ہی سے میں نے یہ بُری خبر سننے کے لیے جی کڑا کر رکھا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اُس کی کیفیت بیچ مچ سرکس کے اُس تماشاگر کی سی ہو گئی تھی، جو عمر بھر بہت بلندی پر تار پر چلنے کا خوف ناک کھیل دکھلاتے دکھلاتے تھک چکا ہو۔ اور ہر لمحہ اُس کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ منٹو مُصر تھا کہ وہ کبھی نہیں گرے گا، مگر اُس کے پاؤں میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ قضا سے کھیل رہا ہے اور یہ کھیل عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے۔

منٹو زبان سے خواہ کچھ بھی کہتا رہا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اِس کھیل سے اُکتا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس سے مخلصی پا جائے۔ فحش نگاری کے سلسلے میں کراچی میں اُس پر جو آخری مقدمہ چلا، اُس کی کارروائی چند ہی لمحوں میں ختم ہو گئی۔ منٹو نے نہ اپنی مدافعت میں کوئی دُھواں دھار تقریر کی، اور نہ قانونی مشیروں سے ہنگامہ ہی برپا کرایا۔ یہاں تک کہ احتجاج میں ایک لفظ بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ چپکے سے جرمانہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔

وہ مقدمہ بازی ہی سے نہیں ادب سے بھی بلکہ زندگی سے بھی اُکتا گیا تھا۔ وہ گھریلو بندھنوں، سماج کے رکھ رکھاؤ اور عام دُنیوی علائق سے بیگانہ سا ہو گیا تھا۔ گراوٹ کا یہ وہ درجہ ہے کہ کمزور انسان خودکشی کر لیا کرتے ہیں، مگر منٹو کا ہاسہا دم خم آڑے آ گیا۔ اُس نے خودکشی نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ اُس نے اپنے کو ایک ایسے راستے پر ڈال لیا جو انجام کار خودکشی ہی کا مترادف بنا۔

ادب کے متعلق یہ حکم لگانا کہ کونسی چیز زندہ رہے گی اور کونسی مٹ جائے گی، بہت مشکل ہے۔ مگر منٹو کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک باغی کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا اور اُس کے کردار کے بغیر اِس دَور کی داستانِ ادب مکمل نہ ہو سکے گی۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ اُس کے ہم عصروں کو باوجود بسیار نویسی اور شہرت کے حاصل نہیں ہو سکا۔

منٹو نے آزادیٔ تحریر کے لیے جو بغاوت کی وہ سب ادیبوں کے لیے، خواہ وہ کسی گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، بہت فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ اس سے ایک تو ادب پر احتساب کی گرفت اتنی کڑی نہیں رہی، جتنی کہ پہلے تھی، دوسرے لکھنے والے چاہے کمتر درجے کا ادب ہی کیوں نہ پیش کر رہے ہوں، مگر جہاں تک فن کے ساتھ خلوص اور صداقت برتنے کا تعلق ہے، وہ پہلے سے کہیں نڈر اور بے باک نظر آتے ہیں۔

منٹو کی ایک اور خصوصیت، جو اُسے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ تھی کہ اُس نے عمر بھر کبھی سیکنڈ فڈل

(SECOND FIDDLE) بننے یعنی کسی کے ماتحت محض سنگت کا فرض ادا کرنے کی کوشش نہیں کی یہی وجہ ہے کہ اُس نے خود کو کسی جماعت یا گروہ کے ساتھ منسلک نہ ہونے دیا۔ وہ اپنا راگ، بلند یا پست جیسا بھی وہ تھا، اکیلا ہی الاپتا رہا۔ اُس کو نہ کسی کی اعانت کی ضرورت تھی نہ پروا۔ یہی وہ بے نیازی تھی جس نے زندگی میں اور ادب میں اُس کے بہت سے مخالف پیدا کر دیے تھے، مگر اُن کی مخالفت اُس قبولِ عام کے سامنے ہیچ ثابت ہوئی، جو اپنی زندگی ہی میں اُسے حاصل ہو گیا تھا اور جس میں آج اُس کے مرنے کے بعد اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

غلام عبّاس

منٹو کا ایک خط

برادرم، السلام علیکم

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گذر چکے ہیں لیکن میں تمھیں خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لیے نیا تھا، بہرحال اُس ماحول سے یقیناً بہتر ہے جس میں مَیں نے ۴۲ برس تک جھک ماری تھی —— وہاں جب تک رہا سولی پر لٹکتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں، نہ صفیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نگہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے، ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا۔ ابا فلاں چیز لادو، فلاں چیز لادو، تمھیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کی فرمائش اپنی تنگدستی کی بنا پر پوری نہیں کر پاتا تھا تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض منحوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی۔ اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں مَیں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان کُش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لیے تھے کہ آپ کے جہنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھلتا رہا۔ نہ صرف گھلتا رہا بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا میں بھی تمھارے دُکھوں اور غموں کو اس لیے رقم کر آیا ہوں تاکہ آنے والی نسلیں تم سب کو مظلوم کی حیثیت سے یاد رکھ سکیں۔

میں یہاں ہر وقت یہی دُعا کیا کرتا ہوں کہ یہ زندگی میرے تمام ہمعصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔ وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی جب مجھی کو وہاں سے آنا پڑا۔ تو نہ جانے وہ کیوں ٹکے ہوئے ہیں، آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں۔ جو لاہور میں موجود ہیں۔ اُن سے زبانی کہہ دیں۔ جو لاہور سے باہر ہیں۔ اُنھیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچوں سمیت میرے پاس آجائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں۔ اس لیے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

زمانے نے نہ میری قدر کی اور نہ دوسرے اہلِ قلم کی تمھیں علم ہے۔ اگر ہم لوگ تمھارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم، ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے۔ مزے میں ہے۔ اکثر قلمکاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح پھُولے بیٹھے ہیں۔ بعض نے تو تمھارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجویات سپردِ قلم کی ہیں کہ جب تک کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا

جائے۔ سُنی ہی نہیں جاسکتیں۔ اگر وہ چھپ گئیں تو تمھارے ہاں کے بعض سرپھرے سرِ بازار پیٹیں گے۔

بہرحال ہجویات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا۔ تمھیں اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا۔ نقوش میں اُس کا تبصرہ کردینا۔

تمھارے ہاں کے ادیب اور تمھارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔ وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی اُمیدوں کے پیٹ میں تو صرف بہن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمھارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا، اور ساتھ ہی غدارِ وطن بھی، تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمھارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جاننا میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمھیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جُرم میں چلے تھے۔ حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے۔ کبھی وارنٹ نکلے، کبھی گرفتار ہوا۔ کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا۔ مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیے جاتے۔ جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو، وہاں کون مسخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جائیں تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے دُور بھاگا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دُور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہوتے ہیں۔ تو تنقید میں علامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے ان بے تحاشا لکھے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کرلیں اور میرے فن کی وہ فنیزگی کا جھٹکا کردیں۔

آج ادب بھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کہے، اُس کا اُلٹا کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اُس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تینوں لفظوں کا صحیح استعمال کرلیا تو سمجھ لیجیے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں۔ اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہو گا اور نہ واقعیت کے ساتھ خلوص، جب فن کار کے دل کے ساتھ نقاد کا بھی دل دھڑکے گا۔ تو پھر جو کچھ لکھا جائے گا، اس پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔[1]

یہاں شرابِ طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجیے، شرابِ طہور نوش کیجیے۔ تمھارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب

---

[1] نقادوں کے بارے میں منٹو کے جو خیالات ہیں۔ مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترمیم کرنے کا حق بھی نہیں۔ (محمد طفیل)

ملتی تھی اور اُس جگر پاش شراب کے لیے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لیے ذلیل تک ہوا دوستوں میں میری عزت نہ رہی۔ جدھر جاتا تھا۔ احباب مُنہ موڑ لیتے تھے راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ میرے منہ پر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میری جیب میں دھیلا تک نہیں ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کی جیب میں دھیلا چھوڑ اتنے روپے ہیں کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں نے شراب کو خانہ خراب اس لیے کہا ہے کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا، ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں وہ سب ہزاروں برس پرانی ہیں۔ لیکن ان کمبختوں کا جسم اور بانکپن تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لیے کہ تم اس مسئلے میں نرے چغد واقع ہوئے ہو۔ تمھاری چغدیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی مُرو وقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے کہ تمھارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بکواس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمالی اَور لڑکے بھی ہیں کہ تمھارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اُس کمبخت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جانبری نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ میرے مقابلہ ہی کا کون تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا پھبتی باز ہے۔ کہنے لگا تُو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تُو نے اپنے افسانوں کے عُنوان چُنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سُوجھے تو میرے شعروں کو دھر رگڑا اور محسن کُشی ایسی کی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی اُس میں بجائے میری شکر گذاری کے اظہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ الٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا دہ نخا، رنڈی باز تھا، جوا کھیلتا تھا۔ اور اُس کی پاداش میں جیل تک ہو گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

تمھیں علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اُس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کیں تو میں نے دل میں کہا لعنت ہو سعادت حسن منٹو تمھاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان، میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں۔ اور پیتے ہی ہیں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری انا بیدار ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے۔ میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اُسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ اور میں اُس سے کہتا ہوں۔ شعر کہنا کونسا کمال ہے مرزا صاحب، میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا پُوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے ——— بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اُسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

بچا سام کا دبدبہ تو تمھارے ہاں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو!

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیے۔ لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں ہیں کہ تم اپنی ننھی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو میں نے یہ خبر بد بھی سُنی ہے کہ اب تو تمھارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں، اور تم سب اُلّوؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے

اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی تن آسانی اچھی نہیں، ورنہ پچھتاؤ گے —— حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُس سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دُعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آجائیں تاکہ تمھاری جان چھوٹے میں تو ان سے نمٹ ہی لوں گا۔ فراڈ کو فراڈ ہی پچھاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں۔ تمھارے ہاں میرا بڑا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کباب ہو گیا۔ اس لیے کہ جب تک میں وہاں رہا، سب نے مل جل کر مجھے اپنے ہاں سے دُور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے آگیا ہوں۔ تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گمشدگی کے اعلانات کیوں کیے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں جو مجھے اپنے ہاں ناک تک صاف نہیں کرنے دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے روپوش ہونے پر خصوصی ماتم کیوں کر رہے ہیں۔ ان کا بھی میرے ساتھ یوسف کے بھائیوں جیسا سلوک تھا —— ان حالات میں تمھیں اپنے اس منافقانہ رویّہ پر شرم آنی چاہیے۔

یہاں میرے کچھ قدردان پیدا ہو گئے ہیں۔ اور پچھلے دنوں انھوں نے میرے ذمہ یہ کام کیا تھا کہ میں یہاں کے بارے میں اپنی سہ ماہی رپورٹ پیش کروں، یہ فریضہ میرے سپرد اس لیے ہوا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا۔ اُس کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی نہ منڈوانے کا دستور ہے وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس لیے اس کی اجازت ہونی چاہیے کہ جس کا دل چاہے "داڑھی" رکھے جس کا دل نہ چاہے نہ رکھے۔ اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ تمھارے ہاں ایسی کوئی کھری بات کہہ دیتا تو میری زبان گدّی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعاً عرض ہے۔ یہاں میری کتاب "گنجے فرشتے" کافی پسند کی گئی ہے —— ہو سکے تو میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۲۰ / اپریل ۱۹۵۵ء

محمد طفیل

منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط

میرے اور منٹو مرحوم کے تعلقات کی کہانی اٹھارہ برس پر پھیلی ہوئی ہے اور اس دوران میں منٹو نے اگر مجھے ایک سطر کا بھی خط لکھا ہے تو میں نے اسے محفوظ کر لیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ مجھے منٹو کی شخصیت سے بھی پیار تھا اور اس کے فن سے بھی عقیدت تھی اور ایک ادیب کے خطوط میں اس کی شخصیت اور اس کے فن کی جھلکیاں کچھ اس طرح یکجا ہو کر رہ جاتی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا (مجھے مجتبیٰ نعیم انور نے بتایا ہے کہ جن دنوں میں نے رسالہ "سنگ میل" میں منٹو کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی تھی تو منٹو نے اس چٹھی کو پڑھے بغیر ایک روز میرے ان خطوط کا بنڈل نکالا جو میں نے گذشتہ دس برس میں اسے لکھے تھے انھیں ایک ایک کر کے نذر آتش کر دیا۔)

۱۹۳۷ء میں اختر شیرانی مرحوم کے توسط سے ہمارا تعارف ہوا اور چار برس کی خط و کتابت نے ہمارے درمیان خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جس کے بارے میں منٹو کو ۱۹۴۱ء تک یہ ڈر لگا رہا کہ اگر کہیں ہم دونوں کی ملاقات ہو گئی تو یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ منٹو اس انداز سے کیوں سوچتا ہے۔ شاید میرے خطوط سے اس نے زندگی اور اخلاق سے متعلق میرے نظریات کا اندازہ لگا لیا ہو اور اسے محسوس ہوا ہو کہ ہم ایک ہی راہ پر تو کیا ——— متوازی راہوں پر بھی نہیں چل سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب (۱۹۴۱ء میں) منٹو بمبئی سے دہلی آیا اور مجھے ملتان سے دہلی بلا بھیجا تو مجھے اس کے وہ تمام خطوط یاد آ گئے جس میں اس نے ہماری ملاقات کی خطرناکی کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ میں دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اترا اور "تانگے والے کو اپنی "منزل" کا پتہ بتایا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں سمجھا یہ شخص میری ٹوپی سی گھیرے دار "شلوار اور میرے اس کوٹ کے نظارے سے محظوظ ہو رہا ہے جسے اگرچہ پتلون پر پہننے کے لیے تیار کیا گیا ہے لیکن جسے میں نے شلوار پر لٹکا رکھا ہے۔ ان دنوں میری صحت پہلوانوں جیسی تھی اور کوچوان "مخنچو" قسم کا آدمی تھا اس لیے میں نے سوچا ممکن ہے اس جسمانی تقابل نے اس کے پھیپھڑوں میں ارتعاش پیدا کیا ہو۔ مگر کوچوان کی مسکراہٹ کا راز اس وقت کھلا جب ہم اپنی "منزل" کے قریب پہنچے۔

میں دہلی میں پہلی بار آیا تھا اس لیے کوچوان کے رحم و کرم پر تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کوچوان کوئی غنڈا ہے اور میرے اجنبی اجنبی تیوروں کی شہ پا کر اس بازار میں آ نکلا ہے جہاں ہر طرف ہارمونیم بج رہے ہیں۔ بکھرے بالوں اور لپ اسٹک سے تھپے ہوئے ہونٹوں کی چھاؤں چھا رہی ہے۔ خواتین کھڑکیوں اور دریچوں میں یوں بیٹھی ہیں جیسے نمبردار اپنی چوپال پر اور کبڈی کے کھلاڑی اپنے دوستوں کے کندھوں پر بیٹھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک کھلے چبوتروں کے تھکے ماندے قہقہے اور پان کی پیکیں اور مرجھائے ہوئے پھول بکھر رہے ہیں اور کوچوان کہہ رہا ہے "کیوں میاں؟ کیا آپ دلی میں پہلی بار آئے

ہیں ؟ یہ چاوڑی ہے۔ آپ نے چاوڑی بازار جانے کو کہا تھا نا۔ کہاں اُتریئے گا؟"

منٹو نے مجھے چاوڑی بازار ہی کا پتہ لکھا تھا اور میں حیران تھا کہ کیا پنڈت کرپا رام کو رسالہ "مووینر" کے دفتر کے لیے ساری دلّی میں چاوڑی سے بہتر کوئی جگہ نہیں مل سکی ؟ لیکن اب لوگوں سے اس دفتر کا پتہ پوچھتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ "میاں یہاں رسالوں کے دفتر کہاں، یہاں تو دوسرے دفتر کھلے ہیں۔" تو میں سوائے جھینپ جانے کے اور کیا کر سکوں گا۔ میں نے سوچا کھاری باؤلی میں رسالہ "ساقی" کا دفتر ہے۔ وہیں چلتے ہیں مگر اچانک "مووینر" کا بورڈ نظر آ گیا اور میں تانگے سے اُتر کر اندر چلا گیا۔

میں نے منٹو کو پہچان لیا۔ وہ ریلوے ٹائم ٹیبل میں سے اس گاڑی کا وقت دیکھ رہا تھا جس سے اُتر کر میں چاوڑی میں پہنچ چکا تھا۔ منٹو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ عام جسمانی صحت یونہی سی تھی مگر آنکھوں میں چمک اور رنگت میں سنہراپن تھا۔ شام کو ہم نئی دہلی کے ایک الٹرا ماڈرن سینما ہال کی چوتھی منزل پر بذریعہ لفٹ منتقل کر دیے گئے، جہاں میں نے ایک مرہٹہ ادیب کھانڈیکر کی فلمی کہانی "دھرم پتنی" کے مکالمے اور گیت لکھنا شروع کیے اور منٹو نے ان مکالموں اور گیتوں کو ٹائپ کرنے کا کام سنبھال لیا۔ دن بھر ہم یہ تخلیقی اور "ٹیکنیکی" کام کرتے اور شام کو نیچے بازار میں چلے جاتے، منٹو شراب پیتا اور میں "پوٹیٹو چپس" کھاتا۔ دو تین دن کے بعد اس نے کہا۔ "معاف کرنا احمد ندیم قاسمی، تم میری شراب کے مقابلے میں آلوؤں کی یہ کترنیں کھاتے ہوئے بھلے نہیں لگ رہے۔" اور دوسرے دن اس "تنہائی" کو ختم کرنے کے لیے شاید لطیف کو جو ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے، دہلی بلا لیا اور ہم سینما ہال کی چوتھی منزل پر دس بارہ روز تک مقیم رہے۔

میں اس دوران میں سوچتا رہا کہ آخر منٹو محض میری خاطر اتنی محنت کیوں کر رہا ہے۔ کہانی کھانڈیکر کی ہے۔ مکالموں اور گیتوں کا معاوضہ مجھے ملے گا مگر منٹو کیوں دن بھر بیٹھا درجنوں صفحے ٹائپ کر ڈالتا ہے بلکہ اکثر فلمی ٹیکنیک کے سلسلے میں میری رہنمائی کرتا ہے اور بعض لمبے لمبے سین تو اس نے خود ہی لکھ کر ٹائپ کر ڈالے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے بحیثیت سب انسپکٹر آبکاری صرف ساڑھے بہتر روپے ماہانہ ملتے ہیں مگر میں بھی تو یہ جانتا ہوں کہ منٹو بمبئی کے ہفت روزہ مصوّر کی ادارت کا حق الخدمت صرف پچاس روپے ماہانہ کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ کونسا جذبہ ہے جس نے منٹو کو بمبئی سے دہلی لا کر اسے میری خاطر اندھا دھند مشقت پر مجبور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ اس بے لوث خلوص کا تھا جو منٹو کی اور میری افتادِ طبع میں واحد قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک دوسرے سے پیار اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کے سوا ہم اپنی اپنی زندگی کی بیشتر سرگرمیوں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے۔ طبائع کے اس واضح اختلاف کے باوجود ہمارے دوستانہ تعلقات ہمیشہ قائم رہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے شکایتیں ضرور تھیں اور ان شکایتوں کا علی الاعلان اظہار بھی ہوتا رہا۔ مگر ہم جب بھی ایک دوسرے سے ملے میل دُھل گیا اور ہم آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کے منٹو اور ندیم بن گئے۔

منٹو سے میری دوسری ملاقات اس سے اگلے سال ہوئی۔ وہ بمبئی کو چھوڑ کر مستقل طور سے دہلی آ گیا تھا۔ یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور نکلسن روڈ پرسن بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ان دنوں دہلی ریڈیو اسٹیشن میں

اُردو کے بہت سے ادیب اور شاعر جمع تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت شاید نیوز سیکشن سے متعلق تھے۔ ان کے علاوہ کرشن چندر، میراجی، اوپندر ناتھ اشک اور ن۔ م۔ راشد بھی موجود تھے۔ اُردو شاعری کے نئے رجحانات کے نمائندہ شعرا کو ریڈیو والوں نے مدعو کیا تھا۔ تاثیر مرحوم اس محفل کے صدر تھے اور شرکائے محفل میں فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، راشد، میراجی، مجاز، تصدق حسین خالد، سیماب مرحوم، روش صدیقی اور ساغر نظامی کے ناموں کے علاوہ اپنا نام یاد رہ گیا ہے۔ منٹو کا فن ان دنوں انتہائی عروج پر تھا۔ صحت بھی بُری نہیں تھی۔ طبیعت میں شوخی اور بے باکی تو ہمیشہ سے تھی لیکن ان دنوں اس شخصیت کے یہ پہلو بھی اپنے عروج پر تھے۔ ایک دن اچانک بولا "آؤ یار، ذرا حفیظ صاحب کو چھیڑیں" پھر وہ بھری محفل میں حفیظ صاحب کے پاس گیا اور نہایت ادب سے بولا "شاہنامۂ اسلام کے ایک شعر کے سلسلے میں آپ سے استفادہ کرنا ہے۔ بہت گہرا شعر ہے۔ آپ نے فلسفے کا کوئی نکتہ نظم فرمایا ہے۔ میں نے ہزار ہا سر مارا، پڑھے لکھے دوستوں سے بھی مشورہ لیا مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ آپ کا وہ شعر یہ ہے:

یہ لڑکا جو کہ بیٹھا ہے وہ لڑکی جو کہ بیٹھی ہے

یہ پیغمبر کا بیٹا ہے وہ پیغمبر کی بیٹی ہے

ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی اور حفیظ صاحب بھی مُسکرا کر ٹال گئے۔

پھر ایک دن منٹو نے مولانا چراغ حسن حسرت کو چھیڑنے کا پروگرام بنایا۔ مولانا شاید میراجی کے کمرے میں تھے۔ کرشن، اشک اور میں منٹو کے ہمراہ ان کے پاس پہنچے اور منٹو نے بیٹھتے ہی علامہ اقبال پر برسنا شروع کر دیا۔ بانگِ درا کے پہلے حصے سے آگے کے اقبال کو میں شاعر کے بجائے مولانا سمجھتا ہوں۔ آخر یہ بھی کوئی شاعری ہے کہ فلسفے کے نظریات کو بغیر کسی مقصد کے نظم کرتے جاؤ اور ہر نظریے کے کوٹ کے کالر میں خودی کا پھول سجاتے پھرو۔" پہلے تو مولانا حسرت صاحب نے اقبال کی حمایت میں چند نہایت ٹھوس باتیں کیں مگر انھیں منٹو کے تیوروں سے اس کی نیت کا جلد ہی پتہ چل گیا اور انھوں نے ایسی ادبی شگفتہ چٹکیاں لینا شروع کیں کہ منٹو کی تجویز کے مطابق ہم وہاں سے سچ مچ بھاگ آئے۔

میں چند روز منٹو ہی کے ہاں رُکا۔ منٹو کے گھر میں مجھے سلیقہ، صفائی اور سادگی کا وہ معیار نظر آیا جو بڑے بڑے گھروں میں بھی محض ذوقِ لطیف کی کمی کے باعث غائب ہوتا ہے۔ منٹو کے لکھنے والے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بچھا رہتا۔ فٹ ڈیڑھ فٹ اونچے ڈیسک میں منٹو کے مسودے بند ہوتے۔ اتنی ہی بلند تپائی پر منٹو کا ٹائپ رائٹر رکھا رہتا۔ کتابیں نہایت سلیقے سے ایک لمبے سیلف میں سجی رہتیں اور گورا چٹا منٹو سفید براق لباس پہنے وہاں بیٹھا لکھتا اور ٹائپ کرتا نظر آتا۔ وہ اپنی شراب کی بوتل کو بھی اسی ڈیسک کے نیچے "چھپاتا" تھا۔ اس لیے کہ ان دنوں منٹو کی بڑی بہن اس کے ہاں مقیم تھیں اور منٹو کہتا تھا "میں اپنی بہن سے ڈرتا ہوں اور پھر آج کل کے بچے اتنے تیز ہیں کہ انھیں ہزار ہا سمجھایا جائے کہ اس بوتل میں تیل بھرا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھورے جائیں گے۔ سو ان سے بھی چھپانا پڑتا ہے۔ رہی صفیہ تو جب اُس نے دیکھا ہے کہ میں چھوڑ نہیں سکتا تو اس نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے اور اس پیمانے سے میری سیری نہیں ہوتی۔ سو یہ فراڈ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

منٹو کے مکان کی اس نہایت خوبصورت سادگی سے مجھے ۱۹۴۶ء کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا ہے۔ منٹو میرے پاس آیا۔ ہم

ڈرائینگ روم میں بیٹھے چند منٹ تک باتیں کرتے رہے کہ اچانک اس نے چونک کر کہا "معلوم ہوتا ہے اس کمرے میں تازہ تازہ سفیدی ہوئی ہے۔" میں نے اُسے بتایا کہ سفیدی کو بس ایک ہفتہ ہی گزرا ہو گا۔ وہ بولا "تم شاعر ہو کر ایسی بھونڈی سفیدی کو برداشت کیسے بیٹھے ہو؟" میں نے اُسے اطلاع دی کہ سفیدی خود میں نے کی ہے۔ اس لیے عدم برداشت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر مجھے اپنے گھر لے گیا اور اپنے ڈرائینگ روم میں داخل ہو کر بولا "سفیدی اسے کہتے ہیں!"

تیسری مرتبہ خود منٹو نے مجھے دہلی بلا بھیجا۔ منٹو اور کرشن چندر نے بنجارا کے نام سے ایک فلمی کہانی لکھی تھی اور مجھے اس کے گیت لکھنا تھے۔ مجھے کوئی ایک مہینہ منٹو کے ہاں رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں منٹو نے مجھ سے ریڈیو کے لیے ایک طویل اوپرا اور چند منظوم ڈرامے بھی لکھوائے۔ اُجرت کے معاملے میں ریڈیو کے حکام سے خوب خوب لڑائیاں کیں۔ پھر جب مجھے خاصی معقول رقم دلوا چکا تو مجھے چاندنی چوک میں لے گیا۔ وہاں اُس نے ایک امرتسری دکاندار سے میرے لیے پتلونوں اور کوٹوں کے کپڑے خریدے۔ دو تین دنوں میں میرا یہ لباس تیار ہو گیا اور یوں میں نے زندگی میں پہلی بار پتلون پہنی اور ٹائی لگائی۔

چوتھی ملاقات "بُو" پر مقدمے کے سلسلے میں ہوئی جب منٹو بمبئی میں تھا اور میں ادبِ لطیف لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ پانچویں ملاقات انارکلی بازار میں محض اتفاق سے ہوئی جب میں "سویرا" کے خلاف ایک مقدمے کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا اور منٹو مستقل طور سے لاہور آ گیا تھا۔ چند روز کے بعد وہ پشاور میں میرے پاس پہنچا اور وہاں پندرہ بیس روز مقیم رہا۔ ہمارے نظریاتی اختلاف کی ابتداء وہیں سے ہوئی۔

ہم دن بھر ریڈیو اسٹیشن میں گزارتے، شام کو منٹو کسی نہ کسی شخص کو اپنے ساتھ لے آتا اور پھر شراب کے دور چلتے۔ ادب میں حقیقت اور جنس پر بحثیں ہوتیں۔ منٹو کو ان تمام مقدمات پر عبور حاصل تھا جو دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں مختلف ادیبوں پر عریانی کے الزام میں چلائے گئے۔ وہ ان مصنفین اور ان کی تحریروں کی مثالیں دیتا اور اُس وقت اس کی زبان اتنی تیز ہو جاتی کہ اس پر ایک شعلہ نوا مقرر کا دھوکا ہوتا۔ ایک روز میں نے کہا "ٹالسٹائی نے موپساں کے کسی افسانے کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر موپساں کو اپنی ننگی ہیروئن کو نہاتے ہوتے دکھانا تھا تو کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں تھا کہ وہ نہا رہی تھی۔ یا چلیے یہ بھی کہہ دیجیے کہ وہ نہا چکی تو اس کے جسم پر پانی کے بے شمار قطرے تھمے رہ گئے۔ لیکن موپساں کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ پانی کے ان قطروں کا رنگ ہیروئن کے جسم کی رنگت کی طرح ہلکا سنہری یا ہلکا گلابی تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب میں لذتیت کی ابتدا ہوئی ہے۔" اور یہ سُن کر منٹو بھڑک اُٹھا۔ بولا "تم کیا جانو عورت کے جسم کے راز۔ تم نے تو ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم نے تو شراب تک نہیں چکھی۔ تم تو اُس روز چاوڑی میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے راج ہنسوں کے ہجوم میں کوا گھس آئے۔ تم کیا جانو موپساں نے قطروں کی رنگت کا اظہار کیوں ضروری سمجھا۔ اگر وہ رنگت کا ذکر نہ کرتا تو یہ عورت کیسی چپٹی چپٹی اور سپاٹ لگتی۔ ان گلابی قطروں ہی نے تو اُسے زندگی کی شگفتگی دی ہے۔ تم کسانوں کی کہانیاں لکھ لیتے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ تم کسان عورتوں کی نفسیات کو بھی سمجھ سکو۔ عورت پر لکھتے وقت عورت بن جانا پڑتا ہے۔ اور کبھی تم تخلیق کے لمحوں میں عورت بنے ہو؟ تمہیں کبھی کسی نے چھیڑا ہے؟ کبھی کسی اجنبی نے تمہارے جسم پر ہاتھ رکھا ہے؟ کوئی جھرجھری محسوس کی ہے؟ تمہارے اعصاب بھی اس اجنبی لمس کے

مضراب سے بھی جھنجھنائے ہیں؟ سو میری جان، ٹالسٹائی کبھی کبھی اسی طرح گاندھی پینے پر اُتر آتا تھا مگر کیا تمھارے خیال میں اس نے اپنی اینا کرینینا کے ننگے پاؤں پر لکھتے ہوئے وہ کیفیت محسوس نہیں کی ہوگی جو موپساں نے اپنی ہیروئن کے جسم پر پانی کے گلابی قطرے دیکھنے میں محسوس کی؟ سو احمد ندیم قاسمی۔ بات یہ ہے کہ تم ادب کے وزیر خارجہ ہو اور ہم ادب کے وزیر داخلہ ہیں۔ ہماری اپنی اپنی راہیں اور اپنی منزلیں ہیں۔ نہ ندیم منٹو بن سکتا ہے نہ منٹو ندیم۔ ٹالسٹائی ٹالسٹائی ہے اور موپساں موپساں ہے۔ اور میرے خیال میں میں نے ایک پیگ زیادہ چڑھا لیا ہے، چلو اب سو جائیں؟"

ان دنوں میں نے تہیہ کر لیا کہ منٹو سے اس کے بعض افسانوں کے عریاں ٹکڑوں کی عریانی کی حقیقت تسلیم کرا لوں۔ میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور آخر ایک روز منٹو ایسی تلخ کلامی پر اُتر آیا جس کا میں تصوّر نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ایک روز میں نے اُسے وہیں پشاور میں بہت زیادہ شراب پینے سے روکا تو وہ تنگ آکر بولا۔ "یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے اور تم میرے دوست ضرور ہو مگر میں نے تمھیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا۔"

دوسرے ہی دن اُسے اپنے اس خوبصورت فقرے کی تلخی کا احساس ہو گیا کیونکہ اس کی باتوں اور تیوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے منا رہا ہے۔ پھر یہاں لاہور میں جب ہمارے درمیان مہینوں تک کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک دن میرے ہاں آیا۔ مجھے اپنے گھر لے گیا اور اندھا دھند پی کر ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک کی تمام باتوں کو اتنی تفصیل سے دہراتا رہا کہ میں اس کی بے پناہ یادداشت پر حیران رہ گیا۔ پھر وہ بولا۔ "یہ باتیں نوٹ کر لو میری جان۔ شاید چند دنوں بعد تمھیں یہ مرحوم منٹو کی یاد میں لکھنا پڑیں۔" یہ سن کر میں خلافِ معمول آپے سے باہر ہو گیا اور میں نے یہ سوچے بغیر کہ منٹو نشے میں ہے کہنا شروع کیا۔ "اگر آپ کو میری دوستی اتنی عزیز ہے تو پھر آپ کو شراب چھوڑنی پڑے گی۔ آپ تو پاگلوں کی طرح پیتے ہیں۔ کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ جس گھر میں آپ پی رہے ہیں اس میں نگہت بیٹی بھی رہتی ہے۔ یہ وہی بچّی ہے جس کی ایک نہایت پیاری تصویر آپ نے بمبئی سے مجھے بھیجی تھی اور جو میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ آپ تو ادب کے وزیر داخلہ ہیں لیکن کیا آپ نگہت کے اس داخلی ردّعمل کو ابھی سے محسوس نہیں کر سکتے جو چند برس کے بعد آپ کو اس کیفیت میں دیکھ کر اُس کے ذہن پر وارد ہوگا؟ اور اگر آپ کو اس بات کا احساس نہیں تو آپ اپنے آپ کو ادب کا وزیر بے قلمدان کہا کیجیے کیونکہ جو ادیب صرف اپنے اندر بند رہتا ہے ———" اور منٹو نے کہا۔ "اس فراڈ کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔" اور اس کے بارے اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کی ذات کے معمولات میں دخل دینے کا مجھے کوئی دُور دراز کا بھی حق حاصل نہیں۔ میں خفا ہوئے بغیر چلا آیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کل ہوش میں آکر ان باتوں پر پچھتائے گا۔ مگر وہ نہیں پچھتایا بلکہ چند روز بعد سرِراہے ملاقات ہوئی اور میں نے شکایت کی تو معلوم ہوا کہ اس روز جو کچھ اس نے کہا تھا وہ حرفِ آخر تھا۔ اور وہ نشے کی نہیں، ہوش کی باتیں تھیں۔

تب میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس دوران میں گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ نہ منٹو کو اپنی انتہا پسندیوں میں میری رفاقت گوارا ہے اور نہ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ ختم ہوتے

دیکھوں اور کچھ نہ بولوں۔ میں نے بول کر دیکھ لیا تھا۔

مگر اب مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے بزدلی دکھائی تھی۔ میں اس کا پہرہ دار بن کر کیوں نہ بیٹھ گیا۔ میں اس کی جھڑکیاں اور گالیاں تک سہتا مگر اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرتا۔ اسی مہم میں اس کے گھرانے کے افراد اور اس کے چند نیک نفس دوست میرا ساتھ دیتے۔ اور ہم سب مل کر قوم کی اس متاع کو اتنی جلد نابود ہونے سے بچا لیتے اور منٹو نے ایک بار مجھے یہ بھی تو لکھا تھا کہ مجھے آپ کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔" سو اب دو ماتم میرے سپرد ہوئے ہیں۔ ایک منٹو کا اور دوسرا اپنی عزتِ نفس کے تحفظ کے ڈھونگ کا۔

آج میں منٹو کے چند خطوط ایک عظیم فن کار کی ایک نہایت پیاری یادگار کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ منٹو کے کوئی ایک سو خط میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۸ء تک کے منٹو کی نہایت سچی جھلکیاں جمع ہیں۔ میں انھیں کتابی صورت میں بھی چھاپنے کا ارادہ رکھتا ہوں (اور ان کے حقوق منٹو ہی کے نام محفوظ ہوں گے) مگر یہ سب خود فریبیاں اور جی بہلاوے ہیں۔ کیونکہ یہ ٹیس کسی وقت بھی میرے ضمیر سے نہیں نکل سکتی کہ میں نے اور میرے جیسے کتنے کم ہمت اور "شکست خوردہ خیر خواہوں" نے منٹو کو زندگی کے ویرانے میں یوں اکیلا چھوڑ دیا تھا کہ ؎

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(۲)

معرفت ہفت روزہ 'سماج'
۳ پیر خاں اسٹریٹ بمبئی ۸
۱۰ مئی ۳۷ء

برادرِ مکرم،

وعلیکم السلام۔ آپ کا نوازش نامہ ملا۔ اس سے قبل میں آپ کی خدمت میں ایک خط روانہ کر چکا ہوں، امید ہے وصول فرما لیا ہوگا۔ ناسک سے واپسی پر میں مصور سے علیحدہ ہو گیا تھا اور یہ بات کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کے متعلق میں کچھ کہوں یا سنوں۔ بالک مصور سے میرے تعلقات دوستانہ ہیں۔ علیحدہ ہونے پر بھی میں اُن کے قریب ہوں ——— یہ میری عقیدت ہے۔

آپ کی اسٹوری میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ "فلمی" نہیں۔ وہ فلمی کس طرح نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لیے کئی صفحات درکار ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ صفحات لکھ کر بھی میں آپ کو اپنا مدعا بطریقِ احسن نہ سمجھا سکوں گا۔ شاید میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ فلمی افسانہ نگاری کو سمجھنے کے لیے اسٹوڈیو بہترین اُستاد ہے۔ آپ پردے پر فلموں کو بغور دیکھ کر بھی کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں مگر پھر بھی سینما ہال میں چند ضروری نقطوں پر روشنی ڈالنے والا موجود ہونا چاہیے۔

آپ اچھے افسانے لکھ سکتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے آپ کے "بے گناہ" سے ہو گیا تھا۔ مجھے بہت کم افسانے یاد رہتے ہیں مگر آپ کا بے گناہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ چند معمولی خامیوں کے باوصف آپ کا بہترین افسانہ تھا۔

گو میں خود حوصلہ ہارتا رہتا ہوں مگر میری استدعا ہے کہ آپ ہرگز حوصلہ نہ ہاریں۔

مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں، اس لیے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں اور اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ انہی کمزوریوں کے باعث مجھے کئی صدمے اُٹھانے پڑے ہیں۔ میں اسی تلخ حقیقت کے پیشِ نظر شاید آپ سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آپ میرے متعلق کوئی رائے مرتب نہ کریں۔

میں بمبئی میں پچاس روپیہ ماہوار کما رہا ہوں اور بے حد فضول خرچ ہوں۔ اگر آپ یہاں چلے آئیں تو میرا خیال ہے کہ ہم دونوں گزر سکیں گے۔ میں اپنی فضول خرچیاں بند کر سکتا ہوں۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا کامل احساس ہے، اس لیے کہ میں ان مجبوریوں سے خود گزر چکا ہوں۔ میں آپ کو کرایہ روانہ کر دیتا اور روانہ کر سکتا تھا، اس لیے کہ ابھی آٹھ روز ہوئے میرے پاس پانچ سو روپے تھے اور اب یہ حالت ہے کہ صرف بیس روپے باقی ہیں۔ مجھے کتابیں خریدنے اور یونہی روپیہ برباد کرنے کا خبط ہے اور میں اس سے لطف اُٹھاتا ہوں۔ خیر! زندگی رہے تو روپیہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ آپ یہاں تشریف لا سکتے ہیں مگر یہ بات

یاد رکھیے کہ آپ میری زندگی کی دھوپ چھاؤں میں رہنا ہو گا۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ہم دونوں رہ سکتے ہیں کھانے کو ملے نہ ملے مگر آپ کو کتابیں پڑھنے کے لیے مل جایا کریں گی اور اگر آپ کوشش کریں گے تو بہت ممکن ہے کہ اچھی اچھی کتابوں کے ساتھ اچھے اچھے کھانے بھی مل جائیں۔ اگر میرا یا آپ کا لکھا ہوا افسانہ کوئی فلم کمپنی خرید لے تو دو تین مہینے عیش میں گزر سکتے ہیں۔ کہیے کیا ارادہ ہے ؟

"سماج" میرا پرچہ نہیں۔ یہ پرچہ دراصل میرے ایک عزیز دوست یہاں سے نکال رہے۔ پہلی جلد شائع ہو گئی ہے، آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔

آپ کی نظم میں نے "ہمایوں" میں پڑھی ہے۔ افسوس ہے کہ نہ مجھے شعر پڑھنا آتے ہیں اور نہ میں اُن کو (APPRECIATE) کر سکتا ہوں۔ چونکہ آپ نے لکھی ہے اس لیے یقیناً اچھی ہو گی۔ "شغل" کے متعلق رائے عالیہ کا شکریہ۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایڈلفی چیمبرز

کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸

نومبر ۳۸ء

برادر مکرم۔

وعلیکم السلام۔ آپ کا لفافہ ملا۔ گیتوں اور تصویر کا شکریہ۔ آپ کو ناحق اتنی زحمت اُٹھانا پڑی۔

"موم بتی کے آنسو" آپ نے پسند کیا —— شکریہ۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ اسے پسند کریں گے۔ میں نے اس کو لکھتے وقت انتہائی کوشش کی تھی کہ کوئی لفظ بھی غیر ضروری نہ ہو اور جیسا کہ آپ نے اپنی رائے میں لکھا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں۔

ہمارے "ادبی رسائل" صحیح ادب کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا۔

پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اب ایسی داستانیں فضول ہیں کیوں نہ ایسی عورت کا دل کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کے آغوش سے نکل کر کسی دوسرے مرد کی بغل گرما رہی ہو اور اُس کا پتی کمرے میں بیٹھا سب کچھ ایسے دیکھ رہا ہو گویا کچھ ہو ہی نہیں رہا۔

زندگی کو اُس شکل میں پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ وہ جیسی تھی، یا جیسے ہو گی اور یا جیسے ہونی چاہیے۔

"دیوالی نمبر" میں کیا آپ نے "دیوالی کے دیئے" پڑھا۔ اُس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

آپ کے گیت خوب ہیں خاص کر جوگی سوگی والا۔ اس میں ایک مصرع ہے ؎ تو کیا جانے کس کی خاطر — اگر "کس کی خاطر" کے بجائے "کس کے کارن" ہو جائے تو میرا خیال ہے کہ آپ کے گیت میں "خاطر" کا تیز سُر نکل جائے گا۔

مجھے آپ کے افسانے کا انتظار رہے گا۔

میری صحت اب قدرے اچھی ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

میں نے فلم کے لیے ایک افسانہ "کیچڑ" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ آدھا افسانہ لکھ کر رُک گیا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے مطالعہ کے لیے بھیج دوں، شاید آپ کوئی رائے دے سکیں۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایڈیلفی چیمبرز
کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸
۳۰۔ جنوری ۳۹ء

برادرِ مکرم

وعلیکم السلام۔ جس روز آپ کا خط ملا، میرا موڈ بہت اچھا تھا۔ آپ کے تعریفی الفاظ سے مجھے ذرا وہ ہو گیا —— میں لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ میں اپنی تعریف سے خوش نہیں ہوتا لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ نے میرے افسانوں کی تعریف کی تو واللہ میں مخمور سا ہو گیا —— مگر کسی سے کہیئے گا نہیں کہ مجھ میں یہ کمزوری ہے۔

کل رات سے میرا موڈ ٹھیک نہیں۔ طبیعت پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا ہوں۔ ایک عجیب و غریب تکان سی طاری ہے۔ میں اس اضمحلال کا سبب جانتا ہوں مگر اس سبب کے پیچھے اتنی چیزیں کارفرما ہیں کہ میں فرداً فرداً ان پر غور نہیں کر سکتا اور اجتماعی صورت میں یہ ایک دُھند سی معلوم ہوتی ہیں۔ میں دراصل آج کل اُس جگہ پہنچا ہوا ہوں جہاں یقین اور انکار میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ جہاں آپ سمجھتے بھی ہیں اور نہیں بھی سمجھتے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دُنیا کی ساری کی ساری مٹی میں چلی آئی ہے اور بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم ہاتھی کے جسم پر چیونٹی کی مانند رینگ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا (COMPLEX) ہے جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اس سے رُوح اور دماغ کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے پاس ایک ایسا سوچ بورڈ آ جائے جس سے میں حسبِ خواہش روشنیاں پیدا کر سکوں۔ جس وقت چاہوں گھُپ اندھیرا کر دوں اور جس وقت چاہوں روشنی کا سیلاب بہا دوں۔ کیا ایسی چیز مل جائے گی؟ —— کچھ کہا نہیں جا سکتا!

کچھ بھی مجھے اطمینان نصیب نہیں ہے۔ میں کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہر شے میں مجھے ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے
میں خود اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے کبھی تسکین نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ ہوں، جو کچھ میرے
اندر ہے، وہ نہیں ہونا چاہیے اُس کے بجائے کچھ اور ہی ہونا چاہیے۔

عشق و محبت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہوانیت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہوت سے الگ کرکے میں دیکھتا
ہوں کہ وہ پتھر کی ایک مورتی رہ جاتی ہے۔ مگر یہ ٹھیک بات نہیں، میں جانتا ہوں، نہیں میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر آخر کیا ہے؟
—— کیا ہونا چاہیے؟ —— اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہوگا؟

لیکن میں عورتوں کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوا ہے۔ عورت
کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہو سکتا —— کس قدر افسوسناک چیز ہے کہ عورتوں کے ہمسائے
ہو کر بھی ہم اُن کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ لعنت ہے ایسے ملک پر جو عورتوں کو ہم سے ملنے کے لیے رد کرے!
...... مگر ...... مگر کیا؟ —— کچھ بھی نہیں! —— سب بکواس ہے۔

آپ کے عزیز کی ناگہانی موت سے بہت صدمہ ہوا۔ خدا آپ کو صبر عطا فرمائے۔

آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اگر ہو سکے تو اس خط کا جواب جلد لکھ دیجیے گا۔

"(MUD)" میں نے لکھ لیا ہے۔ مگر مکالمہ لکھنا باقی ہے جو دیر میں لکھا جائے گا۔ آج کل میں اپنے افسانوں کی ترتیب میں
مشغول ہوں۔ کتابت شروع ہے۔

فیض صاحب آپ کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ وہ آپ کی نظمیں بہت پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خاص
طور پر اُس کا ڈیزائن بناتے ہیں۔ تازہ پرچے میں آپ نے آپ کی نظم کو بہت خوبی سے (ILLUSTRATE) کیا ہے۔

ادب لطیف میں آپ کا منظوم مکالمہ پڑھا۔ بہت خوب ہے۔ آئندہ پرچے میں اس پر ریویو شائع ہو رہا ہے۔

یہ راجندر سنگھ صاحب بیدی کون ہیں؟ —— یہ بھی مٹی کے ڈھیلے معلوم ہوتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے
آپ غور سے پڑھا کریں۔ ادب لطیف کو آپ اور بیدی صاحب پر نازاں ہونا چاہیے۔

دفتر میں کمال اتاترک نمبر کی ایک کاپی بھی نہیں بچی۔ بہر حال آپ کے لیے بڑی مشکل سے ایک پرچہ حاصل کیا گیا ہے
جو کل بھیج دیا جائے گا۔ دفتری کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ آپ کے پرچے کا پیکنگ احتیاط سے کیا کرے۔

نذیر صاحب اور خلش آپ کو آداب عرض کرتے ہیں۔ یہاں ہم سب لوگ آپ کی باتیں کیا کرتے ہیں۔

افسانہ ضرور بھیجیے گا۔

"ہمایوں" کے تازہ پرچے میں (فروری) میں میرا "منتر" پڑھ کر اپنی رائے سے آگاہ فرمائیے گا۔

میں بخیریت ہوں۔ امید ہے کہ آپ بھی بصحت ہوں گے۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۰۔ ایڈلفی چیمبرز
کلیئر روڈ بمبئی ۸
۱۲ فروری ۳۹ء

برادرِ عزیز

محبت نامہ ملا۔ غزلوں کا شکریہ —— میں اس کے آگے اسی قسم کے چند اور رسمی الفاظ لکھنے والا تھا کہ آپ کے خط کی درج ذیل سطر پر نظر پڑی۔

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کیوں نہ اپنی زندگی کو بدپرہیزیوں کی نذر کر دوں" —— میں اپنی زندگی کا ¾ حصہ بدپرہیزیوں کی نذر کر چکا ہوں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے پرہیز نہیں کیا۔ اب تو یہ وقت آگیا ہے کہ پرہیز لفظ ہی میری ڈکشنری سے غائب ہو گیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی اگر پرہیز میں گزاری جائے تو بھی قید ہے، اگر بدپرہیزیوں میں گزاری جائے تو بھی قید۔ کسی نہ کسی طرح ہمیں اس اُونی جراب کے دھاگے کا ایک سرا پکڑ کر اُسے اُدھیڑتے جانا ہے اور میں اپنا کام آدھے سے زیادہ کر چکا ہوں۔ باقی آہستہ آہستہ کروں گا۔ اس لیے میں بہت جلد مرنا نہیں چاہتا۔ جس روز مجھے معلوم ہو گیا کہ میں کیا ہوں تو موت کو بلانے میں کوئی پس و پیش نہ کروں گا۔

میری زندگی ایک دیوار ہے جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں پراگندہ کر دوں، کبھی یہ جی میں آتا ہے کہ اس ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دوں۔ اسی ادھیڑ بُن میں لگا رہتا ہوں۔ دماغ ہر وقت کام کرنے کے باعث تپتا رہتا ہے، میرا نارمل درجۂ حرارت ایک ڈگری زیادہ ہے جس سے آپ میری اندرونی تپش کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر نقاہت، —— وہ مستقل تھکاوٹ جو میرے اُوپر طاری رہتی ہے کچھ کرنے نہیں دیتی۔ اگر مجھے تھوڑا سا سکون بھی حاصل ہو تو میں وہ بکھرے ہوئے خیالات جمع کر سکتا ہوں جو برسات کے پتنگوں کے مانند اُڑتے رہتے ہیں مگر...... اگر اگر...... کرتے ہی کسی روز مر جاؤں گا اور آپ بھی یہ کہہ کر خاموش ہو جائیں گے "منٹو مر گیا!...... منٹو تو مر گیا صحیح ہے ...... مگر افسوس اس بات کا ہے کہ منٹو کے وہ خیالات بھی مر جائیں گے جو اُس کے دماغ میں محفوظ ہیں۔

اگر کوئی صاحب میرے ساتھ وعدہ کریں کہ وہ میرے دماغ میں سے سارے خیالات نکال کر ایک بوتل میں ڈال دیں گے تو منٹو آج مرنے کو تیار ہے۔ منٹو، منٹو کے لیے زندہ نہیں ہے ...... مگر اس سے کسی کو کیا؟ —— منٹو ہے کیا بلا؟ —— چھوڑیئے اس فضول قصّے کو —— آئیے کوئی اور بات کریں۔

کرشن چندر صاحب خوب لکھتے ہیں۔ ہمایوں، ادبی دُنیا وغیرہ میں اُن کے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

آپ کا افسانہ پڑھا۔ بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ آپ کا یہ فقرہ مجھے بہت پسند آیا۔

اُس کے دل سے آواز آئی اور اُسے شبہ ہونے لگا کہ شاید انسپکٹر نے بھی یہ آواز سُن لی ہے۔"

آپکے اس افسانے میں مجھے "چیخوف" کا رنگ نظر آیا۔ تازہ پرچے میں چھپ جائے گا۔ آپ اسی طرح کبھی کبھی اپنا افسانہ بھیج دیا کریں۔

آپ نے "منتر" پسند کیا۔ شکریہ!

رفیق صاحب آپ کی ایک غزل اس مہینے ریڈیو پر گا رہے ہیں۔ "انڈین لسنر" میں آپ کا نام دیکھا تھا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خلش صاحب اور نذیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایڈلفی چیمبرز

کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸

۲۶ر جون ۳۹ء

پیارے ندیم

تمھارے دونوں خط ملے۔ سوچ رہا ہوں کہ تم میں اتنا اخلاص کیوں ہے ——— میں ڈرتا ہوں۔ اندھیرے میں رہنے والا زیادہ تیز روشنی کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا۔ تمھارا ہر خط مجھے ڈرا دیتا ہے۔ کیا کروں، عمر بڑھنے کے ساتھ مجھ میں بچپن آتا جاتا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب میں گھٹنوں کے بل چلوں گا اور تتلا تتلا کے باتیں کروں گا۔ لوگ پھیلتے ہیں، میں سکڑ رہا ہوں۔ زندگی کے جن ادوار سے میں گذر رہا ہوں اُس پر نظر کرنے کی میرے پاس فرصت نہیں۔ کئی اسٹیشن آتے ہیں جن پر میری زندگی کی گاڑی ٹھہرتی ہے۔ مگر میں تھکاوٹ سے چُور سفر کے آغاز ہی سے "تنگ آیا ہوا" وہ بورڈ ہی پڑھ سکتا جس سے مجھے اسٹیشن کا نام معلوم ہو جائے۔ عجب حالت ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور سمجھ میں آئے بھی کیسے جب کہ سمجھنے کی فرصت ہی نہیں۔

کرشن چندر کہتے ہیں اُن کے لیے نیا افسانہ لکھوں ——— جی چاہتا ہے اُن کو اپنا تازہ فوٹو کھچوا کر بھیج دوں۔ آنکھوں والے اسے دیکھ کر کئی نئے افسانے پڑھ لیں گے۔

تم نے بہت تاکید کی ہے کہ میں "نئے زاویے" کے لیے کچھ غیر مطبوعہ افسانہ لکھوں۔ مجھ سے پوچھو تو یہ افسانہ نگاری بالکل بکواس ہے جس کے عوض صرف شکریہ ملے ——— میرا ڈاکٹر جو ہر روز مجھے دوا بھیجتا ہے شکریے کے علاوہ روپے بھی مانگتا ہے۔ کل اُس نے ایک روپیہ واپس بھیج دیا تھا اس لیے کہ اُس میں کھنکھناہٹ کم تھی۔ خیال تھا کہ کل افسانہ شروع کروں گا مگر اس کم کھنکھناہٹ والے روپے کو ہتھیلی پر رکھا تو میری سب کھنکھناہٹ غائب ہو گئی ———

بہر حال افسانہ لکھ دوں گا اس لیے کہ تمھاری سفارش ہے اور کرشن چندر سے بھی مجھے پیار ہے۔ کرشن چندر صاحب کو اتنا ضرور لکھ دو کہ میری ماں مر گئی ہے اُس کا ماتم کرنے کے لیے مجھے جو فرصت مل سکتی ہے وہ میں اُن کے حوالے کر دوں گا۔

مکتبہ اُردو والوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دس جون کو ۱۵۰ روپے میں سے پہلی قسط پچاس روپے کی بھیج دیں گے مگر اب تک

منتظر ہوں ——— مجھے اس تانبہ ملی ہوئی چاندی کی آمد کا شدید انتظار ہے۔ دیکھیے وہ مجھ پر کب کرم کرتے ہیں۔

"قاضی جی کا فیصلہ" لکھنؤ بھیجا تھا مگر واپس آگیا۔ اب دہلی بھیجا ہے، دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔ حیدرآباد والوں نے تو ابھی تک رسید سے مطلع نہیں کیا۔ "پنگھٹ پر" جولائی میں بُک ہوگیا ہے۔ قاضی جی کا فیصلہ اگست میں ہوگا۔ (یہ دونوں بمبے سے براڈکاسٹ ہوں گے۔)

طبیعت بہت اُداس رہتی ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ کروں ——— یہ "کچھ" کیا ہے؟ ——— سوچ رہا ہوں۔
اس وقت کرپارام صاحب کے گھر میں بیٹھا ہوں۔ بارش ہو رہی۔ پنڈت جی سلام لکھواتے ہیں۔ وہ علیحدہ خط بھی لکھیں گے۔
صفیہ بصحت ہے۔ آداب عرض کرتی ہے۔ اس وقت سامنے بیٹھی بچے کے لیے دُودھ بنا رہی ہے۔
میں بہت دُکھی ہوں۔

(۱) "پنگھٹ پر" ۲۳ جولائی کو بمبے سے براڈکاسٹ ہوگا۔ اس کا حق الخدمت بیس روپے ملے گا۔ خواجہ ظہیر الدین کے نام سے نشر ہوگا۔

(۲) مکتبہ اُردو والوں نے آج ۵۰ روپے منی آرڈر کے ذریعے بھیج دیے ہیں۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

دہلی
۲۱ جولائی ۱۹۴۱ء

برادرِ عزیز

السلام علیکم۔ آپ کا محبت نامہ مل گیا تھا۔ افسوس کہ اس دوران میں میری طبیعت ناساز رہی۔ پرسوں سے پھر شدت کا درد ہو رہا ہے۔ مالی حالت اس قدر خراب ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہاں کے سول سرجن کے زیرِ علاج ہوں۔ وہ کہتا ہے ہسپتال میں داخل ہو جاؤ۔ مگر اِدھر چھٹیاں ملتی ہیں تو تنخواہ نہیں ملتی۔ عجب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ایک صرف کرشن کی ہمدردی مجھے یہاں میسّر ہے مگر اکیلی ہمدردی کیا کر سکتی ہے۔

آپ کا خط ملتے ہی میں نے بمبے لکھ دیا تھا۔ وہاں سے آج جواب آیا ہے۔ انھوں نے پندرہ روپے بھیجے ہیں، باقی پندرہ وہ اگلے مہینے بھیجیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہاں بھی مشکلات پیدا ہو گئی ہوں گی۔ سوچتا ہوں یہ پندرہ میں خرچ کروں اور آپ کو کچھ نہ بھیجوں اگلے مہینے جب پندرہ آئیں تو اکٹھے تیس روانہ کر دوں گا۔ کیا خیال ہے آپ کا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکا۔ میں خوفناک طور پر مفلس ہو رہا ہوں۔ اس کا عملی ثبوت میں نے آپ کو دے دیا ہے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے "ڈرپوک" پسند کیا۔ میں علالت کے باعث آپ کا کوئی تازہ افسانہ نہیں پڑھ سکا۔

عقیلہ بمبے گئی ہوئی تھی، اب واپس آگئی ہے۔ آپ کو سلام لکھواتی ہے۔

خط لکھتے رہا کریں۔ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔
جواب آل انڈیا ریڈیو کے پتے سے دیجیے گا۔ یہاں خط مجھے آسانی سے مل جاتے ہیں۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایڈلفی چیمبرز
کلیر روڈ۔ بمبئی ۸
۲۱۔ فروری ۴۳ء

پیارے ندیم

مجھے معاف کر دینا بھائی۔ میں سخت شرمندہ تھا اسی لیے خط نہ لکھ سکا۔ تمہارے گیت منگوائے، مگر یہاں وہ صاحب ہی غائب ہو گئے جو لینا چاہتے تھے۔ ناچار مصور میں چھاپنا پڑا۔ میری تقصیر معاف کر دینا۔ میں بہت شرمندہ ہوں بخدا۔

یہاں ہر روز تمہاری باتیں ہوتی ہیں۔ صفیہ کہتی ہے کہ ندیم بھائی کو یہاں اپنے پاس بلا لو۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ شاہد لطیف اور عصمت بھی یہی چاہتی ہیں۔ میں نے تمہیں خط بلکہ تار بھیج دیا ہوتا مگر ادھر اس کم بخت گاندھی نے روزہ رکھ لیا اور یہ بات کھٹائی میں پڑ گئی۔

ہاں، تم یہ لکھو کہ لاہور میں تمہارے گذارے کی کیا صورت ہے۔ مجھے تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے۔ جب ہم تم دونوں ایک جگہ رہ سکیں۔

ہاں بھئی، وہ تم نے ماہنامہ مصور کے لیے جو مضمون شروع کیا تھا بھیجا ہی نہیں۔ میلا نمبر شائع ہونے میں اب بس کچھ دیر نہیں۔ خدا کے واسطے اپنا مضمون جو کہ شاید گیتوں پر تھا، اپنی چند تازہ غزلوں یا نظموں کے ہمراہ فوراً بھیج دو اور مجھے ممنون کرو۔ تمہارے مضمون اور تمہاری غزل کے بغیر پرچہ شائع نہیں ہوگا۔ اس نمبر میں تم اپنے تمام دوستوں کو پاؤ گے۔

نذیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔
مضمون اور غزلیں جلد بھیجو۔
صفیہ سلام لکھواتی ہے۔

تمہارا بھائی
سعادت

۱۷۔ ایڈلفی چیمبرز
کلیر روڈ۔ بمبئی ۸
۱۰ مئی ۴۳ء

ندیم بھیّا

آپ کا محبت نامہ ملا۔ مجھے آپ کے خلوص پر نہ پہلے کبھی شک تھا اور نہ اب ہے۔ اگر میرے دل میں ذرا برابر میل بھی آپ کی طرف سے موجود ہوتا مجھ سے پہلے آپ کو شاید اس کا علم ہو جاتا۔ میرے دل کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور نہ میں کسی بات کو چھپانا چاہتا ہوں۔

چند روز ہوئے جبکہ صفیہ بستر علالت پر پڑی تھی، دیوندر ستیارتھی کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے اُس کو گالیاں دیں۔ میرے دل میں اُس کے متعلق جو خیالات بھی تھے اُن کا اظہار کر دیا اور اُس سے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔ اُس نے اس کے بعد کمال ڈھٹائی سے دو تین مرتبہ پھر فون کیا لیکن میں نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا بلکہ اُس کی اس ڈھٹائی نے مجھے اور متنفر کر دیا۔ اگر وہ جواب میں مجھے گالیاں دیتا اور اُس حملے کا جواب دیتا جو میں نے اُس پر کیا تھا تو بہت ممکن ہے میں خود اس کے پاس جا کر اپنے یہاں مہمان ٹھہرا لیتا۔ صفیہ نے فون پر میری تمام باتیں سُنیں، مجھے بھلا بُرا کہا، لیکن میں نے اُس سے کہا کہ میں دل میں نفرت رکھتے ہوئے زبان پر پیار محبت کے الفاظ نہیں لا سکتا۔

یہ واقعہ میں نے اس لیے بیان کیا کہ اگر مجھے آپ سے کوئی شکایت ہوتی تو میں نے بے کھٹکے اس کا اظہار کر دیا ہوتا۔

بات یہ ہے کہ اب میری دماغی حالت میں بہت بڑا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ سینکڑوں چیزیں بیک وقت سوچنے سے میں افراتفری کے عالم میں رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں مَیں کوئی قابلِ قدر چیز نہیں لکھ سکا۔

بہت زیادہ شراب پینے لگا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ کچھ لکھوں پی کر میں لکھ ہی نہیں سکتا۔ دراصل میں اپنے اندر وہ بات ڈھونڈ رہا ہوں جو مجھے کرنا ہے۔ اگر مجھے یہی کچھ کرنا ہے جو میں اب تک کر چکا ہوں تو یہ کچھ بھی نہیں یعنی کوئی بڑا کارنامہ نہیں سا گر مجھے ایسے ہی افسانے لکھنا ہیں تو پھر ایک خاص لائحہ عمل مرتب کروں گا اور اُس کے مطابق کام کروں گا۔ زیادہ مغز زدگی کی کیا ضرورت ہے۔

مگر چھوڑیئے اس قصّے کو۔

آپ گانے جلد از جلد بھیجیے۔ میں نے آپکے لیے ہمیشہ کوشش کی ہے اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ مصیبت یہ ہے کہ میری کوششوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز حائل ہوتی رہی ہے۔ خدا کرے کہ اب نہ ہو۔

کہانی کے چند مناظر اور بھیج رہا ہوں۔ اس میں ٹائپ کی بے شمار غلطیاں ہیں مگر آپ فوراً سمجھ لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں ایک گیت کی ضرورت ہے۔ وہ آپ لکھ دیں۔

یہ گیت بھی خاص طور پر اچھا ہونا چاہیے۔ آپ منظر کو ایک دو بار پڑھیں اور غور کریں تو آپ مطلب کی چیز لکھ

سکیں گے۔ سوال وجواب جذباتی قسم کے ہیں (SITUATION) کے ساتھ چسپاں ہوجائیں۔ یاد رکھیے کرچھپا ایک لُولی لنگڑی عورت ہے اُس کو سہارے کی ضرورت ہے لیکن یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ ممکن ہے یہ سہارا جواب نہ دے جائے اور وہ زیادہ گہرائیوں میں غرق ہوجائے۔ محبت میں ٹھوکر کھا کر جسم کے ساتھ اس کی روح بھی مفلوج ہوجائے ——— دوسری طرف شنکر کو یقین دلانا چاہیے کہ وہ ایماندار آدمی ہے۔ یہ مضمون آسان اور جذباتی لفظوں میں اگر آپ نے باندھ دیا تو سمجھ لیجیے کہ آپ فلمی گیت لکھنے کا گُر پا گئے۔

صفیہ آپ کے خلوص کی بہت شکر گزار ہے۔ اب اُس کی طبیعت اچھی ہے۔ سلام عرض کرتی ہے۔

جونہی مصوّر کا ماہ نامہ چھپا میں آپ کو نئے پتے سے بھیج دوں گا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

کرشن چندر مستعفی ہو کر یہاں بمبئے آیا تھا دو روزہ کر پُونہ چلا گیا جہاں وہ ایک فلم کمپنی میں ملازم ہوگیا ہے۔

آپ کا رجسٹرڈ لفافہ مل گیا ہے۔ گیتوں اور کہانی کے متعلق پھر لکھوں گا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایڈلفی چیمبرز

کلیر روڈ، بمبئی ۸

ستمبر ۱۹۴۲ء

پیارے ندیم

تم اپنے دل میں خدا جانے کیا سمجھتے ہوگے کہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ عرصے سے بہت ہی سُست ہوگیا ہوں۔ کئی بار دل چاہا ہے کہ تمھیں خط لکھوں، بہت ہی مفصل خط لکھوں مگر لکھنے سے طبیعت اچاٹ سی ہوگئی ہے۔ جانے کیوں؟

تمھارے اخلاص پر مجھے ناز ہے میری جان۔ خدا کے لیے دل میں کبھی اس خیال کو جگہ نہ دینا کہ میں تمھیں بھول گیا ہوں۔

تمھاری یاد سے میرا دل ہمیشہ لبریز رہتا ہے۔ اور میں ہمیشہ ایسے موقعے کی تاک میں رہتا ہوں کہ ہم تم اکٹھے رہ سکیں۔

تمھاری علالت بہت افسوسناک ہے مگر یہ اور بھی زیادہ افسوسناک بات ہے کہ میں اب کسی کی علالت کے دُکھ کو محسوس نہیں کرسکتا۔ شاید اس لیے کہ میں خود جسمانی اور روحانی طور پر علیل رہتا ہوں۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے۔

میں اس کوشش میں ہوں کہ تمھیں یہاں بُلا لوں۔ دُعا کرو کہ میں اس کوشش میں کامیاب ہوجاؤں۔

شاہد لطیف نے تمھاری علالت کا سُنا تو اُسے بہت دُکھ ہوا۔ وہ تمھیں سلام لکھواتا ہے اور تمھاری صحت کے لیے دُعا کرتا ہے۔

صفیہ پچھلے دنوں بہت بیمار رہی ہے مگر اب خدا کے فضل سے بصحت ہے، تمھیں سلام عرض کرتی ہے۔

میں آجکل فلمستان میں نوکر ہوں جہاں شاہد لطیف ملازم ہے۔ صبح ساڑھے دس بجے جاتا ہوں اور رات گیارہ بارہ بجے لوٹتا ہوں۔ عجب زندگی ہے۔

"پھول اخبار" میں تم کیا کرتے ہو۔ اُسے چھوڑو اور یہاں چلے آؤ۔ مجھے اُمید ہے کہ تم یہاں لاہور سے زیادہ کما سکتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم نے آج تک میری نہیں مانی۔

میری صحت اچھی تو نہیں لیکن ٹھیک ہے، یعنی سینے کا درد اب کچھ عرصے سے نہیں ہو رہا۔

امید ہے کہ تم اب بخیریت ہوگے۔ اپنی صحت سے فوراً مطلع کرو۔

ہمیشہ تمہارا

سعادت حسن منٹو

فلمستان لمیٹڈ۔ بمبئی

اکتوبر ۱۹۴۵ء

پیارے ندیم

میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ تو مجھ سے اتنی محبت کریں اور میں آپ کے خطوں کا جواب بھی نہ دے سکوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا عذر پیش کروں۔ سوائے اس کے کہ میں بے حد سست اور کاہل ہو گیا ہوں۔

جس روز آپ کے دوست چھٹی لے کر میرے پاس آئے میں اپنے مقدمے کی پریشانیوں میں غرق تھا۔ یہ کمبخت ہیرالال نہایت ہی واہیات انسان ہے۔ اُس نے مقدمے میں ذرہ برابر دلچسپی نہیں لی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ صفائی کا کوئی گواہ پیش نہیں ہوا اور فیصلے کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ ۲۲ اکتوبر کو حاضرِ عدالت ہونا تھا مگر میں بیمار ہوں۔ نومبر کے وسط میں اگر کوئی تاریخ مل گئی تو چلا جاؤں گا۔ میرا پروگرام یہی ہے کہ لاہور پہنچ کر آپ سے ملوں، کیونکہ آپ کے دوست کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ آپ نومبر میں لاہور آنے والے ہیں۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اب پہلے سے آپ کی صحت بہتر ہے۔ خدا آپ کو تندرست رکھے۔

سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ خط لکھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بیکار کی جسمانی مشقت کر رہا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آدمی لکھے بغیر اپنے خیالات دوسرے تک پہنچا سکتا۔

لاہور اگر آپ سے مفصل باتیں ہوں گی اور وہیں بیٹھ کر مستقبل کے متعلق کوئی پروگرام بھی سوچیں گے۔ اصل میں اس ایٹم بم نے میری زندگی کو بہت صدمہ پہنچایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر شے فضول ہے مستقبل کے متعلق کیا سوچیں گے۔ میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ حال اور مستقبل اب بالکل بے معنی سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہرحال دیکھیے ہم کیا سوچتے ہیں۔

میں نے ابھی تک کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔ ارادہ ہے کہ ساقی کے لیے ایک افسانہ لکھوں۔ صفیہ مجھ سے سخت ناراض ہے کہ میں نے اتنی دیر آپ کو خط نہیں لکھا۔ یہ خط میں اُسی کے اصرار پر لکھ رہا ہوں۔ پوسٹ کرنے کا ذمہ اُس

لیا ہے۔
خدا آپ کو جزائے خیر دے۔آپ کے اخلاص کی مجھے ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

آپ کا بھائی
سعادت

احمد ندیم قاسمی

شخصیات نمبر

کے بارے میں

احباب کے تاثرات

(ابتدائیہ)

شخصیات نمبر، جو میری ایک برس کی محنتوں کا حاصل تھا، پڑھے لکھوں کی منڈی میں جب دام لگوانے کے لیے لایا تو داد اور بے داد سے اس کا استقبال ہوا ــــــ نہ میں داد سے اچھلا اور نہ بیداد سے آزردہ خاطر ہوا۔ جنھوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ ان کا ہمیشہ کی طرح شکر گزار رہوں گا جو اپنی ذاتی مصلحتوں کی بنا پر خفا ہوئے ان سے ہمدردی پیدا ہوئی۔

میں نے اعلان کیا تھا کہ منٹو نمبر کے بعد شخصیات نمبر (حصہ دوم) شائع کروں گا۔ یہ وعدہ ایفا نہ ہو سکے گا۔ ایک تو میں آئے دن ہی نمبر نکال نکال کر نڈھال ہوں۔ دوسرے حصہ دوم کے لیے میں نے اپنی عادت کے مطابق پھر ایسا لمبا چوڑا پروگرام بنا لیا ہے کہ اُسے کسی صورت میں بھی جلد پیش نہیں کر سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ اس نمبر کے بعد اس موضوع پر (حتی الامکان) کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔ جن نامور اہل قلم پر لکھنے والے موجود ہیں ان سے شخصی نوعیت کے مضامین لکھواؤں اور جن پر اس نوع کا کوئی لکھنے والا نہیں ہے ان سے سوانحی انداز کے مضامین لکھوا کر دوسرے حصہ کو ابتدا سے اب تک مکمل کر دوں۔

شخصیات نمبر سے متعلق چند کرمفرماؤں کی آرا کو ان کی اجازت سے پیش کر رہا ہوں:۔

بابائے اُردو:

تسلیم! آپ کی شکایت بجا کہ میں نے آپ کے بیے رسالے پر رائے ظاہر نہیں کی۔ یہ پوٹ کی پوٹ اکٹھے سات سو صفحے، خدا کی پناہ! اسے رسالہ کون مسخرہ کہتا ہے۔ یہ تو ابوالرسائل ہے۔ اس پر اظہارِ رائے آسان نہیں۔ اتنی ساری شخصیتیں اور ان پر لکھنے والوں کی شخصیتیں اور پھر ان لکھنے والوں کی شخصیتیں اور ان پر مقالے۔ ایک طومار ہے۔ یہ نمبر درحقیقت قاموس شخصیات

ہے جو مدتوں یاد رہے گا اور لوگ حوالے اور استناد کے لیے اسے ڈھونڈا کریں گے۔
آپ کا ہر نمبر کسی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر اچھے اچھے لکھنے والے آپ کو مل جاتے ہیں مگر تازہ نمبر شخصیات کا سب پر سبقت لے گیا ہے۔

عبدالحق

نیاز فتحپوری

تسلیم! آپ نے سالنامہ پسند فرمایا، خوشی ہوئی۔ لیکن جس وقت نقوش کے سالنامہ کا خیال آتا ہے تو مجھے شرم آتی ہے۔ کہاں شخصیات نمبر جس کا حجم قرآن سے بھی زیادہ ہے اور کہاں علماءِ اسلام نمبر جو کسی معمولی "درود شریف" کی کتاب سے بھی ضخامت میں کم ہے۔ جس وقت میں سوچتا ہوں کہ آپ نے اپنے سالنامہ کی ترتیب میں کتنی روحانی اور ذہنی کوفت برداشت کی ہوگی تو سالنامہ سے زیادہ آپ کے صبر و تحمل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شخصیات نمبر پر مارچ کے نگار میں تبصرہ ضرور شائع ہوگا۔

نیاز

عبدالمجید سالک:

"نقوش کا شخصیات نمبر اُردو کے ادبی رسالوں کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ شخصیات کی تعداد، ان کی بوقلمونی، رسالے کی ضخامت، اس کی حسین طباعت غرض ہر چیز طفیل صاحب کی خوش ذوقی، ان کی بے پناہ محنت اور اولوالعزمی کا پتہ دیتی ہے۔ بلاشبہ قابلِ ذکر شخصیتوں کا تذکرہ حذف ہوگیا۔ لیکن ادب و شعر کی تمام شخصیتوں کا ایک مجلّد میں اس طرح جمع کرنا کہ کوئی بھی نہ چھوٹ سکے قریب قریب محال ہے اور طفیل صاحب آخر انسان ہی ہیں، کوئی مافوق الانسان ہستی تو نہیں ہیں۔ یہ نمبر اردو زبان کے آئندہ مؤرخین کے لیے قابلِ قدر ماخذ کا کام دے گا۔ اس لیے کہ ادباء و شعراء کا کلام تو ہر وقت دستیاب ہو سکتا ہے۔ ان کی شخصیتوں کی زندگی کے متعلق معلومات آسانی سے نہیں مل سکتیں۔ اس نمبر نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ یہ طفیل صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اُس کی قدر نہ کرنا پرلے درجے کی سنگدلی ہے۔

سالک

امتیاز علی عرشی (رامپوری)،

مکرمی! تسلیم۔ رسالہ نقوش کا شخصیات نمبر ملا۔ اس گراں ارز تحفے کا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے اس نمبر کو پہلی بار دیکھا تو حیرت میں رہ گیا۔ اور جب اسے پڑھ لیا تو دہشت طاری ہوگئی۔ اللہ اکبر! اتنی شخصیتوں کے متعلق ایسی دلچسپ اور مفید معلومات اتنی کم مدت میں آپ نے جمع کر کے پیش کر دیں کہ میں اسے ادبی کرامت یا معجزہ تو کہہ سکتا ہوں سعی و کوشش کا نتیجہ کہہ کر اس کی غیر معمولی اہمیت کو کم کرنا پسند نہیں کرتا۔ ان ادبی و علمی شخصیتوں میں سے جن جن سے شرف ملاقات حاصل ہے ان کے بارے میں بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں انھیں اب تک زیادہ نہیں جانتا تھا اور جو کچھ جانتا تھا وہ اس سے رُتبے میں کہیں کم تھا جو اب معلوم ہوا ہے۔ میں نے اپنے بچوں سے کہا ہے کہ اس رسالے کو محفوظ کر لو اور وقتاً فوقتاً اس کے مضامین

پڑھا کرو۔ مجھ بوڑھے سے زیادہ تمھارے لیے یہ کار آمد ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس کے دوسرے حصّے کو ضرور اور جلد شائع فرمائیے۔ یہ ادبی و سیرتی ہر دو لحاظ سے بڑی کامیاب اور مفید کوشش ہے اور یقیناً زمانہ آگے بڑھتا جائے گا، اس مجموعے کی اہمیت برابر بڑھتی چلی جائے گی۔ بعید نہیں کہ یہ مضامین آپ کو آئندہ کتابی شکل میں بھی چھاپنا پڑیں۔ ایسی کے مستحق ہیں۔ سبحان اللہ! کتنے سنجیدہ، کیسے علم افزا، کس درجہ عقل آفریں اور کس قدر تجربہ آموز!!

اگر نقوش میرے دماغ پر اپنا نقش بٹھاتا رہے تو زہے قسمت! مگر ہوں مفت خور۔ نہ چندہ ادا کروں گا اور نہ مقالہ بھیجوں گا۔ ہاں! دعائے ترقی عمر و علم و صحت جس قدر کہیں کر سکتا ہوں۔ والسلام مع الاکرام۔ احقر:

امتیاز علی عرشی

رشید احمد صدیقی:

محترمی، تسلیم! نقوش کا شخصیات نمبر بہت اچھا نکلا۔ اتنے بڑے پیمانہ پر جو کام کیا جائے گا ظاہر ہے اس میں کہیں نہ کہیں ایک آدھ نقص بھی راہ پا جائے گا لیکن اُن فوائد کو دیکھتے ہوئے جو اس نمبر سے اُردو داں طبقہ کو کچھ دنوں تک میسّر آئیں گے۔ اس نمبر کے گراں بہا ہونے میں شبہ نہیں۔ اُردو کے خدمت گزاروں کے بارہ میں بڑی مفید، دلچسپ اور مستند باتیں اکٹھی کر دی گئی ہیں اور آپ اس خدمت اور کارنامہ پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے آپ مسرور مع الخیر ہوں گے۔

خیر طلب:

رشید احمد صدیقی

مالک رام:

مکرم بندہ جناب محمد طفیل صاحب! آداب و تسلیمات۔ میں نے آپ کا شخصیات نمبر دیکھا ہے چشم بددور۔ ماشاءاللہ۔ اگرچہ بعض ایسے مضامین شامل ہو گئے ہیں جو چھوڑے جا سکتے تھے لیکن جو کام آپ نے کیا ہے اس کی قدر اردو زبان کا آنے والا مورخ کرے گا۔

بعض زندہ شخصیتیں ایسی ہیں جن پر لکھوانے کی ضرورت ہے۔ اطہر ہاپوڑوی، ولی شاہجہان پوری پر لکھوائیے۔ مرحومین میں ایک اور اضافہ کیجیے، کشن پرشاد کول، اور یہ بھی بتا دوں کہ ابھی چند دن ہوئے ان سے متعلق ایک مضمون مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے ہفتہ وار اخبار صدقِ جدید میں لکھا تھا۔

بہرحال جو کام آپ نے کیا ہے اس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔ والسلام خاکسار

مالک رام

سید احتشام حسین:

برادرم طفیل صاحب! تسلیم۔ نقوش کے خاص نمبر کی داد کس طرح دوں۔ میں تو یہی حیرت کرتا ہوں کہ آپ نے یہ سات سو صفحوں کا رسالہ کس طرح شائع کیا، مضامین کس طرح حاصل کیے۔ یہ نمبر اردو ادب کا

آپ ہے۔
مضامین کے متعلق اس وقت یہی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک جتنے پڑھے ہیں ان میں سے اکثر پسند آئے مفصل تنقید تو اسی وقت ہو سکے گی جب تمام مضامین پڑھ لیے جائیں گے۔

میری صحت برابر خراب رہتی ہے اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں نہیں کر سکتا

مخلص:
احتشام حسین

سیّد مسعود حسن رضوی:

مکرمی! تسلیم۔ نقوش شخصیات نمبر وصول ہوا۔ دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ رسالوں کے خاص نکلا ہی کرتے ہیں، آپ بھی نکال چکے ہیں لیکن مجھے افسانوی ادب سے زیادہ معلوماتی ادب سے دلچسپی ہے اور آپ نے شخصیات نمبر میں مفید اور مستند معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ اگر اپنی حالت پر قیاس کرنا درست ہو تو کہہ سکتا ہوں کہ اردو کا ہر خادم آپ کا احسان مند ہوگا اور اس قابلِ قدر تذکرۂ ادبا کو سینے سے لگا کر رکھے گا۔ اس نوعیت کا خاص نمبر نکالنے کے لیے آپ کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی اس کا تھوڑا سا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ صرف حضرت یگانہ لکھنوی پر مضمون حاصل کرنے کے لیے کتنے خط آپ نے مجھ لکھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب رسالہ چھپ کر سامنے آ گیا ہو گا تو آپ نے جتنی محنت کی تھی اس سے زیادہ مسرت ہوئی ہوگی۔ آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دینا تو رسمی سی چیز ہوگی، میرے خلوص کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے احسان مندی کے جذبات کا ہدیہ پیش کروں۔ والسلام

دعاگو:
سیّد مسعود حسن رضوی

کرشن چندر:

برادرم! تسلیم۔ آپ کا شخصیات نمبر بہت خوب رہا۔ ابھی پڑھنا شروع کیا ہے۔ فراقؔ، مجنوںؔ، منٹوؔ، ندیمؔ، عباسؔ اور تسلیم پر مضامین پڑھ لیے ہیں۔ مستقل رائے بعد میں لکھوں گا۔ اس وقت تو اس تاریخی کام کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے

آپ کا: کرشن چند

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین:

عزیزی طفیل صاحب! نقوش کا شخصیات نمبر کئی لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور آپ مستحق مبارکباد ہیں۔ اس شمارے میں ماضی و حال کے ادیبوں کے نجی حالات و ذاتی خصوصیات سے مستقبل کے ادبی مورخ کو ایسا مواد بھی مل جائے گا جو اب تک دستیاب نہ تھا اور جو نفسیاتی مطالعہ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ ان ادیبوں پر قلم اٹھانے والوں کے لیے یہ شمارہ چھوٹا موٹا کتب خانہ ہے جس کی وجہ سے آئندہ مضمون لکھنے والوں کو دربدر نہ پھرنا پڑے گا۔ ایک ہی جگہ بہت کچھ حالات مل جائیں گے۔ میں ابھی تک پورا نمبر نہیں پڑھ سکا، اس لیے کہ اوّل تو اس کی ضخامت ایسی ہے کہ جلدی ختم نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ جن ادیبوں کا ذکر اس نمبر میں آیا ہے ان میں بہت سے جانے پہچانے ہیں۔